خواجہ محمد شفیع

شمع خرابات

بار اول ۵۰۰

ناشر .... عارف پبلشنگ ہاؤس دہلی

پریس .... اعلیٰ پریس دہلی

سنہ اشاعت .... نومبر ۱۹۵۹ء

قیمت پانچ روپے

قانع بہ تجلی نہ شوو شائق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلی نتواں کرد

دیباچہ

جو زندگی اب اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے اس کی ابتدا کا ذکر ہے۔ یہ فریب خوردہ حیات، دلدادۂ عروسِ ہزار داماد، زیرِ زعمِ باطل، روشناسِ عالم ہونے کا متمنی تھا۔ اس وقت تک ظالم زمانے نے یہ نہ سمجھایا تھا کہ سکندر ہے نہ دارا ہے۔ نہ قیصر ہے نہ کسریٰ ہے یہ بیت المال ملک بے دغا بے وارث گھر ہے۔

نہ در جانم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس ماندہ
بیا ساقی کہ این ویرانہ از بسیار کس ماندہ

بہر نوع یہ وہ زمانہ تھا جب کہ راقم کو اس دنیائے فانی میں حیاتِ جاودانی اور بقائے دوام کی تمنا تھی اور تلاش ۔۔!

سنا تھا کہ قلم کو بقا ہے۔ کان میں پڑا تھا کہ ع

نوشتہ بماند سیہ بر سپید

اس تخیل کے تحت اٹھا سینۂ قرطاس سیاہ کرنا شروع کیا۔ زبانِ حسود حرکت میں آئی۔ کہا گیا کہ خواجہ عبدالحمید یعنی راقم کے والد محترم لکھتے ہیں اور نام اس کا ہوتا ہے ان کو یہ خیال کرنے کی وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ اس شباب زدہ کے مشاغل دلی کے امیر زادوں کے سے تھے اور ان کی اچھی خاصی شہرت، ان حالات میں تریاقی دودِ چراغ ہونا ان کی سمجھ میں نہ آیا۔!

لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کو یہ کبھی نظر نہ آیا کہ ہیچمداں اور والد محترم کی طرز

نگارش میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ایک قلم سے ایسے دو انداز نوادرات میں سے ہیں۔ بہرنوع اس کے جواب میں غلام نے اتنا لکھا اور یہ ہزاروں جیل دو مسروں کو ٹھا، ان کے سامنے لکھا کہ یہ طبع نزل اور بدگمانی جاتی رہی۔ اس وقت تک راقم عام طور پر جامعہ کے لئے تاریخی قسم کے مقالے لکھتا تھا۔ اب یہ سننے میں آیا کہ "افسانہ اس کے بس کا نہیں" جوابًا اپنی حیثیت مطابق نذر کر دئے۔ جب یہ راہ بھی نہ رہی تو ارشاد ہوا "زبان لکھ لیتا ہے طویل پلاٹ میں عاجز ہے" صاحب عشق جہانگیر۔ سنگ سنگاتی اور زیر نظر کتاب میں یہی کوشش کی ہے۔ السّعی منی۔

مزید اعتراض یہ ہے کہ "خواجہ کے افسانوں میں طوائف ہوتی ہے" بندہ نواز عرض یہ ہے کہ ع

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

افسانہ میں کچھ نہ کچھ چاشنی عشق و محبت کی دینی پڑتی ہے اور نیا زمندنے طوائفوں اور طوائف زادیوں ہی کو صرف خرام دیکھا ہے۔ ہماری زندگی میں شریف زادیاں یہ کام نہیں کرتی تھیں۔ ان آنکھوں نے جان عفت ماؤں کے کیرکٹر دیکھے ہیں انکی تھوڑی سی جھلک اس کتاب میں پیش کی ہے۔ بہرنوع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ اللہ زمانے کا بھلا کرے اب دل دیوانہ شمع ستائش کا پروانہ نہیں۔!

آخر میں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ مدتیں گذر گئیں زمانہ ہو گیا جب "لیڈی ہملٹن" پکچر دیکھی تھی اس سے ذہن حرکت میں آیا جس کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ گو پلاٹ میں اس کے کوئی اثرات نہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تاہم محرک وہ پکچر ہوئی۔

خواجہ محمد شفیع

۱

بال بکھرے چھیچھڑے لگائے خاک آلود بوا وحیدن شاہ ٹرے پر بیٹھی دم لگایا کرتیں جب بھی جاؤ یہ موجود کوئی ہو نہ ہو یہ ضرور ہوتیں۔

میں تھا عزت دار چرس کی لت بچپن سے پڑ گئی تھی اب بھی جب ہڑک اٹھتی اکیلے دکیلے جا طلب بجھا آتا ــــ بوا وحیدن بھی رواداری برتتیں جاتے ہی چلم بھر میرے حوالے کرتیں اور خود راستہ پر جا کھڑی ہوتیں۔ کوئی اگر آتا تو باتوں میں لگاتیں ــــ میں بھی زیادہ دیر نہ ٹکتا۔ بس دو کش لئے اور چلتا بنا ــــ گو کبھی بوا وحیدن سے کہا نہ تھا کہ میں یہ عیب کھلے خزانہ نہیں کرتا۔ لیکن انھوں نے میری ناوقت کی حاضری سے یہ اندازہ لگایا تھا۔ اور ہم میں ایک قسم کی یک فہمی پیدا ہوگئی تھی۔

آج جو میں پہنچا تو بوا وحیدن پلو کی جڑ سے لگی بیٹھی تھیں اور رہ رہ کر جسم کو کچھ اس طرح حرکت ہوتی جیسے کسی بند کوٹھری میں آگ بھڑک رہی اور شعلے اسے لرزا رہے ہوں ــــ میں ذرا کی ذرا ٹھٹکا۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑی اور دبے پاؤں واپس ہو لیا۔

قدم اپنی راہ چل رہے تھے۔ دل و دماغ اپنی راہ لو دونوں کے راستے علیحدہ علیحدہ تھے ــــ دل کا کہنا تھا کہ پوچھنا تو چاہیے تھا کہ آخر کیا بات ہے کون یاد آیا۔ اس طرح چلے آنا، انسانیت سے بعید تھا۔ پھر خیال آتا کہ وہ تو ماضی کا دروازہ مقفل رکھتی ہیں کہیں جھانکنے والے سے ناراض نہ ہو جائیں ــــ غرضکہ کبھی رفتار سست ہو جاتی کبھی تیز اور اسی کشاکش میں بس سٹرک تک جا پہنچا ــــ یہاں میرے قدم رک گئے

کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی عزیز دوست کو مصیبت میں چھوڑ کر جا رہا ہوں — دور جانے کو دل نہیں مانتا تھا۔ پاس جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ عجب کچھ کشمکش کا عالم تھا اور میں سڑک کے کنارے شش و پنج میں کھڑا تھا۔

خیال آیا کہ کہیں کسی شہدہ غنڈہ بدمعاش نے تو بوا کی دل آزاری نہیں کی — اکیلے کا حالہ، شاہ بڑے کی سی جگہ جہاں دنیا بھر کے چھٹے ہوئے لوگ جمع ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں واپس لوٹا — جانتا تھا کہ روزمرہ کے آنے والے تو آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے۔ ان کا رکھ رکھاؤ اور طریقہ ہی کچھ ایسا تھا — میں نے اکثر دور سے انہیں ان مجمع میں باتیں کرتے دیکھا تھا اور اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ عورت اس بے عزت مقام پر بھی اپنی عزت کرا لیتی ہے اور شہدوں میں رہ کر اپنا وقار قائم رکھتی ہے۔ جس طرح خاک میں مل کر پارہ اپنی انفرادیت نہیں کھوتا۔ اور دانہ کی کونڈی پر طاؤس الگ نظر آتا ہے — لیکن ممکن ہے کوئی نیا لتی آ گیا ہو۔ دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں۔ فقیر کا تکیہ عام جگہ کوئی روک نہیں کوئی ٹوک نہیں۔ غرض کہ ان خیالات میں غلطاں و پیچاں میں پھر بوا و حیدن کے قریب جا پہنچا — ان کے جسم کو خفیف آنسوؤں کا طوفان سسکیاں اور آہیں کچھ اس طرح لرزا رہے تھے جیسے کسی آتش فشاں کا کڑ سر بند ہو اور لاوا دور مار رہا ہو۔

اس بار میں ہمت باندھ کھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور بوا نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان میں آنسو تو نہ تھے لیکن رنج و تعب کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں — نظر ملتے ہی ہم دونوں نے آنکھیں نیچی کر لیں اور بوا کے جبڑے کچھ اس طرح بھچے جیسے مار ہاتھ سے جلتے ہوئے بچے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے اور کچھ ایک انگارہ سا حلق کے نیچے اور سے دبے انھوں نے چلم پر آنچ رکھی اور میرے حوالے کر دی۔

ہم سے پہلے کہ ابا اٹھ نکڑ پر جا کھڑی ہوں۔ میں نے کہا۔ خدا بھلا کرے مستیا کا جس نے یہ علت لگا دی ـــــ بال بچے دار سفید پوش آدمی ہوں۔ لاکھ چاہتا ہوں کہ یہ علت چھوڑ دوں پر کسی عنوان نہیں چھٹتی ـــــ وہ کچھ نہ بولیں۔ اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں بولا سچ ہے خدا پاجی پڑوس سے بچائے۔ وہ ہوا یہ کہ ہمارے پڑوس میں کلو بھٹیارہ رہتا تھا۔ اس کے لڑکے مستیا سے اپنی دوستی تھی۔ ابا نے اماں سے لاکھ کہا کہ دیکھو بچے کو الیوں میلوں میں نہ کھیلنے دو۔ بری عادتیں سیکھ لے گا۔ پر انھوں نے مانا ہی نہیں ہم کو سختی سے نہ روکا ـــــ ادھر ابا کام پر گئے۔ ادھر ہم گھر سے نکلے پھر مستیا تھا اور ہم ـــــ تمام دن گلی میں اودھم مچائے رکھتے۔ کوڑا جمال شاہی۔ کوڑی زخن مخن۔ اونچ نیچ کی چھو۔ کبڈی۔ گلی ڈنڈا گیڑیاں۔ آنکھ مچولی غرض کونسا کھیل تھا جو ہم نہ کھیلتے۔

گلی میں آتے جاتوں کو سگریٹ پیتے دیکھتے ہمارا بھی دل چاہتا کہ منہ سے دھواں نکالیں۔ بچے سدا بڑوں کی سی حرکتیں کرنی چاہتے ہیں۔ یہ ذہنیت وجہ ترقی بھی ہوتی ہے اور سبب خرابی بھی بن سکتی ہے۔ بہر صورت ہم نے بیڑیوں اور سگریٹوں کے ٹوٹے پینے شروع کیے۔ ایک دن اماں کو منہ سے بو آگئی۔ ڈانٹا ڈپٹا کلی کرائی۔ ابا کا ڈراوا دیا۔ کہا دیکھ لیں گے تو ہونٹ جلا دیں گے۔ لیکن ہم کب باز آنے والے تھے رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر سے پیسہ دو پیسہ چراتے لالٹین کی ڈبیا لاتے گلی کے کونوں کھدروں اور راحت خانوں میں چھپ چھپ کر دم لگاتے۔ دھواں اڑاتے ـــــ ایک دن ہمارے بعد جو ابا گئے تو ان کو بو آئی۔ گھر میں چرچا ہوا۔ اماں نے دبو دبو کر دی ہیں خدا رسول کا واسطہ دیے پر یہ لت کب چھٹی تھی۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب بھاگتے تھے ہم خدا رسول کے واسطوں سے کب ماننے والے تھے۔ اب ہم نے یہ دستور

کر لیا کہ اول تو سب کے بعد راحت خانہ جاتے اور پھر کرتہ اٹھا کر دھواں اڑا دیتے۔۔۔۔
بری بات چھپا نہیں کرتی۔ پہلے شیطان راہ بتاتا ہے پھر خود ہی ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے
ایک دن اماں کی صندوقچی میں سے چار آنے کم ہوئے ابا کے ایک دوست نے ہمیں سگرٹ
پیتے دیکھا۔ اس دفعہ اماں کے دبائے بات نہ دبی۔ ابا کے سامنے ہماری پیشی ہوئی اماں جانماز
بچھا کر بیٹھ گئیں۔ ہم پر خوب ڈانٹ پڑی اور دو چار تھپڑ بھی۔ اماں نے کچھ دن آنکھوں میں رکھا
باہر نہ جانے دیا۔ ابا بھی آتے جاتے پوچھ لیتے۔ مستیا کا آنا جانا بند ہو گیا۔ صبح و شام ہمارا منہ
سونگھا جاتا۔ دن میں ایک بار جامہ تلاشی ہوتی ـــــ ایک دن دوپہر کو جب اماں سو گئیں
تو ہم کنڈی کھول باہر نکل آئے۔ مستیا تو تاک میں تھا فوراً آن پہنچا اور سلگتا ہوا سگریٹ
ہاتھ میں دیا۔ ہم نے کہا نہیں یار مار پڑے گی۔ اب ہم نہیں پئیں گے۔ بولا پیری ہے بے اتنی سی
میں چیں بول گیا ابے ایسا داؤں بتاؤں جو خانصاحب خود منگا کر دیں استاد نے بتایا
تھا میں نے کہا وہ کیا۔ بولا بس دو دن کا کسالا ہے پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے پڑ جا!
ماں سے کہہ دے جب تک سگریٹ نہ پیوں ٹٹی ہی نہیں ہوتی۔ پھر سب انتظام ہو جائے
گا۔ پہلے تو میری ہمت نہیں پڑی۔ دو دن سوچتے گذر گئے۔ ایک روز میں اپنے کوٹھے پر کھڑا تھا
مستیا اپنی چھت پر آ گیا۔ خوب دکھا دکھا کر سگرٹ کے دم لگائے مجھے دھرایا۔ اشاروں ہی
اشاروں میں میری پیری بولی۔ کچھ مجھے بھی ٹھرک اٹھی۔ سگرٹ دیکھ کر دل نہ مانا۔ اور کچھ مستیا
کا چڑانا ان سب نے کھسیانا سا کر دیا۔ اور میں منہ بنائے نیچے اترا۔ اماں ہر وقت ناک
بھوں چڑھایا کرتی تھیں۔ چہرہ افسردہ سا دیکھ کر فوراً پوچھا کیوں طبیعت کیسی ہے؟ میرے
منہ سے بلا ارادہ نکل گیا پیٹ میں درد ہے ـــ جھوٹ بولنا ایک دفعہ شرط ہے پھر تو
وہ شیطان کے لاسہ کی طرح چمٹ جاتا ہے ـــ؟ غرض کہ مقدر میں چرسیہ بننا تھا۔

— ہم کو سگریٹ پینے کی اجازت مل گئی ۔

آہستہ آہستہ مستیاں بھی ملنا جلنا شروع ہو گیا۔ کچھ ہم بڑے ہو گئے تھے۔ اماں ابا نے زمانہ روک ٹوک مناسب نہ سمجھی۔ ابا کبھی کبھی بگڑتے تو اماں سمجھا دیتیں وہ گھڑیاں گھٹ کر چپ ہو جاتے ۔ ہماری سگریٹ کی لت دن دونی اور رات چوگنی ہوتی چلی گئی۔ کبھی فیشن کے خاطر پیسے کبھی طلب کے لئے۔ پیسہ گھر سے ملنے لگے ۔ ہر دم جیب میں ڈبیہ پڑی رہتی — پہلے اکیلے دکیلے بازار ہاٹ میں چھپ چھپا کر کونے کھدرے میں دم لگایا کرتے تھے اب گھر میں کھلے ڈلے پینے لگے۔ ہاں ابا سے ذرا سی جھجک رہ گئی تھی وہ بھی دنیا دکھاوے کی۔ تاکہ لوگ باگ یہ نہ کہیں کہ کیسا بدتمیز لڑکا ہے۔ ابا کے سامنے سگریٹ پیتا ہے۔

اک دفعہ ہم کو بڑا سخت کھانسی نزلہ ہوا۔ پندرہ دن چارپائی پر پڑے رہے کھانسی کا یہ عالم کہ دم نہ لینے دے۔ بات کرنی مشکل سانس سینہ میں نہ سمائے کچھ اس طرح چلے جیسے سوکھی لکڑی پر رندہ ہو رہا ہو۔ ابا نے نوکری سے چھٹی لے لی اور پٹی پکڑ کر بیٹھے۔ اس زمانہ میں ابا نے مجھے خود سگریٹ سلگا سلگا کر دئے لیکن ہر دفعہ ان کے چہرہ سے ایسا ہوتا جیسے کسی بے بال و پر پرند کے پوٹے کے نیچے آگ لگے اور اُف نہ کر سکے۔ — حکیم صاحب نے حکم لگا دیا تھا۔ کہ پھیپھڑوں میں بلغم خشک ہو گیا ہے! اور یہ سگریٹ پینے کا نتیجہ ہے اس حالت میں پینا سم قاتل ہے پھیپھڑے کے خون دے جانے کا اندیشہ یہ سب کچھ حکیم صاحب نے ہمارے سامنے کہا اور ہم نے ایک دن سگریٹ نہیں پیا۔ مزن فال بد کا در دحال بد مغرب کے بعد پیٹ میں کچھ یونہی سی چبھن محسوس ہوئی۔ میں راحت خانہ آگیا۔ پر فاقہ نہ ہوا۔ عشا کے وقت تک خاصا درد سا ہونے لگا۔ اماں تو تنگ برک کر اس پر ہاتھ رکھا۔ پھر یہیں سے سینکا لیکن درد بڑھتا گیا اور بارہ بجے تو میں ہائے ہائے

آب کی طرح تڑپ رہا تھا کسی کروٹ چین نہ تھا۔ کسی پہلو آرام نہیں۔ ابا گھبرائے ہوئے حکیم صاحب کے ہاں گئے۔ وہ جاگ تو رہے تھے۔ دلے پرائیویٹ محفل تھی۔ ان کے سامنے ایک طوائف لوٹ گئی ـــــ حکیم صاحب تفریح فرما رہے تھے۔ مریض کا گذر نہ تھا ـــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تک ابا حکیم صاحب کے ہاں سے نہیں آئے تھے اماں بار بار بے چین ہو کر دروازہ کی طرف دیکھتی تھیں اور دعا مانگتی تھیں کہ یا اللہ حکیم صاحب جاگ رہے ہوں ـــــ وہ جاگ تو رہے تھے لیکن خدمت خلق کے لئے نہیں۔ میں جب درد سے تڑپتا تو یہی کہکر تسلی دیتیں۔ بیٹا حکیم صاحب کوئی دوا بتا دیں گے اللہ آرام دے گا۔ ابا آئے تو یہی پریشان کا چہرہ کچھ ایسا تھا جیسے کسی نے اندھیری رات میں بھوت دیکھے ہوں اور ان سے ڈر کر بھاگا ہو ـــــ اماں انکے چہرہ سے تو سمجھ تو گئیں تھیں پر موہوم آرزو نے نقرہ کی شکل اختیار کر ہی لی اور ان کے منہ سے نکل گیا۔ کچھ بتایا جواب ملا ملے نہیں۔ اماں نے یہ سن کر اپنے ہاتھوں کو کچھ اس طرح بھینچا جیسے سل کا مریض اپنا خون منہ سے جاتا ہوا دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے۔ پھر کہا۔ اللہ رحم کرے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھانسی کا حکم سن کر مجرم عدالت سے رحم کی درخواست کر رہا ہو۔

ابا پائے پر سر رکھ کر بیٹھے اماں نے الحمد پڑھ کر پیٹ پر پھونکنی شروع کی اور مجھ سے کہا بیٹا اللہ اللہ کرو اس نام میں بڑا اثر ہے۔ ابن آدم عاجز آ کر اس دروازہ پر پہنچا۔ جہاں قید وقت اور قدغن دربان نہیں ـــــ خدا گواہ ہے مجھے تھوڑے سکون سا ہو گیا اور آنکھ لگ گئی۔

میں یہ آپ بیتی دہرا رہا تھا اور ادھر وحیدن کی آنکھ سے آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ خشک چشموں کی سوتیں پھوٹ نکلی تھیں اور میں سمجھتا ہوں اس سوکھی ہوئی لکڑی کو

اس آبیاری کی ضرورت بھی تھی یہ آنکھوں کے دہکتے ہوئے انگارے اس ہی پانی سے مدہم پڑ سکتے تھے سوختہ گلو روح کا حلق آبِ چشم سے تر ہوتا ہے —— جب میں آیا تھا بوا وحیدن اس وقت بھی رو رہی تھیں لیکن آنکھیں خشک تھیں۔ آگ تھی پانی نہ تھا۔ آہ تھی آنسو نہ تھے اور اب آتش سوزاں پانی بن کر بہ رہی تھی۔

اس دوران میں میری نظر بوا وحیدن کے ہاتھ پر پڑی جس میں ایک بیش بہا ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی —— وہ کچھ اس طرح آنکھیں نیچی کئے بیٹھی ہی تھیں جیسے اپنی حرکت سے شرمندہ ہوں آنکھوں میں آنسو تھے ماتھے پر شکن۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر میں کھڑی ہوئی خشک اور موقر چٹان سے موج ٹکرائی ہو اور اسے عرق آلود کر کے چپ چاپ چھوڑ گئی ہو —— میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنی دیر سویا پر جب آنکھ کھلی تو اماں ابا میں باتیں ہو رہی تھیں اور میں نے یہ کہتے سنا کہ پہلے بھی جب اس نے سگریٹ چھوڑا تھا تو پیٹ میں درد ہوا تھا اور ابا نے بگڑ کر جواب دیا یہ تمہاری غلط محبت کا پھل ہے اماں آنکھیں نیچی کر کے چپ ہو گئیں اور میرے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر یا حیُّ یا قیُّوم پڑھنے لگیں ابا تھوڑی دیر میں آپ ہی آپ بولے ایسی حالت میں سگریٹ کیسے دیدوں۔ یہ فقرہ سگریٹ یاد آیا اور پھر اس کی آس بھی بندھی۔ نہیں کہہ سکتا کہ اعتقاد کی کمی کا خمیازہ تھا یا سگریٹ کی طلب پیٹ میں ایک پینچ سا اٹھا اور میں پھر تڑپنے لگا اس دفعہ درد پہلے سے کچھ زیادہ تھا اور میں بے تاب۔ اماں جب میرا کرب نہ دیکھ سکیں —— تو بولیں۔ یوں بھی تو ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ ابا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سگریٹ سلگا۔ میرے حوالہ کیا۔ آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں۔ بیٹا تیری قسمت ہیں کیا کریں میں نے ایک گھونٹ لیا کھانسی اٹھی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آگیا اور مجھے خبر نہ رہی۔

جب ہوش آیا تو صبح ہو رہی تھی۔ اماں نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی سفید دوپٹہ سر پر تھا۔ دائیں جانب گردن جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے زبان پر فقرہ تھا۔ مولا اس کی یہ لت چھڑا دے ——— یہ فقرہ اب بھی گاہ گاہ کانوں میں گونج جاتا تھا اور ایک ڈھارس سی بندھ جاتا ہے۔ پھر میں کئی کئی دن چرس نہیں پیتا۔ لیکن پھر ٹھرک اٹھتی ہے اور میں غیر ارادی طور پر ادھر کھنچ آتا ہوں، اگر دعا میں اثر ہے تو میرا ایمان ہے کہ ایک نہ ایک دن نہ صرف چرس بلکہ انشاء اللہ سگرٹ بھی چھوٹ جائے گا۔ بو ایقین جانئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ یہاں آتے ہوئے سڑک پر کوئی لفظ سن کر مجھے ماں یاد آگئیں۔ اور میرے قدم لوٹ گئے۔ تھوڑے ہی دن کی بات ہے میں ادھر آرہا تھا ایک برقعہ والی جس کا کوئی پانچ سال کا بچہ انگلی چھڑا کر بیچ سڑک پر چلا گیا وہ اسے آواز دے رہی تھی کہ اتنے میں سامنے سے تانگہ آیا اپنی پرواکئے بغیر بچہ کی طرف بھاگی۔ خود جھپیٹ میں آگئی بچہ کو بچا لیا مجھے اپنی ماں یاد آگئیں، اور ادھر آنے کی بجائے میں قبرستان چلا گیا۔ حالانکہ اس روز ابر تھا اور ایسے موسم میں طبیعت کو روک نہیں سکتا۔

ہاں تو حکیم صاحب آئے: رمایا۔ پیٹ پر تمباکو رکھو سگریٹ تو نہیں دیا جا سکتا۔ حکیم صاحب رخصت گذر چکا تھا۔ وہ رات معرکہ کی تھی اور پاپ بازی جیت گیا۔ آخر کیوں نہ جیتا پن کہنے والے خود پاپ میں گرفتار تھے۔ طبیب کا دروازہ مریض کے لئے بند تھا طوائف کے لئے کھلا ہوا انسانوں کی جان بچانے والا پاپ تری پر جان دے رہا تھا۔ اس وقت جناب کچھ بتا دیتے تو رات کٹ جاتی۔ لیکن آپ اپنی عادت نہ چھوڑ سکے۔ مریض کی عادت کیسے ترک کرا سکتے ہیں، ایسے اطبار کی زبان میں اثر نہیں ہوتا ہاتھ شفا میں تاثیر نہیں ہوتی۔ میرے منہ سے نکلا سگرٹ بغیر مر تو نہیں جاؤ گے حکیم صاحب

ہم جاتے تھے چونی والے میں حالانکہ ابّا نے کہہ رکھا تھا کہ بڑے درجے میں جایا کرو۔ چھوٹے درجوں کی صحبت بری ہوتی ہے۔ پر ہم کب ماننے والے تھے۔ بات یہ تھی کہ ایک تو سیتا کے کپڑے ایسے چوہا چکٹ ہوتے کہ روپیہ والے میں اسے بیٹھنے کون دیتا۔ دوسرے ہم کو کرخنداری فقرہ سننے میں مزا آتا تھا اور یہ روپیہ والے میں کہاں نصیب۔ ایک جمعہ کو ایسا ہوا کہ سیتا نے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے اور ہم تو خیر سے چھیلا بنے ہی رہتے تھے۔ اٹھنّی چونی والے پر بھیڑ زیادہ تھی۔ سیتا کی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور کچھ نئے کپڑوں کا بھی ڈر تھا۔ چونکہ چار آنے والا چھ آنے میں بیچنے والے بدن پر تیل مل مل کر آتے تھے۔ اور بعض تو ہاتھوں پر توے کی سیاہی بھی لگا لیتے۔ جہاں کوئی اُجلے پوش اندر گھسا اور اُنھوں نے پیٹھ پر چھاپا مارا۔ دوسرے نے اطلاع دی۔ اجی بابو جی تمہارا کوٹ خراب ہو گیا۔ کبھی آپس ہی میں جھگڑا فساد گالم گلوچ کرنے لگتے۔ بھلے مانس ہٹ جاتے اور یہ اندر گھس جاتے۔ ایک تو ایسا حلالی تھا کہ جہاں بھیڑ زیادہ دیکھی اور اس نے اُبکائی لی۔ دوسرا اچھا۔ ابے ہیضہ اور سب بھاگے۔

غرض اس دن ہم روپیہ والے کا ٹکٹ لے دونوں جا عین پنکھے کے نیچے ہو بیٹھے۔ ——— سیتا کم ظرف آج پہلی دفعہ جو روپیہ والے میں آیا تو کرسی پر ایسا پھیل کر بیٹھا جیسے سارا درجہ اس کے باپ کی جاگیر ہو۔ اور بانگ لگائی پنکھا کھول بے پنکھا ——— روپے والے میں سے جو یہ چونی والی آواز لگی تو گیٹ کیپر گھبرایا ہوا آیا۔ پہلے تو ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ سیتا آڑی ٹوپی لگائے مٹھی بند کئے چھنگلیا میں سگرٹ اڑائے دم لگا رہے تھے وہ بھی تاڑ گیا اور اسی کی کرسی کے پیچھے آن ڈٹا پھر

پھر بولا ٹکٹ دکھادو۔ ہمارے نواب نے سنی اَن سنی کر دی۔ اور بڑی شان سے دھواں اُڑاتے رہے۔ اُس نے پھر کہا۔ اُنھوں نے یہ بھی نہ گردانا کہ کون کتّا بھونک رہا ہے۔ اب اس نے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ ان حضور نے جھٹک کر کہا۔ دُور سے بات کر بے دُور سے۔ چمڑے کے ہاتھ نہ لگا۔ وہ بولا ٹکٹ دکھاؤ۔ اُنھوں نے فرمایا پنکھا کھلواؤ۔ اُس نے ٹکٹ دیکھنے پر اصرار کیا۔ انھوں نے جیب کی طرف اشارہ کر کے کہا ٹکٹ یہ رہا۔ چاند سا مل دکھا دونگا۔ جہ جہ تو پنکھا کھلوا دے۔ بس یاروں کو یہی ضد آگئی ہے —— آخر وہ بھی عاجز آگیا۔ پنکھا کھلوایا اور کہا اب تو دکھاؤ۔ مسیتا نے پہلے تو ڈمرٹ کوٹ کی ساری جیبیں ایک ایک کر کے ٹٹولیں۔ پھر گول گول دیدے پھرائے۔ ٹوپی اُتار کر دیکھی۔ میری سٹّی گم کہ یا اللہ کہیں ظالم نے کھو تو نہیں دیا۔ اتنے میں مسیتا نے جھک کر جوتی اتاری۔ بابو صاحب دو قدم پسپا ہوئے۔ مسیتا صاحب مسکرا دیئے۔ لیکن ٹکٹ نعلین میں سے بھی برآمد نہ ہوا۔ اب تھیئٹر کے اور ملازم بھی آن جمع ہوئے۔ کچھ دُور نہ تھا کہ یہ حضرت پا بدست دگرے دست بدست دگرے۔ یہاں سے خارج کیے جاتے اور کچھ لوگ اس نیت سے آگے بڑھے بھی کہ مسیتا نے ڈپٹا۔ خبردار دُور سے بات کرو۔ دیکھ رہے ہیں کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ مل جائے گا دکھا دیں گے۔ اب میرے شیر نے کرتہ اٹھا نیفہ ٹٹولا اور بولا مل گیا۔ دامن دبایا۔ ٹھوڑی کے نیچے اور نیفہ میں انگلی داخل کرنی شروع کی۔ سامنے کی کرسیوں پر جو عورتیں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے نظریں نیچی کر لیں اور یہ ہیں کہ نہایت بے تکلفی سے نیفہ میں ٹکٹ کا تعاقب کیے جا رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی فرماتے بھی جاتے ہیں۔ ابے نکل یار کیوں ستایا ہے۔ بابو نے کہا جلدی کرو نہ۔ یہ بولے نکال تو رہا ہوں۔ اور جو ایسی جلدی ہے تو لے خود نکال لے اور جو ہماری مان تو اوپر

ہی سے ٹٹول کر تسلی کرے۔ غرضکہ کوئی پاؤ گھنٹہ میں وہ ناشدنی ٹکٹ کا تولد ہوا اور میاں مستیانے فرمایا۔ اب تو دیکھ لیا دل خوش ہو گیا۔ کچھ منہ دکھائی تو دلواتے جاؤ یار۔ اچھا دیکھنا ذری پان والے کو ادھر بھیج دینا۔ یار خاں منہ رچائیں گے—— گیٹ کیپر تو کیا ہی بیچتا۔ ویسے ہی اچھا خاصا جلا بھنا گیا تھا۔ ہاں مستیانے چیخ چلّا کر ایک پان والے کو بلا ہی لیا۔ اور پورے دو آنے کے خرید لئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ چھالیا بھی بہت سی الگ لے لی۔ زردہ بھی ایک پڑیا میں بندھوا لیا۔ اور پھر الائچیاں الگ نہ لیتے تو ان کو مستیا ہی کون کہتا۔ اور لطف یہ کہ ایک ایک چھانٹ کر لی۔ مزید برآں آخر میں پان والے کو یہ نوٹس بھی دے دیا کہ اگر کوئی مری ہوئی نکلی تو واپس کرنی ہوگی۔ میرا یہ حال کہ شرم سے گڑا جاؤں۔ اور اس کی یہ کیفیت کہ چھلائی کی طرح پھیلے۔

اب چوّنی والوں نے چیخنا شروع کیا۔ دی چالو کر بے کیا سو گیا۔ یہ آواز سُن مستیا کے بھی گلے میں کھجلی ہوئی اور گلا پھاڑ کر چیخا۔ دی چالو کیوں نہیں کرتا کیا اپنی میّا کے نکاح میں گیا وا ہے—— آس پاس والے بوکھلا اٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ آج یہاں کس قماش کا جانور آ پھنسا۔ گیٹ کیپر بلبلایا ہوا آیا۔ بولا جناب یہ ایک روپیہ والا درجہ ہے۔ مستیا بولا دی بابو جی تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو کیا پھر نکالوں۔ ابھی تو دیکھ کر گئے ہو۔ بابو نے جواب دیا صاحب یہاں آوازہ کشی نہ کیجیے۔ یہ چوّنی والا درجہ نہیں ہے۔ مستیا نے کہا پھر وہی بات چوّنی والا نہیں ہے۔ چوّنی والا نہیں ہے۔ دی بابو جی قسم ہے اس اڑان جھلے کی تم بھی ایک زخم ہو۔ ہم کہتے ہیں خواب میں ریزگاری ہی دیکھتے رہتے

ہو گئے۔ ادھر گریٹ پرش ہوا۔ بابو غریب کی نوکری کا معاملہ۔ دل ہی دل میں تاؤ کھاتا ہوا چلا گیا۔ آخر کار پہلی گھنٹی بجی اور میاں سیتا نے پان کا بیڑا منہ میں دبایا۔ اور ایک میری طرف سرکایا۔ میں نے اب تک ایسا بے تعلق رویہ اختیار کر رکھا تھا جیسے مجھے اس مرغا بے ہنگام سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اور اب بھی پان لے منہ میں رکھ خموش ہو بیٹھا۔ دوسری گھنٹی پر حسب دستور سگرٹ سلگا یا گیا اور تیسری پر ایک اور پان منہ میں رکھ اب میاں سیتا سنیما دیکھنے تیار ہو بیٹھے۔ ادھر تو پان کے مزے لے رہے ہیں ادھر سگرٹ کے کش، اور بائیسکوپ تو خیر اُن کی جان ہے۔ کہ اتنے میں ہیروئن جنگل بیابانوں میں پریشان حال جاتی نظر آئی۔ اور رو رو کر چیختی تھی۔ ناتھ تم کہاں ہو؟ ناتھ تم کہاں ہو؟ پہلی آواز پر تو میرے یار نے پاؤ بھر کی پیک تھوکی اور دوسری پر فوراً جواب دیا۔ وئی یہ بیٹھا ہو تھوک رہا ہوں —— آگے کی سیٹ پر ایک میاں بیوی بیٹھے تھے۔ کچھ چھینٹے محترمہ کے پیروں اور ساری پر پڑے۔ انھوں نے میاں سے کہا۔ میاں نے سیتا کو ڈانٹا۔ یہ نہایت اطمینان سے بولے۔ وئی تھوکا تو ہم نے جنگا دیکھ کر ہی تھا۔ اب کوئی ایک آدھ چھینٹ کہیں بے جنگا جا پڑی، ہو تو ہم کو خبر نہیں۔

خدا خدا کر کے وہ تماشہ ختم ہوا اور ہم نے قسم کھائی کہ شریف ہوں تو اب سیتا کے ساتھ روپے والے میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ شرافت کے تو یہ معنی تھے کہ اس کے ساتھ جانا ہی چھوڑ دیتا۔ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیتا۔ جو اتنی سمجھ ہوتی تو بھلے ہی دن نہ ہوتے —— غرضکہ ساتھ سنگ تو چھوٹا نہیں ہاں روپیہ والے میں جانے کی قسم ضرور کھالی۔

اب ہم خاصے سیانے ہو چلے تھے اور دنیا کی باتوں سے کچھ کچھ واقف۔ پڑوس میں ایک بڑی بی جانی نام کی رہتی تھیں۔ یہ کبھی طوائف تھیں۔ پر مدتوں سے توبہ کر گھر ہو بیٹھی تھیں۔ یہ مکان بھی اُن کے اچھے زمانہ کا خریدا ہوا تھا۔ آدھے میں کرائے دار بسا رکھے تھے۔ آدھے میں خود رہتیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں وہ بھی عمر سے اُتری ہوئی کہتی تھیں نکاح میں ہیں۔ باقی حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہاں اتنا ہم کو بھی معلوم ہے کہ ایک داڑھی والے شیخ جی اکثر اندھیرے اُجالے آتے دیکھے گئے تھے۔ اور ایک بابو جی کو بھی محلہ والوں نے پکڑا کہ سر بند گلی میں کیسے آئے اور پھر جانی بوا نے یہ کہکر چھڑا دیا کہ اپنے جاننے والے ہیں۔

ایک دن شام کے وقت ہم چھت پر کھڑے پتنگ اُڑا رہے تھے کہ ڈور جانی بوا کی بیری میں اٹک گئی۔ ہم لاکھ ٹھمکیاں دے رہے ہیں۔ وہ نکلتی ہی نہیں۔ اتنے میں اُن کی نواسی کوٹھے پر آئی۔ ڈور پر جو نظر پڑی تو دوپٹہ سر سے اُتار لگی لُوٹنے۔ ادھر سے ہم نے آواز دی۔ گڈی ہماری ہے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور کہا بڑے خوبصورت۔ پھر نیچے اُتر گئی۔ اب ہم ہیں کہ اپنے سے جتن کر رہے ہیں۔ اور گڈی وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔

اتنے میں وہ بغل میں دبائے پھر آئی۔ اور اس دفعہ نہ گڈی کی طرف نظر ڈالی۔ نہ ہماری طرف۔ اور سامنے والے دریچے میں جا کچھ کاڑھنے ہو بیٹھی۔ اور پھر اس درجہ بے تعلق جیسے ہمارا وجود ہی نہیں —— آخر کار ہار جھک مار کر ہم نے کہا۔ اجی چھڑا دیجیئے نا۔ پہلی آواز پر تو کوئی جواب ہی نہ ملا۔ دل میں تو آئی کہ ایک گا کھینچ ماروں۔ پر اپا کے ڈر سے کچکچا کر رہ گیا۔ اور بے غیرت بن کر پھر درخواست داغی۔ اس مرتبہ اپنا

کام کرتے کرتے جواب دیا گیا۔ کیوں جان کھائی ہے خود چھڑالو۔ پھنساتے وقت نہیں سوچا تھا۔ تاؤ تو بہت آیا۔ پر غصہ سے کام چلتا دکھائی نہیں دیا۔ تو پھر ہم نے لجاجت سے کہا۔ اجی مہربانی ہوگی۔ ہمارے پاس اس وقت دوسری ہے نہیں۔

آخر بڑی مشکل سے عجب ٹھسّے کے ساتھ وہ اُٹھیں۔ پہلے تو وہی دوپٹہ والا داؤ کرنا چاہا۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔ اور پیٹھ ادھر کئے کئے بولی۔ دُور بہت ہے ہمارا ہاتھ نہیں جاتا۔ اتنا کہہ پھر کمرہ کی طرف چلی۔ میں جلدی سے بولا اجی ذرا تو ٹھہریئے میں لالنگر بنا کر پھینکے دیتا ہوں۔ اس نے بغیر ادھر دیکھے جواب دیا اچھا جلدی کرو۔ میں تو لنگر باندھتا رہا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی۔ لیجئے صاحب اب ان کے لئے ہم دھوپ میں کھڑے رہیں۔ میں نے کہا ہم بھی تو کھڑے ہوئے ہیں۔ بولی تمہارا ڈیل تو لوہے کا ہے۔ میں نے جواب دیا اور آپ کا موم کا ہے۔ پگل جائے گا۔ ہاں جی پگل جائے گا۔ کہتی ہوئی تنتنا مار کر پھر دریچہ میں جا بیٹھی۔

وہ ایک پیسے کی کنکیا تو کوئی چیز نہ تھی اور پانچ سات گز مانجھا توڑ کر بھی کھسکایا جا سکتا تھا۔ پر اس چھیڑ چھاڑ میں اب مجھے بھی مزا آنے لگا ـــــ ایک آدھ آواز ہم نے اور دی۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ آخر کار ہم نے گانا شروع کر دیا۔

دلدار یار کا پتنگ اُڑائیں گے

اب تو ہو گئی شام سویرے پھر اُڑائیں گے

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہم گاتے گاتے رُک گئے۔ اور کواڑوں کی جھریوں میں سے جھانکنے لگے۔ کہ دیکھیں اب بھی دیکھتی ہے یا نہیں۔ یہ عمل کام کر گیا اور اس نے ذرا سی دیر بعد گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اور ہم اناڑی کواڑ کھول کر سامنے آ گئے۔

بھئی کہہ نہیں سکتا کس ادا سے تیوری پربل ڈال کر اس نے منہ موڑا ہے اور اپنی لنگی باندھ جھٹکتی پٹکتی نیچے چلی گئی۔ ہم نے کہا بھئی ذرا دیکھو تو سہی بات تو سنو۔ یہ گڈی اٹکی ہی چھوڑ جاؤ گی۔ اس سب کے جواب میں ظالم نے لٹکے ہوئے ہاتھ سے انگوٹھا دکھا دیا اور سیدھی ہولی۔ ہماری آنکھوں میں فلم کا نظارہ پھر گیا۔ اب سورج غروب ہونے کو تھا اماں نے نیچے بلوایا کہ دونوں وقت ملتے ہیں ——— کچھ یہ ڈور توڑنے کو جی نہ چاہا۔ ادھر ہم چرخی کو اینٹ سے دبا کوٹھے پر سے اتر گئے۔

میں کہہ رہا تھا بوا وحیدن بت بنی بیٹھی سن رہی تھیں۔ ان کی داستان سننے کا شوق مجھ سے اپنی کہلوا رہا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ مجھے خود بھی اب مزا آنے لگا تھا۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ عیسائیوں میں طریقۂ اعتراف جسے کنفیشن ——— (CONFESSION) کہتے ہیں۔ ذکر العیش نصف العیش ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس سے دل ہلکا ہو جاتا ہے ——— بوجھ تو نہیں کچھ سہارا مل جاتا ہے۔

سانس کا پنچھی جب دودِ غم سے گھٹتا ہے تو پھڑپھڑاتا ہے۔ اور اس کے پروں کی جنبش سے کچھ دھواں چھٹ جاتا ہے یہی داستانِ غم ہے۔ یہی آہِ دلِ سوزاں۔

میں داستان سنانے میں کچھ ایسا ازخود رفتہ ہوا کہ اس اثنا میں کئی لت کے مارے آئے۔ چلم بھری دم لگا کر چلے بھی گئے اور میں بیٹھا اپنا دکھڑا روتا رہا۔ بوا وحیدن بھی ایسی منہمک ہوئیں کہ آنے جانے والوں سے بے خبر بیٹھی سنا کیں۔ اب ان کا جگہ سے نہ اٹھنا یہ بتا رہا تھا کہ تاثیر کر چلا تمام اقصۂ فراق۔

ذرا سی دیر دم لینے کے بعد میں نے پھر شروع کیا ——— ہاں تو رات بھر ہمیں نیند نہ آئی۔ اور رہ رہ کر جانی بوا کی نواسی یاد آتی رہی۔ میں اسے عشق و محبت تو نہیں

کہہ سکتا۔ ہاں کچھ ایسا احساس تھا جیسے کسی بچّے سے وعدہ کیا جائے کہ صبح تجھے نیا جھم جھم کا جوڑا ملے گا اور وہ اس کی خوشی میں سو نہ سکے۔ سویرے منہ اندھیرے ہم چھت پر جا پہنچے۔ اور لگے ادھر اُدھر ٹہل کر کھنکارنے۔ اُن کے ہاں سائبان کے نیچے کئی چارپائیاں بچھی تھیں اور سب اپنے اپنے دوپٹے تانے سو رہی تھیں۔ بس قیامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں بازکنی مادر مادر باشد۔ منڈے ہوئے جوگی۔ گھٹی ہوئی دوا اور سر سے پاتک دوپٹہ میں ملفوف عورت کو پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ پڑی سنا رہیں اُد یہاں دل میں گدگدیاں ہو رہیں۔ کریں تو کیا کریں۔ ادھر یہ دُگدا لگا ہوا کہ دُھوپ چڑھ جائے گی تو اماں بُلالیں گی۔ اور خیر سے ابھی سورج نکلنے میں بھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ تھا۔ پر ہمیں پل پل بھاری۔ آخر یاد آیا کہ ہماری والی کا دوپٹہ گلابی تھا اور وہاں بھی بیچ والی چارپائی پر اسی رنگ کا دوپٹہ نظر آیا۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک کنکری کھینچ ماری۔ نشانہ نے خطا کی۔ دل میں ڈر ہے کہ اگر کسی اور کے جا لگی تو اُدھم مچ جائیگی پر اتنی ہوشیاری کہ کنکری مار کر منڈیر کی آڑ میں ہو گئے۔ دل نہ مانا ایک اور ماری۔ وہ تیرہ بختی سے برابر والے سفید دوپٹہ پر جا پڑی اور اس میں سفید لگلا سا چونڈا انھو وا رہوا۔ اور ہم بھیگی بلی کی طرح منڈیر کے پیچھے دبک گئے۔ بڑھیا نے جو لپٹے پر کنکری پڑی دیکھی تو آگ بگولہ ہی ہو گئی۔ گلا پھاڑ کر چیخی۔ خدا کی مار ان مونڈی کاٹوں پر۔ سویرے ہی سویرے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ یہ ہے کون مادر بخطا۔ اس کی آواز سے گلابی دوپٹہ جو برابر ہی لیٹا تھا کسمسا کر اور پوچھا نانی کیا ہوا۔ اب ہم منڈیر کے چھیدوں میں سے جھانک رہے ہیں۔ بڑھیا بولی اللہ جانے کس کی شامت نے دھکا دیا ہے۔ غارتی نے یہ پتھر کھینچ کر مارا۔ وہ تو اللہ نے خیر کر لی۔ میری آنکھ بچ گئی۔

کمبخت کھوٹ سے میرے ماتھے پر لگا۔ مر جائے خدا کرے۔

نواسی بیگم کی آنکھ معاً ہماری چھت پر پڑی اور ظالم نے ہم کو تاڑ لیا۔ اب کچھ نہ پوچھو۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ خیال آیا کہ یہ آفت کا پر کالہ ہمارا نام لے دیگی۔ اور بڑھیا ایک جھلّو ہے۔ سنتے ہی تو بے ڈالے گی۔ بولی نانی وہ مُوا بھٹیارے والا ہوگا وہی سویرے سویرے کوٹھے پر چڑھتا ہے۔ اپنی جان میں جان آئی۔ اُس نے اتنا کہکر جہاں میں چھپا بیٹھا تھا وہاں کچھ اس طرح دیکھا جس کے معنی تھے بچہ دعا دو بچا لیا۔ نہیں تو ابھی پاپوش کاری کرا دیتی۔

بڑھیا تو منہ ہی منہ میں بکتی ہوئی نیچے اُتر گئی اور وہ بیگم پھر دوپٹہ تان لیٹ گئیں۔ ہم نے بھی بیٹھے بیٹھے سرکنا شروع کیا اور بیچ چھت پر آن کھڑے ہوئے۔ دل میں خوش تھے کہ کچھ نہ کچھ تو تعلق خاطر ہے جو ہماری پردہ داری کی۔

اب ہم ڈر کے مارے بیچ چھت پر کھڑے ہیں۔ ادھر نہیں جاتے۔ اور دل ہے کہ مانتا نہیں۔ آدمی دل کے ہاتھوں بکا ہوا ہے۔ اس کے آگے چلتی نہیں۔ ہم بھی مجبور ہو گئے اور دیوار کے سہارے سہارے سرکنا شروع کیا۔ اس کی بھی نظریں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی کلائی منہ پر رکھکر سوتی بن گئی ——— ہم بائیسکوپ میں یہ سب ادائیں دیکھ چکے تھے۔ فوراً تاڑ گئے۔ نہایت بے پروائی سے سیڑھیوں کی طرف گئے۔ جیسے نیچے جا رہے ہوں۔ اور پھر منڈیر سے پرے پرے آجھریوں میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تو وہ بگڑی بنی پڑی رہی۔ پھر منہ پر سے کلائی ہٹا ہماری چھت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ دل چاہا کواڑ کھول سامنے جا کھڑا ہوں۔ پر شام کی بات یاد آگئی اور میں اپنی جگہ چھپا کھڑا رہا۔

اب کہاں تک بیان کروں۔ بڑھتے بڑھتے یونہی پینگ بڑھ گئے۔ ہر بہانہ اُسے چھت پر آنا اور آنکھیں لڑانا ——— ہمارا بھی گڈی بازی کا شوق بڑھ گیا صبح سویرے ہی چھت پر چڑھ جاتے اور شام کو بھی چار بجے سے جا دھمکتے۔

قانع بہ تجلی نہ شود شائق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلی نہ تواں کرد

کچھ دن تو دیدار بازی اللہ راضی کام چلتا رہا۔ اشاروں اشاروں میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ پر اب دل نے پیر پھیلائے۔ ہم نے پتنگ میں خط باندھکر اڑایا۔ وہ کچھ دن تو باتوں باتوں میں اُڑاتی رہی۔ لیکن

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

آخر اُدھر سے بھی جواب آیا جس میں مجبوری کا اظہار تھا۔

وہ ہمارے ہاں نہ آسکیں۔ ہم اُن کے ہاں نہ جاسکیں۔ یہاں اماں چوبیس گھنٹہ موجود۔ وہاں دس دس چوکیدار۔ بڑھیا ناگن کی طرح پہرہ دے۔ راستہ سب مسدود دکھائی دے۔ کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں دلی میں موسمی بخار پھیلا میں نے بھی دوچار دن اپنی باری بھگتی۔ پھر سالونٹا سا ہو گیا۔ انھوں نے سخت اظہار پریشانی کیا۔ اشاروں میں بتایا دوا پیو۔ دو روز بعد جو چھت پر آئیں تو سر بندھا ہوا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدا خیر کرے۔ ہلکی آواز سے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ انھوں نے جواب دیا بخار۔ ہم سمجھے ایک آدھ دن میں اُتر جائے گا۔ کوئی نئی بات نہ تھی فصل کا میوہ تھا۔ سب ہی مزا چکھ رہے تھے۔ پر وقت کی خرابی علاج میں اونچ نیچ ہوگئی۔ اناڑی ڈاکٹر نے کونین دے دی۔ نزلہ بگڑ گیا۔ دو چار روز تو وہ کسی نہ کسی طرح ٹلکتی ٹپکتی کوٹھے پر آئیں۔

اور پھر یہ بھی بند ہو گیا۔

ہمارا یہ حال کہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپیں۔ چھت پر کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ نہ وہ ہی نظر آئیں نہ کوئی خیر خبر ہی معلوم ہوئی ——— ایک دن گلی میں موٹر کے ہورن کی آواز سنائی دی ہم بھی گھر سے باہر نکل آئے۔ دیکھا تو ان کی نانی ایک موٹے سے بنگالی ڈاکٹر کو لئے چلی آ رہی ہیں۔ زمین نے پیر پکڑ لئے۔ میں ساکت و جامد رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد قدم خود بخود ان کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔ ڈیوڑھی پر ذرا کی ذرا ٹھٹکا کہ شاید کوئی آواز طلب سنائی دے جائے۔ لیکن سوائے جھوجھر پھپھیڑ دل کی کھانسی کے صدائے برنخاست اور یہ کمبخت کھانس رہا تھا ——— دل نے الفاظ بے آواز میں کہا۔ کاش میں کمبخت ہی ہوتا کہ ان کے گھر میں تو جگہ مل جاتی۔ میں اپنی دھن میں کھڑا تھا کہ سامنے سے سیتا نمودار ہوا۔ بولا یاں کیسے کھڑے ہو۔ میں سٹ پٹا سا گیا۔ آنکھیں زمین کی طرف جم کر رہ گئیں۔ اُس نے پھر پوچھا میں نے کہا یار اکنی گر گئی ہے اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ بولا جو روپیہ یار خاں کو دیا کرو تو ابھی ڈھونڈے دیتے ہیں ——— آتے جاتوں کے خیال سے میں اب وہاں ٹکنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی نانی اور ڈاکٹر کے اندر سے نکلنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ بڑے خوبصورت۔ یہ کسی کے منہ کی بات تھی۔ کہنے والی کا مکھڑا آنکھوں میں پھر گیا۔ اس وقت سیتا کی صورت مجھے بُری لگ رہی تھی۔ اور میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑنے والا کب تھا۔ قاضی عدو کی طرح ساتھ لگا چلا آیا۔ میں کام کا بہانہ کر اپنے گھر آ گیا۔ اور ڈیوڑھی میں کھڑا

جھانکتا رہا۔ جب سیتا وہاں سے ٹل گیا تو ہم باہر نکلے اور ٹوہ لینے موڑ کے کاوے کاٹتے رہے۔

خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی۔ ڈاکٹر سامنے سے آیا۔ ہم بھی کچھ فاصلے پر ساتھ ہو لئے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ محلہ کے بیکار لڑکوں کا عام دستور تھا کہ گلی میں جہاں کوئی نیا آدمی آیا اور یہ اس کے گرد ہوئے ——— ڈاکٹر ان کی نانی سے کہہ رہا تھا بُکھار بگڑ گیا ہے۔ بہت احتیاط کرنا ہوگا۔ وکھت پہ دوا وکھت پہ گجا۔

بخار بگڑ گیا ہے۔ سن کر دل کو ایک دھکا سا لگا۔ سارا دن پریشانی میں گزرا۔ گھڑی کوٹھے پر جاتا گھڑی نیچے آتا۔ کوئی شے بھلی نہیں لگتی تھی۔ کھانے میں بھی خاک مزا نہ آیا ——— ان کا کوٹھا خالی دیکھکر اپنی چھت ویران لگتی۔ جیسے ایک ہی تصویر کے یہ دو زاویے تھے۔ ایک بگڑ گیا تو دوسرا بھی اُجڑ گیا۔

شام کو سنیما میں جا بیٹھا۔ سیتا کو ساتھ نہیں لیا۔ مجھے آج انسان بُرے لگ رہے تھے۔ اکیلا رہنے کو دل چاہتا تھا۔

تماشہ شروع ہوا۔ ریل کا اسٹیشن ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ کوئی صندوق پر بیٹھا ہے۔ کوئی بستر پر۔ کوئی لڑنے کو آمادہ۔ کوئی مرنے کو تیار۔ پر جگہ دینے کو راضی نہیں ——— ایک بیس پچیس سا ساہوکار دری بچھائے بستر سے ٹیکا لگائے پیر پھیلائے آدھی سیٹ گھیرے بیٹھے ہیں۔ سارے مسافر انھیں دیکھ دیکھ کر کھِسا رہے ہیں۔ پر وقت یہ ہے کہ اچھے خاصے ٹھاڈے ہاتھ پیروں سے درست دو لٹھ بند نوکر ان کے ساتھ ہیں کوئی دم نہیں مار سکتا۔ اتنے میں دو عدد جنٹلمین سوٹ کیس لٹکائے اس ڈبہ پر آئے۔ اوّل تو دروازہ ہی پر ٹھنیگا

مشتی گاؤ زوری کرنی پڑی۔ اندر جو جا کر دیکھا تو بیٹھنا تو درکنار کہیں ٹکنے کو جگہ نہیں —— اب یہ سیٹھ جی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے باڈی گارڈ مزاحم۔ یہ جنٹلمین بھی نرے بابو نہیں تھے۔ سیٹھ جی کے نوکروں کو دم کے دم میں دیواروں میں ٹھونس دیا۔ تھے ذلیل نسل کے ٹھوکر کھا کر لگے دم ہلانے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ کی ٹانگیں سکڑنی شروع ہوئیں اور ان بابوؤں میں سے ایک سیٹ پر اور دوسرا موٹے مہاراج کے پیروں پر کچھ اس طرح بیٹھا کہ انکی چیخ نکل گئی۔ اور دونوں پاؤں توند کے زیر سایہ پہنچ گئے —— اب ہمارے سیٹھ صاحب نے اپنے ہزیمت خوردہ نمک خواروں کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے ہارا جواری تاش کے اس پتے کی طرف دیکھے جو وقت پر دغا دے گیا ہو اور بولے ذرا بستر ہٹائے نا۔

اس منظر پر کیمرہ پھرا اور فرسٹ کلاس کا پُرتکلف ڈبہ نظر آیا۔ ایک ملازم وردی پہنے پیٹی باندھے سیٹ پر اعلیٰ قسم کا قالین بچھا رہا ہے۔ سرہانے ریشمیں تکیہ پائنتوں بیش قیمت کمبل رکھا۔ اتنے میں ایک رئیس زادہ اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے دو بالشت کا فیشن کا ڈنڈا بغل میں دبائے ہاتھ میں ۹۹۹ کا ٹین لئے سر پر ہیٹ لگائے بڑے ٹھاٹھ سے تشریف لائے —— ڈبہ میں گھس نوکر سے دریافت کیا۔ سب ٹھیک ہے۔ اس نے کہا جی حضور بولے اچھا تم سروِنٹس میں جاؤ اور خود پلیٹ فارم پر اتر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں میگزین اور اخبار بیچنے والا آیا۔ جناب نے کچھ انگریزی کی کچھ اردو کی کتابیں خریدفرمائیں پانچ کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ ایک روپیہ اور کچھ آنے وہ واپس کرنے لگا تو سرکار نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔ وہ سلام کر کے رسید ما ہو لیا۔

اتنے میں ایک جوان خوبصورت لڑکی گنگا کی ساری باندھے قلی کے ساتھ ساتھ

گھبرائی بوکھلائی تھرڈ کلاس کے زنانہ درجہ پر پہنچی۔ یہاں پہلے ہی سے قیامت صغریٰ بپا تھی۔ نفسا نفسی کا عالم۔ دروازہ کا کھلنا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اس کے پیچھے نہ صرف سامان کے ڈھیر تھے۔ بلکہ انسانوں کے انبار بھی لگے تھے۔ اور پانچ سات عورتیں اندر قلعہ بند ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نو وارد کو دور سے آتا دیکھ فوج کی فوج کھڑکیوں میں آن جمی۔ یہ ان کے دمدمہ تھے۔ اور چشم ہائے خشم آلود سے تیروں کی بارش شروع کی جب دشمن قریب آیا تو بدکلامیوں کا ایک گراپ چھاڑا۔ حملہ آور ہیورا گئی۔ پر ہمت نہ ہاری۔ اڑی کھڑی رہی۔ پر یہ اکیلی سورما ٹھڈی پہاڑ کو کیا پھوڑتی۔ نیز یہ زنانِ تیغ زبان اب گرم گفتار ہو چکی تھیں —— اب گارڈ دوسری سیٹی دے چکا تھا کہ ہمارے حملہ آور کیہ سپاہی نے آخری وار کیا۔ اور کھڑکی کے راستہ ہراول کے طور پر اپنا اٹیچی کیس داخل کرنا چاہا۔ سنگ دلوں نے اُسے ہاتھوں کی سنگینوں پر باہر ہی روکا۔ اس ناکام کوشش میں وہ کام آیا۔ اور پٹڑی کے نیچے خندق میں گرا۔ ریل چلنی شروع ہوئی۔

اب ہمارے چھیلا منہ میں سگریٹ لگائے اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے —— وہ بھی ماں کی جائی آج جانے کی ٹھان چکی تھی۔ ان کا دروازہ کھلا دیکھ اوپر چڑھ آئی۔ کچھ اُنھوں نے بھی مدد کی۔ قلی نے سوٹ کیس اور بستر اندر پھینک دیا۔ اب وہ پیسوں کے لئے لپکا چلا آ رہا ہے۔ اور محترمہ سراسیمہ جیبیں ٹٹول رہی ہیں کہ صاحب بہادر نے ایک روپیہ نکال اس کے حوالہ کیا۔

ٹرین اسٹیشن سے گزر گئی۔ اور ان ہم قفس پرندوں نے آنکھیں بچا بچا کر ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔

جنٹلمین نے سامنے کی خالی سیٹ پر بیگم کا بستر رکھ سوٹ کیس ایک طرف لگا دیا۔

اور ایک میگزین خود لے باقی ان کے سامنے رکھ خموش ہو بیٹھے۔ چونکہ موجودہ تہذیب بغیر باقاعدہ تعارف کے انسان کو انسان سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ —— تھوڑی دیر بعد ڈائننگ کار کا بوائے کھانے کی بابت دریافت کرنے آیا اور پوچھا کہ صاحب ڈنر ڈبہ میں لے گا۔ یا سیلون میں۔ جواب ملا سیلون میں۔ وہ بولا اور بیگم صاحب —— اس سوال پر محترمہ کے جسم کو قدرے جنبش ہوئی۔ لیکن زبان کو نہیں۔ صاحب بہادر نے سر کھجایا اور فرمایا اچھا دونوں ڈنر ادھر ہی لے آنا۔ بوائے کا جانا اور بیگم صاحبہ کو غصہ آیا۔ بولیں۔ آپ نے میرے لئے کھانا کیوں منگایا ہے۔ مرد نے نہایت شرافت اور انسانیت سے جواب دیا۔ کیا عرض کروں ڈنر ٹائم ہونے والا ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ میں نہیں کھاؤں گی۔ جواب ملا کیا مضائقہ ہے۔ بندہ نواز کھا رہے گا۔

اس پر تو وہ آگ بگولا ہو گئی بولی آپ امیروں کو رزق کی قدر نہیں۔ روپیہ کی قیمت نہیں معلوم۔ ڈنر ٹائم ہو گیا تو ڈنر آنا لازمی کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ آج دنیا میں لاکھوں بندگانِ خدا بھوکے مر رہے ہیں۔ کسی کا بچہ دودھ کو بلک رہا ہے کوئی مریض رنگترہ کو ترس رہا ہے ——

بوائے نے نہایت قرینہ سے میز پر ڈنر لگا دیا اور جاتے ہوئے دریافت کیا حضور کیا پئیں گے؟

لڑکا۔ پانی۔

بوائے۔ اور بیگم صاحبہ

لڑکا۔ برف کا پانی۔

بوائے کے جاتے ہی ان محترمہ نے پھر اپنی چونچ کھولی۔

لڑکی ۔ یہ آپ نے کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔

لڑکا۔ (نہایت معصومانہ انداز میں) خدا گواہ ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ اتنے میں بوائے برف کے پانی کا جگ اور دو گلاس لے کر آن پہنچا اور میز پر رکھکر بولا۔ حضور پڈنگ لیں گے۔ فروٹ سیلاڈ۔ ہیرو نے جواب دیا سیلاڈ۔ اس پر اس نے کہا اور بیگم صاحب۔ اب ہماری جھلّو مولی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ بگڑ کر بولیں۔ یہ تم بیگم صاحب بیگم صاحب کیا کرتا ہے۔ تربیت یافتہ بوائے نے سر جھکا کر کہا (I beg your pardon) میم صاحب۔ اب ہیرو آڑے آیا اور فوراً بول اُٹھا۔ دیکھو مس صاحب پڈنگ کھائیے گا۔ بوائے ایک ڈش سیلاڈ کی اور ایک پڈنگ کی لے کر آیا۔ لڑکے نے باہر ہی سے لے لی۔ کہ مبادا کوئی اور بات نکل آئے۔

اب میز کے قریب جا کر اس نے ڈشز کے کور کھولنے شروع کئے اور بولا۔ ابھی تو گرم ہے کھا لیجئے۔ ٹھنڈا ہو کر بیکار ہو جائے گا۔ مس صاحب نے جواب نہ دیا۔ اور اُس طرف سے میگزین کی آڑ کر لی۔ اب ہیرو نے چکھم چکھا شروع کی اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا۔

یہ تلی ہوئی مچھلی ہے۔ صبح سویرے کڑکڑاتے جاڑے میں غریب مچھلی مارا اپنے بچوں کو سوتا چھوڑ کر گھٹنوں گھٹنوں یخ پانی میں جا کر اسے پکڑ کر لایا۔ دوکاندار کے ہاتھ بیچی۔ وہاں سے ہوٹل کے نوکر نے خریدی۔ کُک نے پکائی بوائے ہم تک لایا۔

گھونگھٹ والی جاٹنی نے سویرے ہی سویرے دودھ دوہیا۔ دہی بلویا۔ گھی بنایا وہ شہر میں بکا۔ ہوٹل کے باورچی خانہ تک آیا۔ پھر اس میں مچھلی تلی گئی۔ اب اگر پیسہ والے اسے کھانا چھوڑ دیں تو مچھلی ہارے کے بچے فاقہ مر جائیں۔ جاٹنی کی بھینس بک جائے۔ دوکاندار کا دوالہ ہو جائے۔ ہوٹل کا عملہ نوکری سے برخاست کر دیا جائے —— پس میں اسے کھانے میں نہ صرف اپنا پیٹ بھر رہا ہوں۔ بلکہ سینکڑوں غریبوں کا بھی پیٹ پال رہا ہوں —— اس فلسفیانہ اشتہا انگیز تمہید کے بعد ایک ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولا خوب بنائی ہے۔ اور ٹومیٹو سوس کے ساتھ تو عجب مزا دے رہی ہے۔ اور یہ مٹن چوپس تو لاجواب ہیں —— اُف حلق میں اٹکتے ہیں۔ انسان بڑا بے درد ہے۔ لذّت طعام کے لئے لاکھوں کی جانیں لیتا ہے۔ بے چارہ بے زبان بکرے کے پارچہ کر کر کے کھا جاتا ہے —— یہ لطیف جذبہ آج مجھ میں پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے۔ شاید کسی کا روحانی تصرف ہے —— بائیں جانب کچھ کسک سی بھی ہے۔ یہ شاید جسمانی تصرف ہے —— تو کیا یہ چوپس یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بکرا تو بہر صورت جان سے گیا۔ اب میرے نہ کھانے سے وہ تو زندہ ہو نہیں سکتا۔ اور میں اگر اسے نہ کھاؤں گا تو بھوک سے مر جاؤں گا اور ایک کے بدلہ دو کی جان جائے گی۔

لڑکی نے سامنے سے میگزین ہٹائی اور نیلے پیلے دیدوں سے دیکھا پھر کہا۔ جلدی کھا لیجئے۔ کہیں بھوک سے دم نہ نکل جائے۔ لڑکا بولا۔ اچھا آپ کی یہ رائے ہے تو پھر اس کار خیر میں شریک کیوں نہیں ہو جاتیں۔ یاد رکھئے خودکشی حرام ہے اور نہ کھانے سے آدمی کا مر جانا لابد۔ لڑکی نے نہایت طنز آمیز لہجہ میں

کہا بیشک انسان اَن کا کیڑا ہے۔ اسی واسطے اسے پیٹ کا کتا کہا گیا ہے۔

لڑکا۔ نہایت خوب خطاب ہے۔ ماشاء اللہ کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ رزق دینے والے ہاتھ کو پہچانتا ہے۔

مس صاحب اس پر بگڑ بیٹھیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ بولیں رزق دینے والا ہاتھ، امیروں کی اصطلاحیں۔ رئیسوں کے خوشنما جملے۔ غلط ذہنیت کی اختراعیں۔ غلامی زدہ دماغوں کی تراشیں۔ کوئی کسی کو رزق نہیں دے سکتا۔ یہ سب بکواس ہے۔ لہو چوسنے والے اپنے کو رزاق تصور کرتے ہیں۔ مجھے ان امیروں کی صورت سے نفرت ہے۔ اب بھی ایک سونے کے پجاری کی دنیا اُلٹنے جارہی ہوں۔

لڑکا۔ یہ کام تو آپ اب بھی کر رہی ہیں۔ بہرکیف وہ ایسا کونسا خوش نصیب ہے جس کی دنیا آپ بالارادہ الٹنا چاہتی ہیں۔

لڑکی۔ ایک سرمایہ دار۔ سر عبداللہ کریم مل اوتر کی۔ مزدوروں کی محنت پر عیش کرنے والا۔

یہ نام سن کر لڑکے کے ماتھے پر ایک شکن پڑی۔ مگر خوشی سے سنتا رہا۔

لڑکی۔ انتہائی عیاش آوارہ۔ آپ اسے جانتے ہیں۔

لڑکا۔ جی ہاں کچھ یونہی سا۔

لڑکی۔ کہتے ہیں ایک ایک رات میں اس کا ہوٹل کا بل چار چار ہزار کا ہوتا ہے

لڑکا۔ کہہ نہیں سکتا۔ ممکن تو ہے۔

لڑکی۔ جی ہاں ممکن کیسے نہ ہوگا۔ جب شرابیں پانی کی طرح بہیں گی تو آپ سے آپ بل ہزاروں تک جاتا ہے۔ اگر میاں کو خود صبح سے شام تک مشین چلانی پڑے

تو پتہ چلے۔

لڑکا۔ شراب تو وہ نہیں پیتا۔

لڑکی۔ پھر ایک ایک رات کا بل ہزاروں تک کیسے پہنچ جاتا ہے۔

لڑکا۔ کیا عرض کروں۔ آپ شاید واقف نہیں۔ تاج میں اچھا ڈنر تقریباً دس روپیہ پرہڈ (PERHAD) پڑ جاتا ہے۔ سو اگر چار سو مہمان بلائے تو چار ہزار کا بل بن جانا کوئی تعجب خیز چیز نہیں۔

لڑکی۔ مفت کا آتا ہے نا۔ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی۔ گھر بیٹھے رقمیں مرڈتے ہیں۔ ان کے لئے چار چار سو مہمان بلانے کون سی بڑی بات ہے۔

لڑکا۔ بعض اوقات بزنس کے لئے بھی ڈنرز دینے ضروری ہوتے ہیں۔

لڑکی۔ بزنس۔ مزدور کا گلا گھونٹنا زیادہ سے زیادہ کام لینا۔ کم سے کم اجرت دینا۔ انسان کو جانور کی طرح استعمال کرنا۔ پیسہ کی چیز کا روپیہ وصول کرنا۔ اسی کا نام اگر بزنس ہے تو ایسی بزنس کی جڑیں اکھیڑنے میں جا رہی ہوں —— آپ کو معلوم نہیں۔ مزدور اب تنگ آ گئے ہیں۔ عبداللہ کریم کی ملزمیں اسٹرائک ہو گئی ہے۔ اس فقرے پر لڑکے کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور اس نے پوچھا کتنے عرصہ سے۔

لڑکی۔ آج چار روز ہو گئے۔ مزدور کام پر نہیں جا رہے۔ مجھے بذریعہ تار بلایا گیا ہے۔ میاں کی عقل ٹھکانے لگا دوں گی۔ مجھے امیروں کی شکل سے نفرت ہے۔

وہ اتنا کہہ کر خموش ہو گئی۔ لڑکے نے پھر کہا آپ کھانا تو کھالیں۔

لڑکی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ مجھے امیر آدمیوں کی اغذیہ سے بھی دلی نفرت ہے۔ غریبوں سے ہمدردی پیدا کرنے کے لئے آج پورا ایک مہینہ ہونے کو آیا کہ میں نے سوائے چٹنی روٹی کے اور کچھ نہیں کھایا ہے۔

لڑکا۔ کیا مضائقہ ہے۔ آپ ٹومیٹو سوس اور ڈبل روٹی ہی سے شوق فرمائیں۔

لڑکی۔ جناب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے امیروں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں۔ محض اتفاق سے میں اس ڈبہ میں آگئی ہوں۔ اگر جناب اگلے اسٹیشن تک اپنی زبان مبارک کو آرام دے لیں تو کرم ہوگا۔ وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد آپ کی ہم سفر نہیں رہوں گی۔ اور اپنے بھائی غریبوں کے ساتھ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں جا بیٹھوں گی۔

یہ الفاظ سن کر لڑکے نے قطعاً خاموشی اختیار کر لی۔ اور آہستہ آہستہ پوٹیٹو چپس کھاتا رہا۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ گاڑی رُکی۔ لڑکی ایک نفرت آمیز انداز سے اس ماحول کو دیکھتی ہوئی ڈبہ میں سے اُتری۔

تھرڈ کلاس کی مسافر خواتین جواب تک قلعہ بند ہوئی بیٹھی تھیں اُنھوں نے اب اپنے کو حملہ آوروں سے مامون خیال کرتے دروازہ کھول لیا تھا۔ اور ایک نہایت تنومند محترمہ کھڑی نیل کے دال سیو خرید رہی تھیں۔ ہماری مس صاحب انکے پیٹ پر ذرا سا دباؤ ڈالتی ہوئی ڈبہ میں داخل ہو گئیں۔ قریب کی سیٹ پر ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ اور خوبیٔ قسمت سے ان کی کہنی پر ذرا سا دانہ۔ اسے کہیں ٹھیس لگ گئی۔ اور یہ چلائیں مس صاحبہ جو گھبرا کر پرے کو سرکیں تو دائیں جانب کسی کا تین سالہ بچہ کھڑا تھا۔ اس کی ناک پر ان کا گھٹنا لگا اور کمبخت کی نکسیر پھوٹ نگی

اتنے میں ریل چل پڑی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ڈبے میں کیا گزری۔ اس لئے کہ کیمرے کا رُخ پھر گیا۔ اور ہم فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ برابر کے ڈبہ میں سے چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور ہمارا ہیرو سخت مضطرب اور پریشان ٹہل رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اسٹیشن آیا۔ ابھی ریل پوری طرح رُکی بھی نہ تھی۔ اور ہمارا ہیرو دروازہ کھول رہا تھا کہ غربت کی دلدادہ لیڈر رانی صاحبہ بحال تباہ مثل آدم و حوا جنت الغربا سے خارج کر دی گئیں۔

لڑکے نے یہ منظر دیکھا اور دروازہ کھول ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

محترمہ نہایت جز بز پھر اسی کمپارٹمنٹ میں تشریف لے آئیں۔ اور لڑکے نے دروازہ بند کر کھڑکی میں سے منہ باہر نکال دیا۔ لیکن تھا شریر۔ برابر کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ بیگم نے پہلے تو بالوں پر ہاتھ پھیرا اپنی خون آلود ساڑھی پر نظر ڈالی سوٹ کیس کھول کر کچھ کپڑے نکالے اور اب ادھر اُدھر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی ہاتھوں سے بالوں کو درست کرتیں۔ کبھی سوٹ کیس کی جیبوں میں کچھ تلاش کرتیں۔

ہیرو تاڑ گیا کہ کنگھا برش ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اُس نے نہایت خموشی سے اپنا ڈریسنگ کیس اُٹھایا اور کھول کر پاس ٹوئلٹ میں رکھ آیا۔ پھر کھڑکی سے باہر منہ نکال کھڑا ہو گیا۔ اور یہ گیت گنگنانے لگا۔

گوری کنگھا برش تیار ہے — گوری کنگھا برش تیار ہے
ترے جوبن پہ آئی بہار ہے — گوری کنگھا برش تیار ہے
ترے ریشم سے بال! — ترے گورے گورے گال
تری قمری سی چال! — میرا جیا نثار ہے

گوری گنگھا رش تیار ہے

مس صاحبہ نے لڑکی کی جانب تیکھی چتون سے دیکھا اور اپنے کپڑے بغل میں مار ٹوئلٹ میں داخل ہو گئیں۔

منہ ہاتھ دھو صاف ستھری ہو برآمد ہوئیں۔ چہرہ پر بھی قدرے تکدر کم تھا۔ لڑکے کا ڈریسنگ کیس سیٹ پر رکھتے ہوئے کہا (Thank you) لڑکے نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ([illegible]) نیز محترمہ کی اس موڈ کو غنیمت جان کر بولا۔

لڑکا۔ میں سمجھتا ہوں آپ بمبئی پہنچتے ہی تقریر فرمائیں گی۔

لڑکی۔ جی ہاں۔

لڑکا۔ لیکن اگر آپ رات کو آرام سے نہ سوئیں تو صبح دماغ تھکا ہوا ہوگا۔

لڑکی۔ یہی میں سوچ رہی ہوں۔

لڑکا۔ اچھا تو میری ایک عرض قبول کر لیں۔ ازراہ مہربانی تھوڑا سا کھانا ملاحظہ فرمالیں تاکہ نیند اچھی آجائے۔

لڑکی۔ جی نہیں معاف رکھیے۔

لڑکا۔ دیکھیے آپ جس کام کو جارہی ہیں وہ آپ کو عزیز ہے۔

لڑکی۔ بیشک جان سے زیادہ۔

لڑکا۔ اچھا تو اب یہ بتائیے کہ مزدوروں پر آپ اپنی تقریر ہی سے تو اثر ڈال سکتی ہیں۔ کہ وہ کام پر نہ جائیں۔ تمام دقتیں برداشت کر لیں۔ لیکن اپنی بات سے نہ ہٹیں جان پر کھیل جائیں۔ پر مطالبات منظور کرا کر رہیں۔

لڑکی۔ یقیناً۔

لڑکا۔ اچھا تو اب یہ خیال کیجئے کہ اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے آپ کی تقریر کمزور رہ گئی اور ان کے جذبات میں آگ نہ لگا سکیں تو پھر آپ اپنی مشن میں ناکام رہیں گی۔ میں اسی لئے عرض کر رہا ہوں کہ کچھ کھالیں پھر آرام سے سو جائیں۔ تاکہ صبح تازہ دم اٹھیں اور اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ یقین جانئے کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس مل کے معاملات انصاف اور ایمانداری سے طے ہو جائیں۔

لڑکی۔ پر میں تو صرف چٹنی روٹی کھاتی ہوں۔

لڑکا۔ اس کا بھی انتظام ہے۔ دیکھئے اس بوتل پر چٹنی لکھا ہوا ہے اور یہ ڈبل روٹی حاضر ہے۔ اگر آپ کو اس پر اصرار ہے تو یہی سہی۔ لیکن کچھ تو کھا لیجئے۔

لڑکی۔ بہت اچھا۔

اب لڑکی نے چٹنی روٹی کھانی شروع کی۔ اور لڑکا بھی انہی چیزوں میں ساتھ دیتا رہا۔ باقی ڈشز سامنے رکھی رہیں۔

لڑکی۔ آپ یہ چیزیں کیوں نہیں کھاتے۔

لڑکا۔ کچھ بھلا نہیں لگتا۔

لڑکی۔ تو پھر یوں ہی پڑی رہیں گی۔ ضائع جائیں گی۔

لڑکا۔ کیا عرض کروں۔ ان کے ضائع جانے کا تو اتنا احساس مجھے نہیں ہے۔ ہاں یہ ڈرتا ہوں کہ رزق سامنے رکھا رہے اور آدمی اسے نہ کھائے تو سنا ہے یہ خدا کو بُرا لگتا ہے۔ اور پھر اس سے رزق چھین لیا جاتا۔

چونکہ یہ کفران نعمت ہوا۔ بہر نوع جو مقدر میں ہے ہو کر رہے گا۔ لیکن مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ چٹنی روٹی کھائیں اور میں مٹن چوپس۔

لڑکی۔ آپ کے خیالات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے حق نہیں کہ آپ کو کسی ایسی حرکت پر مجبور کروں جو آپ اچھی نہ سمجھیں۔ خیر بحالت مجبوری۔

لڑکا (ڈشیں ان کے آگے سرکاتے ہوئے) میری خاطر سے منہ کے ساتھ ساتھ زبان بھی کھل گئی۔

لڑکی۔ اجازت دیجئے کہ میں دوبارہ آپ کے کنگھا برش پیش کرنے کا شکریہ ادا کروں۔ لیکن مجھے تعجب یہ ہے کہ آپ یہ سمجھے کیوں کر کہ مجھے ان چیزوں کی تلاش ہے۔

لڑکا۔ بندہ نواز عورت اس بیتابی سے سوائے سنگھار کی چیزوں کے اور کوئی چیز تلاش نہیں کرتی۔

غرضکہ ان محترمہ نے کھانے کے دوران میں ہمارے ہیرو کو بتا دیا کہ ان کا نہ صرف سنگھار کا سامان اس اٹیچی کیس میں تھا جو اسٹیشن پر گر گیا۔ بلکہ ٹکٹ اور روپیہ پیسہ بھی سب اسی میں تھا۔ اگلے اسٹیشن پر لڑکے نے ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ اور ادا کر دیا۔ اب یہ دونوں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

لڑکا۔ معاف کیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ سو جائیں تاکہ صبح دماغ تازہ ہو اور آپ اچھی طرح تقریر کر سکیں۔ تقریر آپ نے تیار تو کر لی ہوگی۔

لڑکی۔ میں تو پہلے سے کبھی تقریر تیار نہیں کرتی۔

لڑکا۔ تعجب ہے۔

لڑکی۔ کیوں؟

لڑکا۔ میں نے اوکسفرڈ سے فن تقریر میں ڈپلومہ لیا ہے۔ اور ہم کو سب سے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ کبھی کسی جلسہ میں بغیر تقریر تیار کئے بولنے کو مت کھڑے ہونا۔ نیز گاندھی کو داوابھائی نوروجی نے بھی یہی ہدایت کی تھی۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

لڑکی۔ لیکن میں تو ہمیشہ یونہی بولنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اور جس طرح خیالات آتے جاتے ہیں۔ سامعین کے سامنے پیش کرتی جاتی ہوں۔

لڑکا۔ یہ صحیح ہے کہ دورانِ تقریر میں جو خیالات حسبِ موقع آتے جائیں انھیں روکنا نہیں چاہیئے ورنہ تقریر میں جان کم ہوتی ہے۔ اس میں سیلابی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اصل تقریر پہلے سے تیار ہونی چاہیئے۔ اور اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتی ہیں۔ تو اس احوال پر سختی سے کاربند ہو جائیے۔

لڑکی۔ لیکن اب کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے تو صبح ہی بولنا ہوگا اور میری اس تقریر کے نتیجہ پر دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔

لڑکا۔ اگر آپ کوئی مضائقہ نہ سمجھیں تو بولنا شروع کریں۔ میں سنتا جاؤں گا تقریر تیار ہو جائے گی۔

لڑکی۔ لیکن آپ کو جو تکلیف ہوگی۔

لڑکا۔ آپ اس کی پروا نہ کیجیے، میں آپ کی کامیابی میں بیش از بیش دلچسپی رکھتا ہوں۔ اور اس کام کو اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔

غرض کہ در اصل حجت کے بعد لڑکی نے تقریر شروع کی۔

بھائیو! تم نے آج کے جلسہ میں بلا کر میری عزت افزائی کی۔ یقین جانو مجھے تم سب ایسے ہی عزیز ہو جیسے میرے اپنے سگے بھائی۔ سرمایہ داروں نے تمہاری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ محنت تم کرتے ہو پھل وہ پاتے ہیں۔ تم جھونپڑوں میں گذر بسر کرتے ہو وہ محلوں میں عیش منا رہے ہیں۔ تمہاری محنت اور مشقت سے جو دولت حاصل کی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی تمہارے حصّہ میں نہیں آتا۔ روس میں مزدور اُٹھے۔ انھوں نے سرمایہ داری کو ختم کر دیا۔ اب وہاں سے امیر غریب کا فرق اُٹھ گیا۔ سب ایک حال میں ہیں۔ ایک جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مزدور سرمایہ دار کی طرح سارا روپیہ اپنی طرف نہیں سمیٹتا۔ اس کے ہاتھ میں جب طاقت آئی اس نے ملک کی دولت و ثروت کو برابر تقسیم کر دیا —— آج میں دیکھتی ہوں کہ ہمارے ملک کے مزدوروں کو بھی اپنے حقوق طلب کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے لیکن میری آپ بھائیوں سے یہ التجا ہے کہ جب اس کام کو لیکر کھڑے ہوئے ہو تو آخر تک پہنچا دینا۔ انسان یا تو کسی کام میں ہاتھ ڈالے نہیں اور جو ایک دفعہ ہاتھ ڈال دے۔ تو پھر اس کا فرض ہے کہ انتہا تک پہنچا دے۔

لڑکی یہاں تک پہنچی تھی کہ لڑکے نے ڈرسنگ کیس کھول کر قینچی نکالی۔ اور ناخن کترنے شروع کر دئے۔ وہ رُک گئی۔

لڑکا۔ ہاں آگے۔

لڑکی۔ میرا مطلب ہے —— میں آپ لوگوں سے کہنا چاہتی ہوں۔

اتنا کہہ کر آگے نہ چل سکی۔ لڑکا برابر ناخن کترتا رہا۔

لڑکا۔ آپ خموش کیوں ہوگئیں۔

لڑکی۔ آپ سن تو رہے نہیں۔

لڑکا۔ محترمہ آپ کے سامنے جو دس ہزار کا مجمع ہوگا کیا آپ یہ توقع کرتی ہیں کہ وہ سب ہمہ تن گوش مٹی کی مورتیاں بنے بیٹھے رہیں گے — بندہ نواز ایک کھانسے گا۔ ایک چھینکے گا ایک ٹوپی اتار کر اپنا گنجا سر کھجائے گا۔ دوسرا اس پر مسکرائے گا۔ تیسرا اسے چپ رہنے کی ہدایت کرے گا — ایک آپ کے رخ روشن کو گھورے گا اور پھر برابر والے کے کہنی مارے گا — دس آئیں گے۔ دس جائیں گے۔ کسی کا بچہ روئے گا۔ ایک کا پاؤں سُن ہو جائے گا۔ وہ اس کو آہستہ آہستہ دباتا ہوا آپ کو نظر آئے گا — یقین جانئے بعض اونگھ جائینگے۔ اور برابر والے ان کو ٹہوکا دیکر جگائیں — اگر اتنی سی بات سے آپ تقریر کرتے کرتے رک گئیں اور آپ کے خیالات کی ریل پٹری سے اُتر گئی تو جب یہ سب بیتے گی تو آپ اپنی تقریر کا توازن اور اس کی روانی اور (TEMPO) کس طرح قائم رکھ سکیں گی۔ میں نے تو جان کر ناخن کترنے شروع کئے تھے۔ تاکہ جناب کی دماغی یک سوئی کا امتحان کر سکوں — ہم کو کالج میں اسی طرح مشق کرائی جاتی تھی — جلسہ میں ہر نیا واقعہ مقرر کو موقعہ دیتا ہے۔ کہ وہ اس کا سہارا لے کر اپنی تقریر کو اُبھار کرلے جائے۔ ہر غیر متوقع بات بولنے والے کے لئے ایک پیغام لاتی ہے — کامل فن اس سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔ متوسط اُسے نظرانداز کر جاتا ہے اور گھٹیا توازن دماغی ہاتھ سے دے دیتا ہے۔

لڑکی۔ اچھا اب یہ فرمائیے کہ میری تقریر کے اس ٹکڑے کی بابت آپ کا کیا خیال ہے۔

لڑکا۔ سچ سچ عرض کر دوں۔

لڑکی۔ بیشک۔

لڑکا۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گی۔

لڑکی۔ ہرگز نہیں۔

لڑکا۔ اگر آپ اسی طرز پر چلیں تو اسٹرائک جاری نہیں رہ سکتی۔ آپ کی تقریر میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو مزدوروں میں آگ لگا دیتی۔ انھیں بھڑکا دیتی ان کی دُکھتی رگ دبا کر تڑپا دیتی۔ نیز ایک بات اور یاد رکھئے اگر شروع میں آپ جلسہ پر چھائیں گی تو بیچ میں ذرا اگر کبھی اکھڑ سکتی ہیں اور جو ابتدا میں تقریر پھُسپھُسی رہ گئی تو پھر مجمع کو اپنی جانب متوجہ کرنا امکان میں نہیں رہتا۔

لڑکی۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ میری تقریر میں کیا خامی تھی۔

لڑکا۔ ایک مرتبہ پھر یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔

لڑکی۔ اطمینان رکھئے۔

لڑکا۔ جناب نے ابتدا ہی غلط کی تھی۔ ہر تیسرے درجہ کا مقرر یوں ہی کہہ کر خطاب کرتا۔ سامعین اس کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کوئی نئی بات کانوں تک نہیں آتی۔ ان کے دماغ سو جاتے ہیں۔ مقرر کو چاہیئے کہ چھٹتے ہی اپنے سامعین کو ان الفاظ سے مخاطب کرے جن کے لئے وہ تیار نہ ہوں۔ تاکہ خلاف توقع الفاظ

سن کر جاگ اُٹھیں۔ چوکنے ہو جائیں۔ شوق اور ولولہ دلوں میں پیدا ہو جائے۔ یاد رکھئے آپ کی تقریر کی بنیاد پہلے الفاظ پر ہونی چاہیئے۔ آپ کو آگے جو عمارت بنانی ہے۔ بنا اس کے مطابق ڈالئے۔ تو خود بخود دیواریں اُٹھتی چلی جائیں گی ورنہ عمارت کُڈھب بنے گی۔ عام نظریں تو یہ نہ بتا سکیں گی کہ عیب کیا ہے۔ لیکن نظر فریب نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح تقریر کا پہلا لفظ تقریر کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اگر اصل تقریر کے مناسب حال نہیں تو سمجھ لیجیے کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج

اگر سامعین کو مخاطب غلط الفاظ سے کر لیا تو کام بنے گا نہیں۔ سننے والے یہ تو نہیں بتا سکیں گے کہ تقریر میں کیا خرابی تھی۔ ہاں آپ خود یہ دیکھ لیں گی کہ جو اثر پیدا کرنا چاہتی تھیں وہ نہ ہو سکا۔

لڑکی۔ اچھا تو جناب کس طرح شروع کرتے۔

لڑکا۔ کیا عرض کروں مجھے مشق بالکل نہیں رہی۔ بس کچھ اصول عرض کر دئے گئے۔

لڑکی۔ پھر بھی۔

انجام کار لڑکی کے اصرار پر لڑکا کھڑا ہوا اور بولنا شروع کیا۔

آگ اور لوہے سے کھیلنے والے مزدورو! فولاد کو پانی کر کے بہا دینے والے جوانو! آج میں تم کو خوش خبری دینے آئی ہوں کہ تمہاری دہاڑ سن کر پتھر کے پتّے پانی ہوئے جا رہے ہیں اور سنگ دل اپنی اپنی جگہ تھرا رہے ہیں۔ سرمایہ داری کی سر بفلک عمارت لرزہ بر اندام ہے۔ استبداد کا جھنڈا جھک گیا ہے۔

ظالم مظلوم کے قدموں پر جھکنے کو ہے۔ دولت محنت کے دربار میں حاضر ہوا چاہتی ہے۔ مشقت مہارانی کا دربار جمنے والا ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ اور میں جانتی ہوں تم لاج کے رکھنے والے ہو۔ —— یاد رکھو تمام عالم کی نظریں تم پر جمی ہیں۔ دنیا تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ ایک بھاری بوجھ تمہارے کندھوں پر رکھا ہے۔ یہ مزدور کے کندھے ہیں۔ بوجھ بھار اُٹھانے کے عادی یہ نہ جھک سکتے ہیں نہ جھکائے جا سکتے ہیں —— یاد رکھو اگر اس وقت ایک قدم بھی پیچھے ہٹ گئے تو تمہاری اولاد تمھیں کوسے گی —— آنے والی نسلیں تمہاری قبروں پر لعنت بھیجیں گی۔

یہ جنگ تم اپنے لئے نہیں لڑ رہے۔ اپنی معصوم اولاد کے لئے لڑ رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں جون جولائی کی گرمی میں جب آسمان سے آگ برستی ہے زمین تانبہ کی طرح تپتی ہے اس وقت تم اپنے آپ کو بھٹیوں میں کس کے لئے جھونکتے ہو۔

لڑکی کے منہ سے نکلا اولاد کے لئے۔

تم برفانی جاڑے میں ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر انجنوں کی پیاس بجھاتے ہو۔ یہ کس کے لئے۔

پھر لڑکی کے منہ سے نکلا اولاد کے لئے۔

وہی اولاد۔ وہی اولاد جس کے لئے تم یہ سارے پاپڑ بیلتے ہو۔ مصیبتیں جھیلتے ہو آج تم سے کہہ رہی ہے کہ پتا جی پیچھے نہ ہٹنا۔

فرض کرو ایک درندہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے اور تمہارا بچہ تمہاری انگلی پکڑے ہوئے ہے تو کیا تم بچہ کو آگے کر دو گے۔

لڑکی بے ساختہ بول اٹھی نہیں"۔

لڑکا۔ خود آگے بڑھ جاؤ گے۔

لڑکی۔ ہاں۔

اب میں ان ماؤں سے پوچھتی ہوں جو میرے بائیں ہاتھ پر ہیں جن میں سے اکثر اپنے لعلوں کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ جو خود گیلے میں سوئیں اور بچوں کو سوکھے میں سُلایا جو خود دھوپ میں رہیں اور بچّوں کو سایہ میں لٹایا جنھوں نے جاڑے کی ٹھنڈی راتوں میں لحاف کا بیشتر حصّہ بچّہ کو اڑھایا اور خود سُکڑی رہیں جنھوں نے اس اولاد کے پالنے میں نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ جن ماتاؤں نے سارا جوبن گھلا جب ایک لالہ پالا ——— میں ان ماتاؤں سے پوچھتی ہوں کہ فرض کیجیے آگ بھڑک رہی ہے اور آپ اپنی ماتا کو گود میں لئے ہوئے ہیں۔ اب سینوں پر ہاتھ رکھکر اور اپنے دلوں کو ٹٹول کر بتائیے۔ آپ بچّہ کو آگ سے دُور رکھیں گی یا اپنے آپ کو بتائیے۔

لڑکی۔ بچّہ کو۔

بس تو سمجھ لیجیے اس وقت بھی دنیا میں چاروں طرف آگ لگ رہی ہے۔ اب اس میں چاہے اپنے بچّوں کو جھونک دیجیے چاہے خود جُھنک جائیے اور اپنے بچّوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے مصائب کی دہکتی ہوئی آگ سے بچا لیجیے۔ اگر آپ اس وقت ان شعلوں سے گھبرا اٹھے تو یاد رکھئے۔ نہ صرف یہ آگ آپ کی اولاد کو جھلس دیگی بلکہ آپ کے پوتوں اور پڑپوتوں کو خاک سیاہ کر دے گی اور آپ بھی اس کی لپٹ سے بچ نہ سکیں گی یہ آزمائش کا وقت ہے ——— منزلِ دور

نہیں اور یہ قدم مزدور کے قدم ہیں امیر کے نہیں۔ منزل سے ادھر رک نہیں سکتے۔ مقام سے پہلے ٹھیر نہیں سکتے۔

لڑکی۔ جواب تک بے خودی کے عالم میں ساکت و جامد بیٹھی سُن رہی تھی۔ کچھ سوچنے لگی اور تھوڑی دیر بعد اس نے بچہ کو رونے کی سی آواز نکالی۔ ساتھ کے ساتھ اپنی اس حرکت پر ہنس بھی دی۔

مسافر ایک لمحہ کے واسطے رُکا اور پھر بولا۔

غریب کا بچہ رو رہا ہے اور امیر کا ہنس رہا ہے۔ مزدور کا بچہ پیدا ہوتے ہی بُھوک کے معنی جان جاتا ہے۔ سرمایہ دار مرتے دم تک اس لفظ سے ناآشنا رہتا ہے ——— میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہ وقت دُور نہیں جب کہ غریب اپنے بچوں کے رونے کی نہیں بلکہ ان کے ہنسنے کی آوازیں سنا کریں گے۔ اُنکی سُسکیاں نہیں۔ ان کے قہقہہ ماں باپ کے کانوں میں پڑا کریں گے۔ بولو تم چاہتے ہو کہ وہ وقت جلدی آجائے۔ جواب دو۔

لڑکی۔ ہاں۔

اچھا تو اس وقت کڑی جھیل لو تو پھر وارے نیارے ہیں۔ میں آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اندھیرے میں لے جانا نہیں چاہتی۔ پہلے سے جتائے دیتی ہوں کہ یہ آگ سے کھیلنا ہے۔ لیکن یاد رکھو تم اب بھی روزانہ آگ سے کھیل رہے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ اس سے کھیل کر تم امیروں کے لئے پھولوں کا بستر تیار کرتے ہو۔ اور آج میں جس آگ سے کھیلنے کی تم کو دعوت دے رہی ہوں اگر اس سے ایک دفعہ دل کھول کر کھیل لو تو اپنے بچوں کیلئے سیجیں سجا جاؤ گے۔

تم نے مجھے بلایا۔ میں آگئی۔ پر ایک سوال لے کر آئی ہوں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ میرے بھائی تجھے خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے غریب ہندوستانی بھائی بہنوں کا حق ادا کیا کرتے ہیں یہ بہن بھکارن تمہارے دروازے پہ آئی ہے۔ اور تمہاری بلائی ہوئی آئی ہے۔ اب لاج تمہارے ہاتھ ہے رکھو گے۔

لڑکی۔ ہاں رکھیں گے۔

دروہ دیوار سے بھی آواز آئی۔ لڑکا تھک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر دونوں خموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد لڑکی نے پانی کا گلاس بھر کر دیا۔ اور کہا خدا نظر بد سے بچائے۔ کاش آپ اس کام میں میرے ساتھ ہوتے۔

لڑکا۔ میں اب بھی ساتھ ہوں۔

لڑکی۔ ایک بات رہ گئی۔

لڑکا۔ وہ کیا۔

لڑکی۔ اس تقریر میں مل اونر کے خلاف میں نے مزدوروں کو بھڑکایا نہیں اور یہ لازمی ہے۔ مجھے اس سے قلبی نفرت ہے ایک مرتبہ اس کے گھر کو آگ لگوا دینی چاہتی ہوں۔

لڑکی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ (کہہ کر پھر اٹھا اور بولنے لگا)

لڑکا۔ آپکو معلوم ہے وہ بھیک کیا ہے جسے دینے کا آپنے اتنی آسانی سے وعدہ کر لیا ہے سنئے کل میں سنگدل مل اونر کے پاس گلے میں جھولی لیکر جاؤں گی گڑگڑا کر خوشامد کروں گی کہ میرے بھائیوں کا حق دیدے پر وہ کٹھور ہے۔ ظالم ہے بہت زبردست ہے۔ راضی ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ میں اپنی سی سب کچھ کروں گی لیکن اگر اس گھر کے

دھتکاری جاؤں۔ نہ اس واپس آؤں تو پھر تم سے یہ بھیک مانگتی ہوں کہ بھوکے مر جانا کام پہ نہ جانا۔ ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ بہن کبھی تمہارے ساتھ جان دے دے گی۔ لڑکا پھر اپنی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ اور لڑکی نے ایک خاص نگاہ سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اتنے میں اسٹیشن آ گیا۔ اور اسٹیشن ماسٹر نے ان کے کمپارٹمنٹ میں آکر پوچھا۔ سر احمد کریم اس ڈبہ میں ہیں۔ لڑکے نے کہا۔ میں ہی ہوں۔ اس نے ایک تار دیا۔ لڑکی یہ نام سن کر پریشان سی ہو گئی۔ اور لڑکا تار پڑھنے لگا۔ چہرے پہ ایک سیکنڈ کے واسطے کچھ سایہ سا پڑا۔ لیکن فوراً گذر گیا جیسے سورج کے سامنے لکۂ ابر ایک لمحہ کے لئے آئے اور چلا جائے۔ اتنے میں ملازم آیا۔ بیش بہا کمخواب کا ڈریسنگ گاؤن اور اصلی ریشم کا سلیپنگ سوٹ سلیپر تسبیح۔ قالین کی جانماز نکال سیٹ پر رکھ گیا۔ لڑکا اٹھ باتھ روم میں گھس گیا۔ ہیروئن عورت ذات تجسس کی پتلی۔ تو اکی بیٹھ رہ نہ سکی۔ اور چپکے چپکے ان کا تار پڑھ لیا۔ لکھا تھا۔ پتہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے پیشتر اطلاع نہ کر سکے۔ ابھی معلوم ہوا کہ آپ اس ٹرین سے آ رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے۔ کہ مزدوروں نے اسٹرائک کر رکھی ہے۔ اسی گاڑی سے ایک سوشلسٹ لیڈر مس انجم نامی ان کی بلافی ہوتی آ رہی ہیں۔ مزدور بگڑا ہوا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے خیر مقدم کو اسٹیشن پہ موجود ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب ایک اسٹیشن پہلے اتر جائیں۔ مزدوروں سے کوئی نازیبا حرکت ہو جانی بعید نہیں۔

ہیرو تھوڑی دیر شب خوابی کے کپڑوں پہ گراں بہا ڈریسنگ

گاؤن پہنے بڑی سج دھج کے ساتھ باتھ روم سے برآمد ہوئے قطب نما دیکھ جا نماز بچھائی۔ لڑکی کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے بولی اگر مضائقہ نہ ہو۔ تو کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ تار کس کے بارے میں تھا۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔

لڑکا۔ کچھ نہیں ایک بزنس تار تھا ایک نیا معاملہ ہو رہا ہے۔

لڑکی۔ کس قسم کا۔

لڑکا۔ بارود اور دیا سلائی کا۔

اتنا کہہ جانماز بچھا نیت باندھ لی۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو تسبیح لے سیٹ پر آن لیٹا۔ لڑکی سے کہ کروٹیں بدل رہی ہے آخر رہ نہ سکی۔ تو پوچھا آپ بمبئی پر اتر یں گے۔ ؟ اس نے تسبیح دکھاتے ہوئے سر سے ہاں کا اشارہ کیا۔ جس کے معنی تھے کہ پڑھ رہا ہوں بات نہیں کر سکتا۔ پر اتروں گا بمبئی ہی پر۔ اب تسبیح ہلاتا ہوا اٹھا۔ سوائے ایک شیڈ لیمپ کے تمام بتیاں بند کر دیں۔ اور پھر کھڑکیوں کی جانب کروٹ لے ہم سفر سے منھ پھیر لیٹ گیا۔ لڑکی ہار جھک مار کر اکٹی تو یہ سو چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تو ٹہلتی رہی پھر اپنا سوٹ کیس ڈھمڈولیسی کھولا۔ میگزینیں بڑی زور سے میز پر پٹکیں۔ ایک کھڑکی چڑھائی ایک اتاری کھانسی کھنکارتی رہی۔ غرض کہ اپنی سی سب کچھ کی۔ پر وہ تو مردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ یہ اشیرئس سے مس نہ ہوا۔

صبح جو لڑکی کی آنکھ کھلی تو یہ بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ اور ملازم لبستر طے کر رہا تھا۔ بیگم اٹھ سیدھی ٹولٹ میں گھس گئیں اتنے میں یہ بھی نماز سے فارغ ہوئے۔ وہ بھی بن سنور کر نکل آئیں تو کیا دیکھتی

ہیں کہ چلئے نہایت سلیقہ سے میز پر چنی ہے۔ تھوڑی سی رد و قدح کے بعد یہ پینے ہو بیٹھیں۔ اب باتیں ہونے لگیں۔

لڑکی۔ ٹرین بمبئی کس وقت پہونچے گی۔

لڑکا۔ آٹھ بجے۔

لڑکی۔ اب کیا وقت ہے۔

لڑکا۔ سات۔

لڑکی۔ ابھی کئے اسٹیشن بیچ میں آئیں گے۔

لڑکا۔ کوئی نہیں۔

لڑکی۔ تو کیا آپ بمبئی پر ہی اُتریں گے۔

لڑکا۔ جی ہاں۔

لڑکی۔ میں کہتی ہوں۔ کہ اسٹیشن سے ادھر ہی کیوں نہ اُتر جائیں۔

لڑکا۔ کیوں۔

لڑکی۔ یونہی میرا دل چاہ رہا تھا۔ کہ بمبئی کی نواح کو صبح صبح ہی دیکھوں

لڑکا۔ آپ تو کچھ عرصہ ہمارے شہر میں ٹھیریں گی۔ سیر کر لیجئے گا۔ میں سیر کراؤں گا۔

لڑکی۔ جناب نے اب تک اپنا پتہ تو مجھ کو بتایا نہیں۔

لڑکا۔ نہیں کہہ سکتا کہ بمبئی پہونچ کر میرا پتہ بھی رہیگا یا نہیں۔

لڑکی۔ کیا کہا۔

لڑکا۔ کچھ نہیں۔ شاید وطن پہنچکر مجھے انتقال کرنا پڑے۔

لڑکی۔ خدا نخواستہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

لڑکا۔ میری مراد ہے کہ جس مقام پہ اب ہوں وہاں سے شاید منتقل

ہو جاؤں۔ اس وجہ سے فی الحال کوئی پتہ پیش نہیں کر سکتا۔

لڑکی۔ نہ جناب نے اسم گرامی ہی بتایا۔ میرا نام انجم ہے۔ اور جناب کا۔ لڑکے نے خوشی کے ساتھ اپنے سرہانے سے لفافہ جس میں تار بند تھا اٹھا کر دے دیا۔ لڑکی نے اسے پڑھا۔ پھر ہیرو کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے رحمدل قصائی بنیا، بکرے کو دیکھے یا آپریشن سے پہلے ڈاکٹر مریض پر نگاہ رحم ڈالے۔ پھر تار نکال کر پڑھنے لگی۔

لڑکے نے احتجاج کیا۔ لیکن اس نے ذرا پرواہ نہ کی۔ اب اکٹھی اور بھپری ہوئی شیرنی کی طرح ڈبہ میں ٹہلنے لگی۔

لڑکی۔ آپ بمبئی پر اترہ ہے گے؟

لڑکا۔ جی ہاں۔

لڑکی۔ معلوم ہے۔ مزدور آپ کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔

لڑکا۔ میں مقدرات کا قائل ہوں۔

لڑکی۔ موت کے منہ میں جانا کس نے بتایا ہے۔

لڑکا۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی ہے۔

لڑکی۔ آپ ڈرتے نہیں۔

لڑکا۔ میں مرد ہوں۔

لڑکی۔ میں آپ کو نہیں بچا سکوں گی۔

لڑکا۔ اس کے جواب میں عجیب انداز سے شانہ اونچا کر کے مسکرایا جس کے معنی تھے کہ آپ کیا اور آپ کی بساط کیا۔

وہ پھر تھوڑی دیر ٹہلتی رہی۔ ذرا غصہ دھیما ہوا۔ اور اس نے نئے ہتھیاروں سے حملہ کیا۔ خوشامدانہ لہجہ میں بولی۔

لڑکی۔ کیا آپ کو میری خاطر منظور نہیں۔

لڑکا۔ مجھے اپنی عزت دنیا کی ہر چیز سے پیاری ہے۔

لڑکی۔ موت آپ کو کشاں کشاں لے جا رہی ہے۔

لڑکا۔ موت وقت سے پہلے آ نہیں سکتی اور آئی ٹلتی نہیں!

لڑکی۔ آپ بے عزتی سے نہیں ڈرتے۔

لڑکا۔ ڈرنا مرد کے لیے بے عزتی ہے۔

لڑکی۔ اچھا تو آپ بمبئی کے ہی اسٹیشن پر اتریں گے۔

لڑکا۔ ارادہ تو یہی ہے۔

لڑکی۔ میرا ارادہ کچھ اور ہے۔

اتنا کہہ کر وہ خموشی سے دروازہ کے پاس جاکر کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اسٹیشن آیا۔ یہ دروازہ کھول کر پلیٹ فارم پر اتری۔ پھر اپنی جگہ آن کھڑی ہوئی۔ ریل چلنے لگی۔ پلیٹ فارم سے گذر رہی تھی۔ کہ یہ کود پڑی۔ لڑکے نے گھبرا کر زنجیر کھینچ لی۔ ابھی ٹرین رکنے نہ پائی تھی کہ وہ کودا۔ اب تو ازدحام ہو گیا۔ لڑکی کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ خون جاری تھا۔ لڑکے کا گھٹنا زخمی۔ سامان گارڈ کے حوالہ کیا۔ ملازم ٹیکسی لایا دونوں مقامی ڈاکٹر کے یہاں پہونچے۔ لڑکی سر کے تکلیف سے بے چین تھی۔ لیکن چہرے پر فتحمندی کے آثار کھیل رہے تھے۔ معمولی مرہم پٹی کے بعد دونو بمبئی پہونچے۔ لڑکی ہسپتال میں داخل کر دی گئی۔ مردوں کا جم غفیر اسٹیشن سے مایوس واپس گیا۔ اطلاع ملی کہ جے جے ہسپتال میں زخمی پڑی ہیں۔ چند نمائندے وہاں ملنے گئے۔ وقت کی خوبی جب یہ کمرے کے دروازہ پر پہونچے. لڑکا مل کا مالک لنگڑاتا ہوا نکل رہا تھا۔ مزدوروں نے ایک

دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اب یہ کمرے میں داخل ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد دریافت کیا کہ جلسہ کب کیا جائے بات چیت کے دوران میں ایک نے کہا کہ آپ سر احمد کریم کو جانتی ہیں؟ لڑکی کچھ سٹ پٹا سی گئی۔ یہ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چلے گئے۔ لیکن مشتبہ، اب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک بولا۔ بک گئی۔ دوسرے نے کہا دھتکار رہے۔ غرض افواہ کی لاکھ زبانیں جنبش میں آئیں۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لڑکی کو کچھ خبر نہیں۔ وہ زیب ہوٹل میں پڑی ہے۔ کہ اتنے میں سر سہراب جی ایل اوزنہ کا ایجنٹ آیا۔ کارڈ پر لکھا تھا کہ بہت ضروری کام ہے۔ یہ ایک جہاندیدہ شخص پہلے تو خیریت دریافت کی۔ پھر کہا کہ سر سہراب جی نے کہا کہ ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ شام کو سیر کے لئے موٹر بھیجدی جائے۔ لڑکی نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ بھی ذکر چھیڑ دیا کہ سر احمد کریم سے ان کی تجارتی رقابت ہے۔ اور اس کی مل میں ہڑتال جاری رکھنے میں وہ ہر طرح مدد دینے کو تیار ہیں۔ اس بات پر لڑکی کے تیور کچھ بگڑے۔ لیکن وہ کچھ سوچ کر خموش ہو گئی۔ ان حضرت نے برسبیل تذکرہ یہ بھی فرما دیا کہ مل ہینڈز میں آپ کے خلاف خیالات پیدا ہو گئے ہیں نیز شہر میں یہ بھی چرچا ہے کہ سر احمد کریم سے آپ کی رسم ہے۔ لوگوں نے انھیں یہاں آتے جاتے بھی دیکھا ہے۔ لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کہا کہ مجھے زیادہ باتیں کرنیکی اجازت نہیں ہے یہ کب ٹلنے والے تھے۔ بولے بہت اچھا، بہت اچھا۔ آپ ہرگز نہ بولئے میں باتیں کرتا رہوں گا۔ تاکہ آپ کا دل بہلے۔ اب اس نے دنیا بھر کے قصے

شروع کر دیئے۔ اور باتوں باتوں میں یہ بھی کان میں ڈال دی کہ سر احمد کریم نے آپ کی پوزیشن خراب کرنے کے لئے اپنے اور آپ کے تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ ہمارے سی، آئی، ڈی ان کے مل میں رہتے ہیں ہم کو منٹ منٹ کی خبر دیتے ہیں۔ لڑکی کا ہاتھ بستر سے اٹھ کر ان کے منہ کی طرف آرہا تھا۔ لیکن رک گیا۔ اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آگئی۔ اتنے میں نرس نے آکر اطلاع دی کہ سر احمد کریم آئے ہیں یہ یہ نام سُن کر سر سہراب کے ایجنٹ بغلیں جھانکنے لگے۔ اب لڑکی سے اجازت لے کر رخصت ہوئے دروازہ پر دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی انھوں نے نہایت تپاک سے سلام کیا۔ لڑکے نے متانت سے جواب دیا۔ اندر آنے کے بعد ہیرو نے زخموں وغیرہ کی بابت دریافت کیا۔

لڑکا۔ میں ایک بات کی معافی چاہتا ہوں اور آئندہ احتیاط رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

لڑکی۔ کیا بات؟

لڑکا۔ میں بغیر وقت کا تعین کئے آجاتا ہوں۔

لڑکی۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔

لڑکا۔ تاہم آپ کے پاس دس اور بھی ملنے والے آتے ہیں ہو سکتا ہے کوئی میرے سامنے آنا پسند کرے کوئی نہ کرے۔ اور شاید آپ بھی اسے اچھا نہ سمجھیں۔

لڑکی۔ مطلب؟

لڑکا۔ کچھ نہیں یہ سیاست کی دنیا ہے اس میں سب ہی رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکی۔ (بستر پر اُٹھ بیٹھی) صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ جناب مجھ کو مسٹر سہراب کا ایجنٹ فرماتے ہیں۔

لڑکا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ ان کا ایجنٹ یہاں آیا تھا، میں آتا تھا کہ وہ نکلا۔

لڑکی۔ جناب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھ کو پورا پورا اختیار ہے جس سے چاہوں ملوں اور جس سے نہ چاہوں نہ ملوں۔ نیز یہ امر بھی گوش گذار کر دینا چاہتی ہوں کہ میں بھی یہاں لیٹی لیٹی سب افواہیں سنتی رہتی ہوں۔

لڑکا۔ کیا افواہ

لڑکی۔ صرف ل ہنٹر کی لگا ہوں میں میری پوزیشن خراب کرنے کے لئے حضور میری اتفاقی شناسائی کو شہرت دے رہے ہیں بہرکیف یہ سیاست کی دنیا ہے۔ اس میں سب رنگ کرنے پڑتے ہیں۔

لڑکا یہ الفاظ سن کر کھڑا ہو گیا۔ چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے زہر آلود نشتر دل و جگر کے پار ہو گیا ہو۔ اور وہ کبھی کسی دوست سے ہاتھ سے۔ نہایت خموشی سے کمرہ کے باہر چلا گیا۔ کواڑ بند ہونے تھے کہ لڑکی نے تکیہ میں منہ چھپا کر رونا شروع کیا۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر دیکھا۔ تو بخار تیز تھا۔

لڑکا تمام رات ان مقامات پر پھرتا رہا۔ جہاں عارضی سکون بکتا ہے۔ دولت لٹاتا شربت کی تلاش میں شراب انڈھاتا رہا غم کا اندھا دل پے زخم سہتا پھرا۔ لیکن زہر کی بجھی ہوئی سوئیوں سے پھول کا مارا گل خوردہ کاغذی پھول دیکھ کر کانٹوں میں گھس گیا۔۔۔۔ تار تار ہو گیا پھول ہاتھ نہ آیا۔ پیاسا شراب سے خشک ہونٹ تر کرنا چاہتا تھا مت

مارا پاپ نگر میں پریم ڈھونڈتا پھرا۔ گانٹھ کا پورا آنکھ کا اندھا کنجی کو کندن سمجھا۔ لیکن جب اس دنیا سے تھکا ہوا واپس آیا تو زبان پر یہ شعر تھا ؎

بے یار جا کے ہم نے گلستاں میں کیا کیا۔
ہاں یہ کیا کہ داغ کہن کو ہرا کیا۔

دوسرے دن لڑکی کے پاس پھر وہی سہراب جی کے ایجنٹ آن موجود ہوئے۔ اور لگے الٹی سیدھی باتیں کرنے۔ آج لڑکی کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ ان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ رجحان طبع دیکھ کر انھوں نے کہہ ہی دیا کہ اگر وہ سر احمد کریم کی مل میں اسٹرائیک ابھی اور جاری رکھوائیں تو پانچ ہزار روپیہ روز کے حساب سے نذر کیا جا سکتا ہے یہ فقرہ لڑکی نے تلخ دوا کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُتارا۔ اب انھوں نے لڑکی کو ان لوگوں کے نام بتا دیئے جو ان کی جانب سے مل میں فساد کرانے کے لئے چھوڑے گئے تھے۔ لڑکی نے کچھ غور کے بعد کہا۔

لیکن میری پوزیشن تو مل ہینڈ میں خراب ہو چکی ہے۔ وہ اب میری کیوں سننے لگے۔

ایجنٹ۔ اس کا انتظام کر لیا جائے گا۔ بشرطیکہ آپ ہمارے کہنے پر چلیں۔

لڑکی۔ آخر کس طرح۔

ایجنٹ۔ اوّل تو اسٹرائیک کے تمام لیڈر ہمارے آدمی ہیں اور کراؤڈ ان کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرف چاہیں گے موڑ دیں گے۔ دوسرے آپ کی تقریر میں ایسے پہلو رکھے جائیں گے۔ جس سے آپ کی پوزیشن صاف ہو جائے

اور سارا الزام مل کے مالک کے سر جائے۔

لڑکی۔ اس کے لئے آپ کیا پہلو اختیار کریں گے۔

ایجنٹ۔ واقعات کو دوسرے رنگ میں ڈھال لیا جائے گا مثلاً آپ ریلیا سے اس لئے کو دیں کہ سر احمد کریم آپ کی عزت پر ہاتھ ڈال رہے تھے۔

لڑکی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں، میں نے عدالت کا دروازہ کیوں نہ کھٹکھٹایا۔

ایجنٹ۔ اوّل موجب ان تفصیلات کو سوچنا نہیں تاہم اس کا جواب بھی موجود ہے۔

لڑکی۔ وہ کیا؟

ایجنٹ۔ آپ نے ترک موالات کے زمانے سے انگریزی عدالت میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے ان کو قرار واقعی سزا نہ دلوا سکیں۔

لڑکی۔ میں سمجھ گئی۔ اچھا میرا دماغ تو صحیح کام کر نہیں رہا۔ آپ تقریر لکھوا کر بھجوا دیجئے۔ اور ان کے نام مجھے لکھ دیجئے جو آپ کے ایجنٹس مل میں کام کر رہے ہیں۔ نام تو ان صاحب نے فوراً لکھ دیئے اور تقریر بھیجنے کا وعدہ کر گئے۔ لڑکی کو اوّل تو پہلے ہی سے رنج تھا۔ پھر مرضی کے خلاف باتیں سنیں اور ضبط کیا۔ بخار تیز ہو گیا اس پر طرہ یہ کہ تھوڑی دیر بعد نرس نے لا کر ایک موٹا سا لفافہ دیا لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ راقم الحروف نے آپ کی پوزیشن دانستہ یا نادانستہ خراب کی۔ بہرکیف منسلکہ تقریر اس کی تلافی کر دے گی ظالم نے وہی پہلو لیا تھا جو ایجنٹ نے تجویز کیا تھا۔

تقریر کا پڑھنا تھا کہ لڑکی کی حالت خراب ہو گئی۔ اب جو ڈاکٹر نے آکر دیکھا، تو بے ہوش پڑی تھی۔ اور ہذیانی کیفیت۔ بار بار کریم کا نام لیتی اور کہتی کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے سر کریم کو ٹیلیفون کر کے حالت بتائی۔ وہ گھبرایا ہوا آیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بخار بگڑ گیا ہے۔ وہ بڑی دیر تک سر پکڑے لڑکی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ وہ بار بار آنکھ اٹھا کر دیکھتی مگر پہچانتی نہ تھی۔ برف کے کپڑے ماتھے پہ رکھے۔ اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے آنکھ بھر کر دیکھا مگر نظریں فہم و تفہیم سے خالی تھیں۔ مسلسل بہک رہی تھی۔ کبھی کہتی کریم، انجم غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ تم کو سمجھ نہیں لیکن مر جائے گی جھکے گی نہیں۔ اپنے نام کی لاج رکھو، آ جاؤ۔ کبھی تقریر کے فقرے دہراتی۔ گاہ اپنی پوزیشن خاک میں ملا دینے پہ آمادگی ظاہر کرتی، تو لمحہ بھر مجھ سہراب کو برا کہنے لگتی۔ رات گئے لڑکا وہاں سے واپس آیا انجم کی طبیعت بھی قدرے سکون پذیر تھی۔ ادھر یہ پریشان خاطر پلنگ پہ لیٹا، ادھر لڑکی کی آنکھ کھلی۔ سر پہ ہاتھ رکھا۔ کچھ سوچا۔ اب دماغ کی حالت درست تھی لیکن سخت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ نرس کی نگاہیں مریض پر جمی تھیں۔ وہ مشین کی طرح اٹھی۔ گلوکوس کے دو گھونٹ دیئے۔ نبض دیکھی۔ سر کا کپڑا بدلا۔ اور کہا سو جاؤ۔ اور خود چارٹ پر ٹمپریچر کے نمبر درج کرنے لگی۔ انجم نے کاغذ، قلم مانگا۔ نرس نے دینے سے انکار کر دیا۔ مریض نے لجاجت سے کہا بس دو سطریں لکھوں گی۔ اس کے بغیر مجھے سکون نہیں ہو گا۔ ایک فرض انجام دینا ہے نرس کو ترس آ گیا۔ کچھ مناسب بھی یہی سمجھا۔ فاؤنٹین پن اور کاغذ دے دیا

لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ زیادہ نہ لکھیں۔ اب کمزوری اور جذبات سے کپکپاتے ہاتھوں سے لڑکی نے لکھنا شروع کیا۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید!

نویسندہ را نیست فردا امید

جناب کی مل میں مندرجہ ذیل ملازمین سر سہراب سے ملے ہوئے ہیں۔ اسٹرائیک بھی انھوں نے ہی کرائی ہے۔

مرسلہ کنندہ

ایک غلط فہمی کی شکار خوردہ

لفافہ پر کریم کا پتہ لکھ بند کر نرس کو دے۔ تکیہ پر سر رکھ پھر پڑ گئی انتہائی کمزوری ہو چکی تھی۔ اتنی تکان بھی برداشت نہ کر سکی اور بے شرت ہو گئی۔ صبح ہی کریم کو خط ملا۔ پڑھ کر بے چین ہو گیا سیدھا ہوسٹل پہونچا۔ موقع شناس نرس ٹل گئی۔ مگر جاتے جاتے اتنا کہہ گئی کہ زیادہ باتیں نہ کیجئے گا۔ بہت کمزور ہیں۔ تھوڑی دیر تو خموشی طاری رہی۔ وہ ہم سے چپ ہیں ہم ان سے چپ ہیں منانے والا کوئی نہیں تھا جو منا تا لڑکا سر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا۔ لڑکی کا سر تکیہ پر پڑا رہا۔ تھوڑی دیر میں انجم کی آنکھوں سے تکیہ تر ہو گیا۔ اب لڑکے نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ گھبرا کر اٹھا۔ پانی کا گلاس بھر کر دیا اور پھر پاؤں پکڑ لئے درمیان جان و جانان ماجرائے رفتہ رفت۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے۔ جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر جانبین سے آنکھوں آنکھوں میں اظہار۔ ندامت و پشیمانی ہوا۔ اور یہ قرار پایا کہ آئندہ کسی حالت میں کبھی ایک دوسرے کی طرف سے غلط فہمی میں نہیں پڑیں گے۔ جو بات

ہو گئی۔ صاف صاف پوچھ لیں گے۔

انجم کے اصرار پر یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ وہ سر سہراب سے ساز باز کر کے معاملہ کی تہ تک پہونچے اور پھر جیسا مناسب ہو اقدام کیا جائے اتنے میں نرس دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی کریم اجازت لے کر رخصت ہوا۔ انجم اس روز سوائے سر سہراب کے ایجنٹ کے اور کسی سے نہ ملی

اسٹرائیک ابھی تک جاری تھی انجم کی علالت نے پروگرام اپ سیٹ کر دیا تھا۔ لیڈرز سر جوڑ کر بیٹھے آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی شعلے بھڑکتے رکھنے لازمی تھے۔ مزدوروں کو کسی نہ کسی دھن میں لگائے رکھنا اشد ضروری۔ سکون دماغوں کو سوچنے کا موقع دیتا ہے اور لیڈرز کے لئے یہی سم قاتل۔ سر سہراب کے تنخواہ داروں نے رائے دی کہ مشاعرہ کیا جائے۔ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ اوّل تو مزدوروں سے سارا چندہ جمع کیا جا چکا تھا۔ علاوہ بریں سر سہراب کی سنہری مدد شامل حال تھی بڑے بڑے مزدور پرست شعرا سارے ہندوستان سے بلائے گئے۔ علاوہ سفر خرچ کے کسی نے دو سو لئے کسی نے چار سو۔ ایک صاحب تو کٹھرے بھی محتاج ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا سواگت اسٹیشن پر بڑے زور شور سے ہوا۔ گلے میں ہار پڑے۔ پھول نچھاور کئے گئے مزدور کی گاڑھی کمائی ٹھکانے لگی۔

چوپاٹی پر مشاعرہ ہونا قرار پایا۔ مزدور کے گھر اندھیرا تھا دیا دم نکل رہا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ننگے پھر رہے تھے یہاں آرائش میں تھان کے تھان خرچ کر دئیے گئے وہاں ٹکڑا کھانے کو نہ تھا۔ یہاں سگریٹ، سوڈا، لیمن کا دور تھا۔ اس کے پیروں میں جلوسوں کے ساتھ

ننگے پیر پھرتے پھرتے چھالے پڑ گئے تھے۔ یہاں مزدور نواز شعراء کے لئے موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ سامنے سے ایک جوگی اور جوگن گاتے ہوئے گزرے ؎ دنیا ایک تماشہ بابا دنیا ایک تماشا

مورکھ کے گھر فاقہ بابا مورکھ کے گھر فاقہ

ایک کمائے ایک لٹائے دنیا یہی کہلائے

مورکھ کے گھر فاقہ بابا مورکھ کے گھر فاقہ

چیتھڑے ملے بال بکھیرے یہ بھی مجمع میں مل گئے۔ اب منتظمین پریشان حال ادھر ادھر دوڑتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ ایک شاعر صاحب بگڑ گئے ہیں اور بیٹھے تمام جمع کے بڑے لیڈر کو بے نقط سنا رہے ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ اپنے ساتھ ایک پن چھلا لائے ہیں اور ان کے نام کے پچاس مزید چاہتے ہیں ورنہ مشاعرہ میں آنے سے قطعی انکار۔ چار سو کی رقم پہلے جیبوں میں جا چکے ہیں منتظمین کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ یا تو وہ رقم بھی آئی گئی سمجھیں یا پچاس اور بھینٹ چڑھائیں۔ یہ آوازیں جوگی جوگن کے کانوں تک پہنچیں۔ جوگی مسکرا دیا۔ جوگن نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

اب مشاعرہ شروع ہوا۔ کسی نے غزل پڑھی۔ کسی نے نظم۔ بعض نے گیت گائے۔ ایک مقبول ہوا۔ ایک مردود۔ سامعین نے کسی کو بٹھانے کا حکم صادر کیا۔ کسی کو پڑھوانے کا۔

ایک صاحب نے یہ گیت الاپا اور داد سخنوری لی۔

ہم پاپ کی دنیا بڑھا دیں گے۔

ایک اور بزرگ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے یزید شمر اور ابولہب کی شان میں قصیدہ پڑھ ڈالا۔ سامعین میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی صدر

اور منتظمین نے خموشی اور شانتی کے احکامات نافذ کیے وہ چار پتھر بھی اسٹیج تک پہونچے۔ مجمع قابو سے نکلا جاتا تھا۔ صدر نے کھڑے ہو کر سکون کی تلقین فرمائی۔ لیکن جذبات بھڑک چکے تھے "نکال دو" کی صدائیں بلند تھیں آخر سامعین میں سے ایک شخص اُٹھا۔ جناب صدر سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے دریافت کیا۔ کہ ان کی تقریر کا مدعا کیا ہوگا۔ جواب ملا۔ مجمع کو پرسکون بنانا۔ صدر کی اجازت سے یہ شخص اسٹیج پہ آیا۔

سامعین اس سے روشناس معلوم ہوتے تھے مائک کے پاس اس نے کہا۔

بھائیو! - اوّل تو میں جناب صدر کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ انھوں نے از راہ ذرہ نوازی اس کمترین کو اسٹیج پہ آنے کی اجازت عطا فرمائی۔ اور آپ سے دو دو باتیں کرنے کا موقع دیا۔ پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت جو شعرا صاحبان تشریف فرما ہیں ان کے سفر خرچ اور اس سے بہت زیادہ کی مزدور سبھا کفیل ہوئی ہے۔ ذرا اس کا خیال رہے۔ نیز ہر شخص کو اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے کا حق ہے۔ میں

فراہم نہیں ہوتا۔ بعینہ ہمارے معزز مہمانوں کو بھی اپنے بزرگوں کی تعریف کا حق ہے۔ انکے بزرگ ماشاء اللہ یزید اور ابوجہل ہیں۔

یہ الفاظ سن کر مجمع ہنسنے لگا اور سکون ہوگیا۔ لیکن شیطان پرست یزید نواز شاعر صاحب نے مزید کلام عطا فرمانے سے انکار کردیا۔ اور مشاعرہ سے نہایت برہم ایک باڈی گارڈ کے ہمراہ نکلے مجمع میں سے بھی کچھ اللہ کے بندے ان کی تواضع کو ساتھ ہولئے۔ سنا ہے راستہ میں داد بے داد ہوئی اور ان بزرگ نے مسجد میں پناہ لی ——— تیری شان تجھے بُرا کہنے والے بھی تیرے ہی دامن میں پناہ چاہتے ہیں۔ جل جلالہ۔

اب ایک اور صاحب نہایت معشوقانہ انداز سے کھڑے ہوئے۔ کئی کئی بل کھاتے مسکراتے کھنکارتے مائک تک آئے۔ مختصر سی تقریر کے بعد یہ بول الاپے۔

مزدور کے دم سے ہے سنسار۔ مزدور ہے سب کا اور پالن ہار

اس رب اور پالن ہار نے سنسار ہلا دیا۔ جلسہ قطعاً بے قابو ہوگیا۔ ٹوپیاں بھی اُچھلیں جوتیاں بھی۔ گھمسان گھا سا جو تم پیزار ہوئی محفل مشاعرہ کی اکھاڑا تھا۔ بھیم کا۔ مزدور کو رب کہنے والے بحال تباہ و جگر۔ ہڈی ہڈی چُور پا بدست دگرے دست بدست دگرے انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ ایک دوست کے گھر میں جا کر چھپے ——— جوگی جوگن نے بھی اپنی راہ لی۔ ایک کونے میں بند موٹر کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے ان کو آتا دیکھ دروازہ کھول دیا۔ اور یہ دونوں اس میں جا بیٹھے۔ کریم کی کوٹھی کے پچھلے دروازہ پر کار رکی اور یہ جوڑا کمرہ میں داخل ہوا۔ جب جوگ اُتارا یہ اپنے اصلی روپ میں نمودار ہوئے تو کم اور انجم نکلے۔

لڑکی ہسپتال سے اُٹھ ایک فلیٹ پر آن رہی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی مہر اب

کے ایجنٹ نہایت سراسیمہ پہنچے۔ کہنے لگے سارا کام بگڑا جاتا ہے۔ اب لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ لڑکی نے پوچھا کیا ہوا۔ انھوں نے رات کی تمام حالت بیان کی شعراء کو سخت سست کہا اور پھر یہ بتایا کہ ہمارے ایجنٹس کے علاوہ مزدوروں میں ایک اور لیڈر بھی ہے جو ہم سے الحاق نہیں رکھتا کل رات بھی اس نے ایک شاعر کو خفا کردیا۔ مزدور بہت کچھ اس کے کہے میں ہیں۔ لڑکی بولی تو پھر میں کیا کرسکتی ہوں۔ ایجنٹ نے جواب دیا وہ آپ کو بہت مانتا ہے۔ اگر آپ اسے اور اس کے ساتھیوں کو سمجھا دیں تو کام بن جائے نہیں تو یہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اور پھر آپ جانتی ہیں یہ سرمایہ دار مزدور کو پیس ڈالے گا۔ اتنا کہتے ہوئے ایک بڑی رقم کا چک میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے کنکھیوں سے دیکھا اور بولی یقیناً اس ٹھوکر سے مزدور کو بچانا ہمارا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لیے تن من دھن سے حاضر ہوں۔ مزدور کی حفاظت ہمارا کام ہے اور ہم اس کو غلط راستہ پر نہیں جانے دیں گے —— یہ جفاکش زمانہ بھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے۔ لیکن اس کی ذہنی کیفیت ایک بچہ کی سی ہوتی ہے ہم اس کے رہبر ہیں۔ ہم اس کی انگلی پکڑ کر اسے صحیح ڈگر پر چلائیں گے۔ مزدوروں کے اس لیڈر کا نام کیا ہے۔ ایجنٹ نے کہا رحیم بخش۔ انجم بولی اچھا تو آپ اس رحیم بخش اور اس کے ساتھیوں کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں ان سے بات کرلوں گی ایجنٹ خوش خوش سدھارا۔ شام کو چند مزدور رحیم بخش کی سرکردگی میں انجم سے ملنے آئے۔ یہ رحیم بخش وہی شخص تھا جس نے جلسہ کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ ہر ایک کو اپنے بزرگوں کی تعریف کا استحقاق ہے۔

ابوجہل ان کا بزرگ ہے۔ یہ اس کی ثنا خوانی کرتے ہیں۔

انجم کی یہ بہت تعظیم کرتا تھا۔ بمشکل تمام نہایت اصرار پر یہ کرسی کے ایک کنارے پر ہو بیٹھا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی سکڑ سمٹ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انجم۔ آپ کے لئے چاء منگواؤں۔

رحیم بخش۔ جی نہیں۔

انجم۔ کچھ سوڈا لیمن۔

رحیم بخش۔ مہربانی ہم کو پیاس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ ہم زیادہ دیر تکلیف دینا نہیں چاہتے۔

انجم۔ میری فکر نہ کیجئے میری تو انتہائی تمنا ہے کہ مزدور جاتی کی خدمت کرتے ہوئے مر جاؤں۔ سنا ہے اس روز مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔

رحیم بخش۔ جی ہاں ان میں سے بعض نے کفر بکنا شروع کر دیا تھا جس کے سننے کی ہم تاب نہ لا سکے۔

انجم۔ خدا معلوم یہ کیا وبا پھیلی ہے۔ یقین جانئے ان میں سے نوّے فی صدی محض فیشن کی خاطر یہ بکواس کرتے ہیں۔ ورنہ بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہر کھٹکا تیرا۔ علاوہ بریں میری رائے میں خدا کے خلاف کچھ کہنا انتہائی بے وقوفی بھی ہے اور بد تمیزی بھی بے وقوفی تو اس لئے کہ جب ایک چیز کا تم وجود ہی نہیں مانتے تو خواہ مخواہ اس کے خلاف الفاظ ضائع کرنا چہ معنی دارد۔ اور بد تمیزی اس لئے کہ جب ایک شخص دوسرے کے باپ کو اس کے روبرو برا نہیں کہے گا اس لئے کہ ہر شخص کو اپنا باپ عزیز ہوتا ہے تو ایک تمیز دار انسان ایسا کیونکہ

کر سکتا ہے یہ خدا پرست کے روبرو ــــــــــــ خدا کو بُرا کہے۔ کیونکہ ہم کو زیادہ سے زیادہ جو ہستی عزیز ہوسکتی ہے وہ ذات پاک ہے۔ سنا ہے آپ اس روز پیش پیش تھے۔

رحیم بخش۔ (آنکھیں نیچی کرکے) کیا عرض کروں۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔

انجم۔ خدا ہر مسلمان کو یہی توفیق عطا فرمائے۔ جزاک اللہ (انجم نے ذرا سے توقف کے بعد پھر کہا۔)

سنا ہے اسٹرائک کھلتی معلوم ہوتی ہے۔ مزدور اُکتا گئے ہیں۔

رحیم بخش۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔

انجم۔ فرمائیے۔

رحیم بخش۔ آپ کے قدموں پر میری جان نثار مزدور تو پیچھے ہٹنے والا نہیں، کچھ لیڈرز کا رویہ مشتبہ کن ہے۔

انجم۔ میں سمجھی نہیں۔

رحیم بخش۔ آپ کو زیادہ بات کرنے سے تکان تو نہیں ہوگی۔

انجم۔ ہرگز نہیں آپ کہے جائیے میں تمام حالات سے واقف ہونا چاہتی ہوں۔

رحیم بخش۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مزدوروں کو چھ آٹھ آنہ روز تقسیم کئے جارہے ہیں۔ صاحب ہم فقیر نہیں جو خیرات پر گذر کریں پھر سوال یہ ہے کہ یہ رقم آتی کہاں سے ہے۔ دو ہزار ہم لوگوں نے آپس میں جمع کیا تھا دو ہزار مزدور سبھا سے ملا۔ اور اب تک خرچ ہوچکا ہے دس بارہ ہزار سے

بھی زائد۔ جب یہ سوال اٹھایا تو لیڈرز بغلیں جھانکنے لگے۔ اور آپس میں مشاورہ کرکے بس اتنا جواب دیا کہ ایک ہمدرد ہماری مدد کر رہا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ سہراب کی مل اور ہماری مل میں پرانی رقابت ہے۔ پہلے تو ہم کو شبہ ہوا۔ پھر ہم نے اپنے آدمی چھوڑے تو یہ چیز ثابت ہوئی کہ سہراب کے روپیہ سے اسٹرائک چلائی جا رہی ہے

رحیم بخش نے اتنا کہنے کے بعد اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور کہا تم بتاؤ تم نے کیا دیکھا

ساتھی۔ جی میں اور رامو صبح سے اصغر علی کے گھر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ ہم کو پہچانتا نہیں۔ سو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک موٹر اس کے دروازہ پر رکی اور اس میں سے ایک آدمی اتر اندر چلا گیا۔ ہم نے بھی اتنی دیر میں ایک ٹیکسی بلا گلی کے موڑ پر کھڑی کر لی۔ وہ آدمی تو باہر نکلا اور رسو ٹیکسی میں بیٹھ اس کے پیچھے ہو لیا اور میں اپنی ڈیوٹی پر کھڑا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد اصغر علی نکلا میں ساتھ ساتھ آخر وہ بینک جا پہنچا میں بھی برابر جا کھڑا ہوا اس نے چیک دیا۔ مجھے تھوڑی سی انگریزی کی حرف شناسی ہے۔ میں نے پڑھ لیا۔ سہراب جی کے دستخط تھے۔

انجم۔ تم اتنا پڑھنا جانتے ہو

ساتھی۔ جی ہاں۔

انجم۔ معاف کیجئے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے میں ہر بات کی پوری طرح تصدیق کر لوں۔

یہ کہتے ہوئے انجم نے پرس میں سے چیک نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور

بیان دینے والے سے دریافت کیا کہ یہ دستخط کس کے ہیں۔ اس نے فوراً کہدیا
سر سہراب سے۔ اب رحیم بخش کے چہرہ پر ایک سایہ سا آیا۔ انجم تاڑی بولی
انجم۔ آپ اصحاب میرے بھائی ہیں۔ بہن کا اعتبار کیجئے۔
رحیم بخش نے شرمندہ ہوکر نظریں جھکالیں۔
انجم۔ اچھا تو پھر کیا ہوا۔
ساکھی۔ (رحیم بخش سے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت لیکر) اب اصغر علی بھی بینک سے روپیہ لے ہل آگیا ہیں اس کے پیچھے پیچھے رہو مجھ سے پہلے پہنچا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ موٹر واپس سر سہراب جی کے بنگلہ پر گئی اور وہ آدمی وہاں اترا۔
انجم۔ اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ اس روز مشاعرہ میں جو جھگڑا ہوا اس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے۔
ساکھی۔ جی ہاں۔
انجم۔ لیکن شاعر نے تو مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے تھے۔ ہندو کیوں بگڑ گئے۔
ساکھی۔ بات یہ ہے کہ اگر کوئی میرے باپ کو برا کہے تو رحیم بخش اس سے لڑے گا۔ اور جو کوئی رحیم بخش کے باپ کو ایسا ویسا کلمہ نکالے تو میں بھی اس سے نبٹوں گا۔ سو رحیم بخش کے خدا کی شان میں اُس نے ایسی ویسی بات کہی تو مجھے بُری لگنی ہی تھی۔ اور پھر خدا تو سب کا ایک ہی ہے۔ اُسے کسی نام سے بھی پکارلو۔
انجم۔ جزاک اللہ، یہی جذبہ ہندوستان کو ترقی کے راستہ پر لیجائیگا۔

یقین جانئے میں آپ کو بھائی سمجھتی ہوں اور یہ بہن ساتھ چھوڑنے والی نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ سے اچھی خاصی جرح کی۔ لیکن میں سارے پہلو پوری طرح سمجھ کر اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔ دنیا میں آدمی کچھ لیتا ہے تو کچھ دیتا بھی ہے۔ میرے پاس آپ نے سر سہراب کا چیک دیکھا ہے اور یقیناً آپ کے دل میں مختلف قسم کے خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ پہلے اجازت دیجئے کہ میں ساری داستان شروع سے اب تک آپ کو سنا دوں۔ پھر آپ کو حق ہو گا کہ مجھ سے سوالات کر کے اپنا اطمینان کر لیں اور اس کے بعد اگر آپ کی خوشی ہو تو مجھے اپنا شریک کار کریں ورنہ نہیں۔

رحیم بخش۔ ہم کو بغیر سنے آپ پر اعتبار ہے۔

انجم۔ آپ کی مہربانی تاہم میں اپنے اطمینان خاطر کے لیے چاہتی ہوں کہ من وعن آپ کو سنا دوں۔

اس کے بعد انجم نے شروع سے آخر تک بے کم و کاست ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ اور مزدوروں سے سوالات کرنے کی درخواست کی

رحیم بخش۔ آپ نے اپنے اطمینان کے لیے یہ سب کچھ سنایا۔ ہم حکماً سنتے رہے ہم کو سننے سے پہلے بھی آپ پر اعتماد تھا۔ اور اب بھی ہے۔ مزدور کا بھروسہ نمک کی دیوار نہیں جو چھینٹوں سے بہہ جائے۔ ہم صرف حکم کے منتظر ہیں آپ جو فرمائیں گی اس پر عمل کیا جائے گا

انجم۔ معاملات نے بالکل نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ذرا مجھے سوچ لینے دیجئے۔

انجم تھوڑی دیر کمرہ میں ٹہلتی رہی اور مزدور ساکت و جامد پتھر کی مورتیاں سب بنے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اس نے کھڑے کھڑے ان سے کہنا شروع کیا۔

انجم۔ میں اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ اس میں جہاں آپ کو اختلاف ہو بلا تکلف فرما دیجئے گا۔ میں سر سہراب اور اُن کے تمام تنخواہ دار ایجنٹس کو اپنے ہاں بُلاتی ہوں۔ آپ مزدوروں کے کچھ اور نمائندے لے کر پہلے سے آجایئے۔ اور دوسرے کمرے میں سے ہماری تمام باتیں سن لیجئے۔ اس طرح یہ پورا کا پورا جتھا بھی سامنے آجائے گا۔ اور ان کے ارادے بھی معلوم ہو جائیں گے۔ ساری پول کھل جائے گی۔ مزدور اس پر راضی ہو گئے لڑکی نے سر سہراب کو ٹیلیفون کیا۔ اور شام کے چار بجے کا وقت مقرر کر لیا مزدورں کو یہ ہدایت کر کے کہ اس کا ذکر زبان پر نہ آنے پائے رخصت کر دیا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ دوسروں کو کسی بہانہ سے ساتھ لے آنا۔ یہاں لا کر معاملہ بتانا خود اٹکے کے پاس جا کر سارا معاملہ کہہ سنایا۔ وہ کچھ پریشان خاطر سا معلوم ہوا۔

انجم۔ کیا یہ تدبیر غلط ہے۔

کریم۔ خدا کی قسم کارڈنل رشلو بھی اس پر ناز کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان جھگڑوں میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ اور اتفاق سے آپ مجھے اس مل اور اس کے تمام معاملات سے زیادہ عزیز ہیں۔

انجم۔ اور مجھے آپ کا وقار اور مزدور کی فلاح دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز۔ نیز سچائی کے راستہ میں کھونا بھی پانا ہے۔ نیت بخیر ہے تو بیڑا پار ہے۔ اب تو بیڑا اٹھا لیا۔

کریم۔ ماشاء اللہ یہ دلی کی زبان ہے۔ دلی کی کائنات زیر و زبر ہو گئی۔

غرضکہ تین بجے مزدور آ گئے۔ لڑکی نے سب کچھ سمجھا دیا اور دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ لڑکا ریوالور میں گولیاں بھر بند موٹر میں گھر کے آگے آن جما۔ چار بجے سر سہراب وارد ہوئے۔ اور ان کے سارے چیلے چانٹے۔ انجم نے باتوں کا ایسا عنوان ڈالا کہ ساری داستان اور سازش سامنے آ گئی۔ آگے کیا کرنا ہے۔ یہ بھی کھل گیا مطلب کیا ہے۔ اس کا بھی اظہار ہو گیا۔ اب انجم نے چائے بنانی شروع کی اور سب نے پیالیاں ہاتھ میں اٹھائیں۔

انجم سے۔ میں بھولی ابھی کچھ اور بھی مہمان آنے ہیں اور یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کے دروازہ کی طرف بڑھی۔ پردہ ہٹا دیا۔ وہاں سے آگے آگے رحیم بخش ڈنڈا اور دست اور پیچھے سارے مزدور برآمد ہوئے۔ اب نہ پوچھو کسی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹی۔ کوئی کرسی سے ٹکراتا ہوا بھاگا۔ ایک کو گرم گرم چائے کا اچھو ہوا۔ سر سہراب میز سے ٹکرائے۔ غرضکہ تو مجھ پہ اور میں تجھ پہ۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔

لڑکا ریوالور ہاتھ میں لئے دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جب انکو بہ ایں حالت نکلتے دیکھا تو موٹر کا دروازہ کھول باہر آنے ہی کو تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا اور ڈرائیور کو کہا کہ جا کر بلڈنگ میں دیکھے کچھ جھگڑا فساد تو نہیں ہو رہا۔

آخر کار تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پا گئے۔ غدار ذلیل و خوار ہو کر نکلے۔ اسٹرائک کھل گئی۔ مزدوروں کے جائز مطالبات منظور کئے گئے۔ بڑا

شاندار جلسہ ہوا۔ کریم زندہ باد انجم زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔

گذشتہ واقعات کی کشاکش نے انجم کے اعصاب پر سخت اثر کیا تھا۔ کریم نے سامان سفر تیار کر لیا۔ انجم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ایک روز سیٹس رزرو کروا انجم کے پاس جا پہنچا اور نادر شاہی حکم داغ دیا کہ دو گھنٹہ کے اندر مسوری چلنا ہے وہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ بولی۔ چہ خوش چرا نہ باشد۔ بندی تو اب دلی جائیگی۔ کریم نے کہا میں نے سیٹس بک کرالی ہیں۔ جواب ملا کینسل کر دیجئے۔ وہ بولا سیوائے میں کمروں کا انتظام ہو گیا ہے۔ فرمایا ہم کیا کریں ہم سے پوچھ کر کیا تھا۔ ادھر سے دلیل پیش کی گئی کہ صحت کے لئے پہاڑ کی آب و ہوا اور آرام ضروری ہے ادھر سے تردید ہوئی کہ امیروں کے چونچلے ہیں۔ جب کوئی تدبیر نہ چلی تو لڑکا کمرہ میں ٹہلنے لگا اور پھر بولا آپ کی خوشی۔ میرا کیا ہے میں تو چاہتا تھا کہ کچھ دن وہاں رہ کر آپ مجھ سے تقریر کے چند گر سیکھ لیتیں۔ بہرکیف آپ کی مرضی میں ریلوے اسٹیشن ٹیلیفون کر کے رزرویشن کینسل کئے دیتا ہوں۔ اب کریم تو چلا ٹیلیفون کی طرف اور انجم بولی ذرا ٹھیرئیے۔ یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں کہی تھی۔ آخر کار دونوں مسوری جا براجے۔

میں سنیما سے واپس آیا "بکھار بگڑ گیا ہے۔ بگھار بگڑ گیا ہے۔" یہ فقرہ مسلسل میرے دل و دماغ پر ہتوڑے سے بجا رہا تھا۔ سونے کو تو سو گیا لیکن تمام رات خواب ہائے پریشاں دیکھتا رہا۔ صبح اٹھا تو دل مضطرب تھا۔ کوٹھے پر چڑھ گیا۔ آنکھیں دل کی طرح اس طرف کھنچی جاتی تھیں دیکھا تو ان کی نانی جانماز بچھائے بیٹھی گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگ رہی ہیں۔ سینہ میں ایک دھکا سا لگا اور میں ٹہلتا

ٹہلتا اُن کے گھر کے سامنے جا پہنچا۔ وہاں شہر خموشاں کا سا سکوت تھا۔ اور جس طرح پرانے گورستان میں گیدڑوں کی آواز آتی ہے۔ یہاں سے کمّو چڑیے کی بھیانک کھانسی کی آواز آتی تھی۔ میں تھوڑی دیر وہاں اس طرح پھرتا رہا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی رُوح پھرے۔ اتنے میں سامنے سے سیتا آنکلا۔ اور اس نے نکیرین کے سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ کیوں استاد شام کو کہاں تھے۔ یہاں کیسے چکّر لگا رہے ہو یہ چہرہ پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔ میں اس وقت ایک سوال کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ اس نے پے در پے تین داغ دیئے۔ میں چکرا سا گیا اور کچھ جواب بن نہ پڑا۔ میں نے کہا کل ان کی بیری میں گڈّی اٹک گئی تھی۔ اسے چھڑانے آیا تھا۔ وہ بولا۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں ابھی چھڑائے لاتا ہوں۔ میں نے کہا شامت آئی ہے بڑھیا لتّے لے ڈالے گی۔ مسیتا بھی ایک چھلّو تھا۔ بولا بڑی آئی لتّے لینے والا۔ ہم کوئی اپنی گڈّی چھوڑ دیں گے۔ قسم خدا کی جو آنکھ بھر کر بھی دیکھے تو رات کو اِتنے فقرے برساؤں جو یاد کرے۔ میرے منہ سے نکل گیا کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جانے بھی دے۔ ایک پیسہ کی پتنگ کے لئے قصہ پھیلانا۔ لیکن وہ ایک پتنگا تھا بھڑک کر اُدھر چلا۔ میں نے کہا بات تو سن۔ بولا۔ کیا ہے۔ میں نے کہا اُن کے گھر میں کوئی بیمار ہے ایسے میں کسی کو ستانا اچھا نہیں۔ دُور سے ہی بولا۔ وہ بڑھیا مر رہی ہوگی تو اچھا ہے۔ ذرا جلدی دم نکل جائے گا۔ یہ کہتا ہوا اُن کی ڈیوڑھی میں بے دھڑک گھس گیا۔ اندر سے چیخ پکار کی آوازیں آئیں اور مسیتا بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ میں ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ برابر سے یہ کہتا ہوا گذرا۔ بھگوڑا کہیں کا بھاگ گیا نہ ساتھ چھوڑ کر۔ میں برابر سے بولا ہم تو پہلے

ہی منع کر رہے تھے تو گیا ہی کیوں۔ کہنے لگا مہ تیری بڑی ڈور سے نکل اٹک رہی تھی نہ۔ جو جوٹا کہیں کا اور اس بڑھیا کی تو طبیعت میں رات کو ہی ٹھکانے لگا دوں گا۔ اس رنڈی نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں نے کہا۔ بڑھیا تو مر رہی تھی۔ بولا جی وہ کیا مر ہے۔ حرامزادے کی رسّی دراز۔ وہ تو قیامت کے دن بوریہ سمیٹے گی۔ اور پھر اس کی تو میرے ہاتھ سے بدی ہے۔ آج رات کو تماشہ دیکھیو۔ میں نے کہا تو پھر بیمار کون ہے۔ کہنے لگا وہ اس کی نواسی مر رہی ہے۔ چپاتی سی چرپائی پر پڑی تھی۔ میرا بھی نام سیتا بھٹیارہ نہیں جو اس مرتی ہی کو نہ مارا۔

میں اور سیتا گلی میں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے۔ جو سامنے سے وہی حکیم صاحب آتے نظر آئے۔ جنھوں نے میرا علاج کیا تھا۔ اور جانی بوا کے ہاں آنے جانے والے شیخ جی اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔ میں نے سیتا کو تو اس کی دکان پر چھوڑا اور لگا گلی کے چکر لگانے۔ پھرتے پھرتے آندھ آگئی۔ حکیم صاحب کسی عنوان گھر سے برآمد ہی نہیں ہوتے۔ میں نے کہا یا اللہ! یہ ہمارے ہاں تو کبھی پانچ منٹ بھی نہیں ٹکے۔ یہاں ایسی کونسی بات ہے جو چپک کر رہ گئے۔ سوچا مریض کی حالت زیادہ خراب ہوگی۔ پھر خیال آیا کہ حالت تو ہماری بھی بہت بہت خراب ہوئی۔ لیکن ان حضرت نے کبھی حقیقت بھی کان دھر کر نہیں سنی۔ غرضکہ خدا خدا کر کے کوئی پون گھنٹہ کے بعد حکیم صاحب قبلہ باہر آئے۔ جانی بوا اور شیخ جی ساتھ تھے۔ ڈرائیور کو دو روپیہ دئے گئے۔ حکیم صاحب نے واپس کرا دئے۔ ہم پر تو یہ کرم کبھی نہ کیا تھا۔ شاید انھیں غریب سمجھ کر روپیہ لینے مناسب نہ سمجھے ہوں۔

اب مجھے اس خیال نے گھیرا کہ یہ سیتا کا بچہ رات کو ان غریبوں کو ستائے گا۔ ان کی بھی نیند حرام ہو گی۔ خون کھولے گا سو الگ۔ بیماری کی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ شام تک سوچ کر یہ تدبیر نکالی کہ اس بھتنے کو سینما دکھا کر رام کرو۔ رات گئے گھر آئے گا۔ بات آئی گئی ہو جائے گی ——

میں نے ایسا ہی کیا۔ پر وہاں بھی وہ ظالم تلملاتا ہی رہا۔ انٹرول میں کہنے لگا ہم گھر جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا وجہ۔ بولا ہاتھ کھجلا رہا ہے۔ رنڈی کی ٹانٹ پر فنتر برساؤں گا۔ بڑی مشکل سے روکا۔ لیکن اُس پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ گھڑی گھڑی پھنکارے مارے۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ یوں نہیں ٹلے گا تو مجبور ہو کر سارا حال سنایا۔ اور اس سے مدد چاہی۔ وہ پہلے تو بہت بگڑا اسنورا۔ اب توڑی ہم سے کالی کو چھپایا۔ تم نے غیریت برتی۔ اب تم جانو تمہارا کام۔ آخر میری خوشامد درآمد پر راضی سا ہو گیا۔ اس کے علاوہ میں نے جامع مسجد کے چڑیا کے کواب ٹکیاں۔ سیخ کے کواب خوب کھلائے۔ اوپر سے فالودہ کا ایک گلاس پلوایا۔ اب تو یار شیشہ میں اُتر آیا۔ تیرے لئے جان لوڑی حاضر ہے۔ کل آج کے بعد سے ہم سے پردہ نہ رکھیو۔ اب پان کا بیڑا نما سگرٹ سُلگا نہایت فلسفیانہ رندانہ میں اُس نے اپنی ٹانٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اور بولا۔ وئی سمجھ میں آ گئی۔ لا قورمہ کا ہاتھ۔ قربان جاؤں استاد کے۔ نوتوڑے ہادن رتی کی ٹانگم ٹوک۔ میں نے کہا منہ سے تو پھوٹ۔ یا خود ہی مزے لے جائے گا۔ بولا منہ میٹھا کراؤ۔ پھر بتاؤں گا۔ میں نے نعمت حلوائی کے ہاں سے پاؤ بھر امرتیاں لیکر دیں۔ اور کہا اب تو بول —— جناب نے ایک ایک امرتی کھائی شروع کی اور یوں

گویا ہوئے ـــــ سن بے اُن کے گھر میں کمّو چرسیا رہتا ہے۔ یار خاں اُس کو گانٹھ لیں گے۔ پھر آر جار شروع ہو ہی جائے گی۔ جب گھر میں گھس گئے تو فر تم جانتے ہی ہو۔ بُل یار کیا بتاؤں تیری ساس سمجھ کر چھوڑ دیا۔ نہیں تو قسم ہے ساڑھے سرلے آسنے کی۔ آج بڑھیا کا قیمہ قیمہ کر ڈالتا۔ بس دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ میں نے اس پاس داری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ کمّو سے کب تک بات چیت کیجائیگی۔ بولا بس تو فکر مت کر۔ اب یار خاں خود نمٹ لیں گے۔ کل سویرے سویرے ہی ہم ڈھیلی پاؤ لے کا چرس لے اس کی کوٹھری میں جا دھمکیں گے۔ اِتنے میں تو وہ اپنے باوا کا کفن اور میّا کا دُپٹّہ بیچ ڈالے۔

سیتا بھی ایک جا یا تھا۔ کمّو سے یارانہ گانٹھ دانت کاٹی روٹی کرلی۔ ہماری آر جار بھی شروع ہوگئی۔ اس چرسیہ کی کوٹھی ڈیوڑھی کے پاس تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اچھے گھر کا بچہ تھا۔ جانی بوا کے پیچھے برباد ہوگیا۔ یہ گھر اسی نے بنوا کر دیا تھا۔ اب دہاڑے کو پہنچ گیا کہ دروازے پر از کار رفتہ کتّے کی طرح پڑا ہے کسی نے ٹکڑا ڈال دیا تو کھا لیا۔ نہیں تو اب فاقوں کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ سچ ہے انسان سا سخت نہ انسان سا نرم۔ یہ نرم گرم دونوں برداشت کر سکتا ہے۔ وہی بہادر شاہ جو شامی کبابوں کا عرق چوس کر پھوک تھوک دیا کرتے تھے زناں کے ہاتھوں لہسن کی چٹنی اور باسی بیسنی روٹی کھاتے نظر آئے۔

بسے صورت بگردید است عالم   ازیں صورت بگردد عاقبت ہم
فریدوں را سر آمد پادشاہی   سلیماں را برفت از دست خاتم

رہے نام سائیں کا میں کہہ کر اُٹھا۔ یہ پہلی دفعہ تھی جو میں شاہ بُرے گبا اور بغیر دم

لگائے چلاگیا اور اتنی دیر بوا وحیدن نے بھی چلم کو منھ نہ لگایا۔ مجھے تو داستانِ پارینہ کا نشہ شراب کہنہ سے کم نہ تھا وہ اس کے بھبکوں ہی سے سیر ہوئی جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک صاحب کی بابت سنا تھا کہ شاہ بڑے جاتے پیتے پلاتے کچھ نہ تھے۔ جو اُن سے پوچھو تو کہہ دیتے تھے۔ ہمارے تو یہاں کی خوشبوؤں ہی سے نشے پانی ہو جاتے ہیں۔

میں گھر پہنچا تو رات کے دو بجے تھے۔ بیوی پریشان بیٹھی ڈیوڑھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ روتے روتے آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ بچّوں کو روٹی ووٹی کھلا کر سُلا دیا تھا۔ اپنے دل کا اللہ ہی مالک تھا۔ اس نیک بخت نے کسی سے سُن لیا تھا کہ دم لگانے میں اکثر چرسیوں کا دم نکل جاتا ہے۔ جب سے میں جتنی دیر باہر رہتا اس کے دم پر بنی رہتی۔ مجھے دیکھ کر دم میں دم آیا۔ چہرے پر نشہ کے آثار نہیں پائے تو خود بھی کھِل گئی۔ آج اس کا میاں شاہ بڑے گیا اور پی کر نہیں آیا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر چہرہ جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ میرے بھی احساسات تیز ہو رہے تھے۔ اس کے چہرہ کے ہر اتار چڑھاؤ کا لطف لے رہا تھا۔ اس کی دلکشی مجھے مسرور کر رہی تھی۔ آج میرے گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی۔ سچ ہے گھر والی خوش ہو تو گھر مسکراتا نظر آتا ہے۔ اور اگر وہ افسردہ ہو تو در و دیوار محوِ بکا ہوتے ہیں ——— چرس نے نہ صرف مجھ کو سوختہ کر دیا تھا۔ بلکہ میری زندگی کے ہر شعبہ کو جھلس کر رکھ دیا تھا میرے گھر پر افسردگی کا دھواں سا چھایا رہتا تھا۔ آج وہی گھر بدلا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ در و دیوار وہی تھے۔ لیکن فضا کچھ اور۔ ایک غبار سا اُٹھ گیا تھا۔ ایک بادل سا چھوٹ گیا تھا۔

آج رات کو میں نے ماں کو خواب میں دیکھا۔ سر سے پاؤں تک دوپٹہ لپیٹے جانماز پر بیٹھی ہیں۔ بالکل اسی شکل میں جس طرح میری بیماری میں دعا مانگ رہی تھیں والله تیرا شکر ہے تو نے مجھ گناہگار کی سن لی ——— دوسرے روز دوپہر کا کھانا کھا میں پھر جانے کو تیار ہوا۔ بیوی سمجھ گئی۔ منہ سے کچھ نہ بولی بڑی جانب ملتجی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں۔ اب کیوں جاتے ہو؟

ایک بھٹکے ہوئے کو بچانے ——— یہ کہتا ہوا میں گھر سے نکلا۔

عام طور پر شاہ بڑے کے قریب پہنچ کر میں بار بار ادھر اُدھر دیکھا کرتا تھا کہ کوئی جان پہچان والا تو مجھے وہاں جاتے نہیں دیکھ رہا لیکن آج میں بے محابہ چلا جا رہا تھا ——— دل میں چور نہ تھا۔

اول تو میں اکثر و بیشتر ایسے وقت جاتا جب وہاں چھیڑ ہوتی تھی۔ کوئی اکا دکا بھولا بھٹکا آ گیا آ گیا۔ دوسرے اپنی دھن میں ہوتا کسی کی طرف دھیان ہی نہ کرتا تھا ——— جاتے ہوئے تو طلب کی شدت آنکھوں پر پردہ ڈالے رکھتی تھی۔ جب طلب بجھتی تو اپنا ہوش نہ رہتا۔ دوسروں کو کون دیکھتا۔

آج جو میں پہنچا تو شاہ بڑا اپنے پورے شباب پر تھا۔ اور میری بھی آنکھیں کھلی ہوئی ——— بوا نے مجھے دور سے دیکھا۔ اور ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ میں وہاں جا بیٹھا۔ یہ جگہ سب سے الگ تھی اور ایک جھاڑی کی آڑ میں تھا وہاں سے بیٹھا بیٹھا میں ان تریاقیوں۔ دودفوروں اور سبزہ گھوڑے کے سواروں کا رنگ دیکھتا رہا۔

ایک طرف سے آواز آئی

مارا جو دم چلم میں شرارہ نکل پڑے — اک برجِ آتشیں سے ستارہ نکل پڑے

لگے دم۔ مٹے غم۔

ایک نے بوا کی طرف روپیہ پھینکتے ہوئے کہا۔ خیر ہو خیر ہو۔ پلائے جا

چٹ ڈال مال دھن کو کوڑی نہ رکھ کفن کو
جس نے دیا ہے تن کو دے گا وہی کفن کو

گر یار ہے تو عاشق ——— دھن دھن مست قلندر

ایک صاحب بولے ابے یار یہ ذرا شیر کے کان تو پکڑ ——— یہ بزرگ بھنگ چھان رہے تھے اور ساتھی سے صافی پکڑوانے کی خواہش تھی۔

دوسرا بولا۔ بن چھٹی دے دے تیری خیر رہے۔

تیسرے نے کہا ایسی ہو جیسی ——— ہو جائے۔ تیرا بول بالا رہے جا یہ لال حویلی تیرے حوالہ کی۔ آخری فقرہ کہتے ہوئے شاہجہاں کے لال قلعہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

ایک اور نے ارشاد کیا۔ تیرا گھر ہولی چاندی سونے سے بھر دے۔ اوصنا ڈال کے گھونٹیو۔ نہیں تو یاروں کو نہیں چڑھے گی۔

ایک مست الست کونڈی سونٹے کو بجا کر للکارا۔

کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ تو قدرت کے کھیل
چھوڑ یہ دھندوں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

ہر دلی ہرا ہے۔ ہرا ہی ہرا ہے۔

ایک جانب سے آواز آئی بر بر پڑی چھم سونے کی تری چھاچھم

ایک صاحب افیون کا گھولوا بناتے بناتے بولے۔

پلا ساقیا مالوے کی نسیم کہ ہے شوقِ گلگشتِ باغِ نعیم

چینیا جان پہ قربان ذرا تھوڑی اِدھر بھی۔

ایک صاحب نبکارے ——— میرا نام ہے چرسیا جادوگر۔ اب ذرا ادھر دیکھو یہ چلم میں سے پری نکلتی ہے ——— اتنا کہہ کر جو ظالم نے دم لگایا تو ایک ہاتھ کی لَو نکالی۔ بولا——— شعلہ رو شعلہ رو شعلہ رو ——— اور یہی کہتے کہتے غیبی ہو گیا۔

ایک تریاقی بیٹھے بیٹھے افیون کا سانپ بنا رہے تھے۔ ذرا ذرا سا ہٹکتے جاتے اور کہتے جاتے تھے۔

درویش بلا نوش بلا چٹ ہیں میاں دوست پینک میں جو آئیں
افعی کو مل کر کریں افیون کا گھولا ہیں ایسے ہی آفت

سامنے سے ایک بھنگڑ نے بانگ لگائی۔

مستانہ جو میں نے قدحِ بھنگ چڑھایا در عالمِ وحشت
تب خضر پکارا کہ ہنسیاً مَرِیاً اب دیکھ حلاوت
ہے جی میں فقیروں کی طرح کھینچ لنگوٹا اور باندھ کے تہمت
جا کنجِ خرابات میں ٹک گھوٹیے سبزہ یوں کیجے عبادت

آج میں اس خرابات کو عریاں آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں اِم تزویر نہ ٹھکار دیا کاری ظاہر داری نہ تھی ——— چلم کی آنچ کھوٹ پھونک دیتی ——— سرخی کا پیالہ رنگ آمیزی مٹا دیتا۔ جو دل میں ہوتا زبان جانتی

— افیون کے دلدادہ زہر کھاتے زہر اُگلتے نہ تھے

بوگ میں بھر بھر کر دے رہی تھیں لیکن آج خود دم نہیں لگا رہی تھیں ایک دو کے استفسار کا تو انھوں نے جواب ہی نہیں دیا۔ لیکن جب سب نے باصرار کہا تو اتنا کہہ دیا۔ آج میرے سینہ میں کسک ہے۔

کچھ چرس کا دھواں بھنگ کی رنگت ضبط کا خمار ان سب چیزوں نے مل کر مجھے مدہوش سا کر دیا اور میں خدا معلوم کب تک جھاڑی کے پیچھے بیٹھا رہا۔ اتنا جانتا ہوں کہ زوال آفتاب شروع ہو چکا تھا۔ جو لُو میرے پاس آئیں۔ مجھے اپنی استقامت پہ ناز تھا کہ اب تک ایک دم نہیں لگایا۔ لیکن یہ شمع خرابات پھر پھر کر سب کو بلادی تھی لیکن خود منہ نہیں لگا رہی تھی دب کی بات یہ تھی۔

یہ میرے پاس خوش آئن بیٹھیں جیسے پرانا شرابی کلال کے پہلو میں خود بچنے کا خیال اتنا رفعت بخش نہ تھا جتنا کسی دوسرے کو ترسانے کا احساس ارفع کن ثابت ہوا۔

میں نے کہا ہوا کیا سناؤں داستان غم ہے اور وہ بھی طولانی۔ وہ رئیس چرس کا دم جتنا طویل ہو اتنا ہی نشہ دیرپا کرتا ہے۔ کہ ال میں آئی کہ ابھی برائے وعدہ لے لوں کہ میری سننے کے بیدا ای منانی ہوگی۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی اور میں نے یوں شروع کیا مستانی کی بدولت کی سے پونگ ہو گئے۔ کچھ ہم بھی اس کے معمولی میں گھس گئے۔ جیسے لیری چیز سے اہم اخراجات یا سندان کی تھی۔

اماں ابا جو ہاتھ اُٹھا کر دیتے۔ بس وہی ملتا تھا پر اب ہم مدرسہ میں داخل کر دیئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ شروع میں تو ابا نے خود پڑھایا پھر ماسٹر رکھا دیا۔ جب ہم نے اردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھ لیں تو پنج کا امتحان دلوا ابا نے ساتویں میں داخل کر دیا۔ اب کاپی پنسل کتاب چندہ یہ مدیں اور کھل گئیں اور ہم اماں ابا سے اچھی خاصی رقم موسنے لگے۔ پھر چار پیسہ روز مدرسہ میں سودا کھانے کو ملتے۔ یہاں سودا ہی اور تھا۔ کوڑی کوڑی ممو کی نذر ہو جاتی۔ دوسری طرف میتھا جونک کی طرح لپٹا ہوا تھا—— خیر کچھ بھی ہو ان کے گھر تک رسائی تو نصیب ہوئی۔ اب گھڑی گھڑی پل پل کی خیریت معلوم ہونے لگی۔

کچھ حکیم صاحب نے لگ کر علاج کیا۔ پرہیز کڑا کرایا گیا۔ مریض کو ہر وقت نظروں میں رکھا۔ مرض سمجھ میں آ ہی گیا تھا۔ خدا نے افاقہ دیا۔ طبیعت آہستہ آہستہ سنبھل گئی ——— ممو کا زمانہ مرض کا زور ٹوٹنا تھا کہ لڑکی اُبھرنے لگی۔ اب حکیم صاحب نے خود آنا بند کر دیا۔ مریضہ دوسرے تیسرے روز ڈولی میں بیٹھکر جاتی۔ نبض دکھا آتی۔ کیفیت سُنا آتی۔ گاہ گاہ معالج نسخہ میں کچھ گھٹا بڑھا بھی دیتے۔ ورنہ اکثر ہدایت ہو جاتی کہ یہی پیئے جاؤ۔

ہم بھی اکثر و بیشتر ڈولی کے ساتھ ساتھ ذرا فاصلہ پر لگے چلے جاتے کبھی اسکول سے غیر حاضر ہوتے۔ کبھی جھوٹی سچی عرضی دے دیتے۔ ان کی نانی ساتھ جاتی تھیں۔ ایک روز ڈولی بجائے مطب کے کمرہ کے دروازہ پر لگائی گئی۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا —— لیکن بندگی و بیچارگی۔ کر کیا سکتے تھے۔ تاہم اتنا اطمینان تھا کہ نانی ساتھ ہیں اور سچ یوں ہے کہ یہ بھی من سمجھوتا تھا۔ ورنہ بات تو یہی ہے کہ

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی۔ چوٹی بی جلیبیوں کی رکھوالی۔ اُدھر فلک سیری حکیم ادھر بوڑھی طوائف لیکن تھی تائب۔

دل کو طفل تسلیوں سے بہلاتا رہا۔ اور اپنی آنکھوں سے حکیم صاحب کے روابط میں ترقی دیکھتا رہا۔

کمو اپنا راز دار تھا۔ ہم گھنٹوں اس کی کوٹھی میں دبکے بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن اسمیں دقت یہ تھی کہ ان کے گھر والے باہر آتے جاتے۔ اگر ہم کو دیکھ پاتے تو شبہ کرنے لگتے اور کمو غریب کی بھی شامت آتی۔ اس کا اور کوئی ٹھکانا بھی نہ تھا اس لئے بہت احتیاط کرنی پڑتی۔ ایک روز تو خدا نے خیر ہی کرلی جانی برا باہر جاتے ہوئے کمو کی کوٹھی کے دروازہ پر ٹھٹکیں اور دو آوازیں دیں۔ وہ اس وقت نشہ میں تھا۔ بولا اندر آجاؤ۔ دو دو باتیں ہی کرلیں۔ اب تو تو بہت الگ الگ رہنے لگی ہے اچھی بات ہے۔ ہمارے بھی کبھی دن پھریں گے وہ دو ٹرک کر بولیں۔ دیوانے ہوئے ہو۔ بچی کی طبیعت اچھی نہیں ہے تمھیں اپنی سوجھ رہی ہے۔ میں نے اتنی دیر میں یہ ہوشیاری کی کہ دس پانچ کرسیاں ایک آدھ اُپلا آگ کے ٹوٹے گھڑے میں رکھ دیا۔ کوٹھری میں دھواں ہی دھواں گھٹ گیا۔ جانی بوا بولیں غضب خدا کا۔ اتنا دھواں کر رکھا ہے۔ دم گھٹ جائے آدمی کا۔ میں تو کبھی اندر نہ آؤں۔ تم ہی جھٹ سے نکل آؤ نا۔

میں ڈر کے مارے کمو کو جتا نہ سکوں کہ نشہ میں تو ہے ہی کہیں بول نہ پڑے اتنے میں اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی اور بولا اچھا نا جو میں ہی باہر آتا ہوں اب ان دونوں میں بے تکلفی سے باتیں ہونی شروع ہوئیں۔

جانی بوا۔ تم سے ایک صلاح لینی ہے۔

کمّو۔ فرمائیے۔

جانی بوا۔ تمہارا اس وقت دماغ بھی ٹھیک ہے یا نہیں

کمّو۔ دماغ تو مدتیں ہوئیں آپ نے درست کر دیا

جانی بوا۔ پھر وہی شکوہ شکایت۔

کمّو۔ پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

کمّو کے منہ سے برجستہ غالب کا یہ شعر سنکر مجھے تعجب سا ہوا لیکن پھر خیال آیا کہ لوگوں کے قول کے مطابق یہ اچھے گھر کا چشم و چراغ تھا یقیناً بدنصیب ماں باپ نے تعلیم دلوائی ہوگی۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ میری اپنے انجام پر نظر گئی اور سر میں ایک چکر سا آگیا۔ لیکن سیل عشق ایسے خس و خاشاک کو زیادہ بڑھنے نہیں دیتا۔ میں پھر کان لگاکر کمّو اور جانی بوا کی باتیں سُننے لگا۔

جانی بوا۔ تم اپنا دُکھڑا لے بیٹھے مجھے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

کمّو۔ نہ شکایت کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

جانی تجھے یاد ہے، یہ شعر تو نے مجھے لکھا تھا۔ دُنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے آج میں تیرے سامنے پڑھ رہا ہوں۔ جانی میں وہ زمانہ بھولا نہیں جب تم مجھ سے اظہار عشق کیا کرتی تھیں۔ میں اگر کسی اور کوٹھے پر دو چار منٹ کو بھی چلا جاتا تو تم دو دو دن کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ آج میں ہی ہوں کہ تمہاری لونڈی

میں سوکھے ٹکڑوں کا منتظر پڑا رہتا ہوں۔ کبھی میرے گھنٹوں انتظار ہوتے تھے اب میں ہفتوں آپ کی چشم کرم کا منتظر رہتا ہوں۔ ع

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جانی بوا۔ (بات ٹالنے کے لئے) میں کہتی ہوں کوئی سن لے گا تو کیا خیال کرے گا۔

کمو۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ کوئی سن لے۔ شاید ڈوبتے ڈوبتے بچ جائے۔ گڑھے میں گرتے گرتے رک جائے۔

جانی بوا۔ اے آج تمہیں ہو کیا رہا ہے۔

کمو۔ اپنا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ ع

کبھی ہم میں تم میں بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جانی تو بھول گئی میں نہیں بھولا۔ وہ محفل یاد ہے جہاں تو نے یہ غزل گا کر میرا وہ عہد تڑوایا تھا جو مجھ بد نصیب نے مرتی ہوئی ماں سے کیا تھا ــــــ تجھے یاد نہیں مجھے یاد ہے۔ ماں سے وعدہ کرنے کے بعد میں نے تیرے ہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ چھ مہینہ تک ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اختر سے دل لگی پیدا کر لی تو میرے لئے تلملا رہی تھی۔ اتنے میں نواب کے لڑکے کی شادی ہوئی اور تو محفلوں میں آئی دو راتوں تو برابر مجھ پر ڈورے ڈالتی رہی۔ لیکن اختر بھی ہوتی تھی اور اس کے آگے تیری چلی نہیں۔ تیسری رات تو نے تھانہ دار کی معرفت اختر کو رکوا لیا۔ اور خود جلسہ میں آئی۔ اب تک رنڈی کا توڑ رنڈی کرتی تھی۔ آج میں اکیلا رہ گیا تھا۔ تو نے بھی

سارے ہتھیار بھرپور استعمال کیئے۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
میری طرف بتا بتا کر دس منٹ تک گاتی رہی ------ زندہ طوائف کا جادو
چل گیا۔ مری ہوئی ماں سے جو عہد تھا نہ رہ سکا۔

جانی میں تیری باتیں بھولا نہیں ہوں --- ---- وہ رات بھی چرس کے دھوئیں اور چلم کے شعلہ سے میرے سینہ پر کندہ ہے۔ جب کہ تو مجھے تڑپتا چھوڑ کر راجہ مائے پور کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح ہر چہار سو سر پھوڑتا پھرا اور جب تیری لگائی ہوئی آگ کسی عنوان نہ بجھی تو قمر نے آگ کو آگ سے مارا۔
اس رات قمر الدین پسر بدر الدین سوداگر صدر بازار وہ آگوں میں مجسم ہو گیا اور کمو چرسیا پیدا ہوا۔

جانی بوا۔ (گھبرا کر) تم کیا غضب کر رہے ہو۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔

کمو۔ کہہ تو چکا ہوں کہ میری تمنا یہی ہے کہ کوئی سن لے اور دل کے کانوں سے سن لے۔ کاش آج مثل اصل ہو جائے۔ اور در و دیوار کے کان لگ جائیں
تو سمجھتی ہے کہ میں چرس کے نشے میں پڑا رہتا ہوں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ سن اور غور سے سن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پندرہ دن ہوئے میرا لڑکا آیا تھا۔ تجھے لالچ دے کر ہاتھ جوڑ کر اپنے کم نصیب سیاہ کار شرمسار گنہگار باپ کا پتہ پوچھتا تھا اور تو نے صاف انکار کیا۔ اس کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ مجھے چرس کے دھوئیں کی زنجیروں اور شرمساری کے سوتوں نے جکڑ رکھا تھا نکل نہ سکا۔ اور تو اپنی مصلحتوں سے پابجولاں تھی۔ . . . جانی قمر الدین نوجوان لڑکا

اندھا ماں کا نافرمان. باپ کا مرنا چاہنے والا تیری چالوں میں آگیا لیکن یاد رکھ کمّو چرسیا تیری جوڑ ہے ——— مجھے وہ مصلحتیں بھی معلوم ہیں جن کی بنا پر تونے مجھے ازکار رفتہ گتّے کی طرح اپنی ڈیوڑھی میں بلکہ دے رکھی ہے اور میرے بیٹے کو میرا نشان دینے سے انکار کیا۔ مجھ لے جسم مرچکا ہے۔ دماغ ابھی زندہ ہے۔ جذبۂ محبت جھلس چکا۔ لیکن اس کی راکھ میں سے اس کے خاکستر میں سے بہت سے جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔

کمّو خدا جانے اور آگے کیا کچھ زہر اُگلتا پر رنڈی بھی بڑی زہر کی بجھی دُم گلی تھی وہ تو لگی سب سے پہلے کمّو کی بھڑکتی ہوئی آگ کو اپنے مصنوعی آنسوؤں سے بجھایا اور دم کے دم میں شیشہ میں اُتار لیا۔ اللہ رے ترے چاتر۔ وہ بھی جانتا تھا

جز آستان توام در جہاں پناہ نیست

سوائے تیرے آستاں کے میرے لئے جہاں میں کوئی بھی جائے پناہ نہیں

دل کی بھڑاس کافی نکال چکا تھا۔ مجھے جو سبق دینا منظور تھا وہ دے چکا تھا۔ در و دیوار کے کانوں تک جو آواز پہنچانی تھی پہنچادی لیکن عہد الشجر اتنی۔ جوانی میں یہ آوازیں کانوں تک آتی ہیں۔ دماغ تک راہ نہیں پاتیں۔

اب جانی بوانے مشورہ طلب امور پیش کئے۔ بولیں الو پر حکیم صاحب کی نگاہ ہے۔ تم جانو میں توبہ کرچکی ہوں اور پھر محلہ کا معاملہ۔ بابو جی ہی کے آنے پر لوگ ناک بھوں چڑھاتے اُلٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں شیخ جی کو بھی چند بار گلی والوں نے ٹوکا ہے۔ آوازہ توازہ تو کستے ہی رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں گھر میں تو یہ سلسلہ ہو نہیں سکتا اور پھر سچی بات ہے مجھے اللہ سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

باٹ بازار والوں پاس پڑوسیوں سے تو بھگت بھی لوں گی پر وہاں جاکر کیا جواب دوں گی۔ صاف بات ہے میں تو ان کاموں میں اپنا قدم رکھوں گی نہیں گوہر جانے اس کا کام جانے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اب لڑکی خیر سے جوان ہوئے آئی ہے کچھ نہ کچھ شکل تو کرنی ہی پڑے گی ——— اس شہر میں تو بر ملنے سے رہا۔ نواب صاحب نے تم کو معلوم ہی ہے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میں ذمہ دار نہیں۔ رنڈی کی چھوکری کون کہہ سکے کس کی ہے۔ فقیر کی جھولی میں ہزار گھروں کے ٹکڑے پڑتے ہیں۔ مفت میں مجھ پر تھوپ رہی ہو۔ اللہ جانے غضب کا طوطا چشم آدمی نکلا ایسی آنکھیں پھیر لیں کہ

ان تلوں تیل ہی نہیں گویا ہم سے کچھ میل ہی نہیں گویا

خدا کی مار پڑے موئے ڈی کاٹے پر پہلے کیا منو بلائی بنا تھا۔ کیا کیا وعدے وعید کئے تھے۔ یہ گوہر بھی نیت خراب ڈھل گئی۔ مجھ اللہ ماری کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے۔ لڑکی کی زندگی خراب ہو گئی۔ خیر اس کے بھی دیدہ گھٹنوں کے آگے آ گئی۔ اب کمو بولا۔ دیکھو جانی بے انصافی نہ کرو۔ تم نے بھی تو نا گہانی اس کے سر ڈالی تھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تمہاری گوہر گئے دن اس غیب کی ہو کر رہی۔ ہاں تنخواہ دینے کا تو وہ گنہگار ضرور تھا۔ باقی تعلق رکھتی تھی رشیدو طبلیہ سے ہم نے تو اس وقت بھی ٹوکا تھا کہ یہ حرکت اچھی نہیں۔ تم لوگوں نے ہماری ایک نہ سنی اور سننے بھی کیوں۔ وہ رشیدا ایک سے ایک اچھا تماشبین پھانس کر لاتا تھا۔ تمہارے لوبھ نے اندھا کر دیا۔

جانی بوا مڑک کر بولیں۔ اچھا تو ہم ہی بُرے سہی۔ پر بات وہاں کی ہے

رہی۔ نواب کسی بات کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اب تو ہم کو ہی کچھ نہ کچھ سر تا بر نا کرنا ہوگا گو ہر سیرے بغیر نوالہ نہیں توڑتی اتنا بڑا کام کیسے کرے گی۔ پھر اٹھیرا تو بہ کا معاملہ۔ اب بتاؤ کریں تو کیا کریں۔

کمو تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ بیگم صاحب کچھ زردار بھی ہیں یا نہیں۔

جانی بوا۔ روپیہ والے تو ہیں پر دل والے نہیں۔ کنکناک میں۔ پیسہ مشکل سے سرکائیں گے

تم جانو یہ ٹھیرے مار الجبن پر رنڈی بازی کرنے والے۔ پیسہ وقت سے اگلیں گے۔ ہاں پوزیشن بڑی ہے لڑکی چھٹتے ہی چوٹی کی طوائفوں میں آجائے گی اور پھر رئیسوں کی اُمن کے ہاں آرجار رہے۔ دس بڑے آدمیوں موٹی آسامیوں سے بھی ملاقات کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ جو ذرا ہوشیاری سے کام کرے گی تو وارے نیارے ہیں۔ دیکھو رام پیاری کی چھوکری نے اسی طرح چھاپہ مارا۔ چار مہینہ لالہ سوہن لال کے ہاں نوکر رہی۔ کل پانسو روپے مہینہ دیتے تھے اس نے عذر نہ کیا۔ وہاں سب آنے جانے والوں پر نظر رکھی۔ آخر جے پوریہ کو پھانس لیا۔ اب راج راج رہی ہے ——— اصلی مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ میں توبہ کیسے توڑوں

کمو۔ رنڈی کی توبہ۔ شرابی کا گلاس۔ پہلوان کا کان جتنا ٹوٹے اتنا ہی اچھا۔ یہ موقعہ روز روز ہاتھ نہیں آتے۔ توبہ کا کیا ہے پھر ہو جائے گی۔ ؏

کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

اور توبہ بند نہیں ہو رہا پھر کیا غم ہے۔

جانی بوا۔ اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ ٹھیالے کر بیٹھیں یا لڑکی کو حکیم صاحب ہی کے نام کا کر دیں۔

کمو۔ باؤلی ہوئی ہے بکری کی مینگنیوں سے کیا پیٹ بھرے گا حکیم صاحب چاندی ورق میں لپیٹ کر تو دینے سے رہے۔ جو لیے ہی کھانی ٹھیری تو ہاتھی کی کیوں نہ کھائی جائے۔

جانی۔ یہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ ایک دو پکڑنے سے کام نہیں چلیگا۔ اور پھر اپنے ٹھکانے کی برکت ہی الگ ہے ـــــ دس پنچھی پھنس سکتے ہیں۔ ذکن اری کی بات ہی الگ ہے اور پھر حکیم صاحب کی بھی کنی دبی رہے گی۔ گانے کی آمدنی الگ ہوگی۔

کمو۔ پر گانا تو تم نے اب تک سکھوایا ہی نہیں۔

جانی۔ اے وہ ایسی کونسی بڑی بات۔ جہاں دس دن اُستاد سگھمڑ خاں کے گز تلے آئی خود سیکھ جائے گی۔ اور پھر آج کل کا گانا ہی کیا ہے یہ کوئی ہمارے زمانے تھوڑی ہیں جو ہر رئیس کو کچھ نہ کچھ شد بد ہوتی تھی۔ جہاں رنڈی بہکی اور انھوں نے کان پکڑا۔ مجھے اپنا یاد ہے۔ شروع شروع کا زمانہ تھا۔ ایک مجرے میں شدھ کلیان کی فرمائش ہوئی۔ مجھے اس وقت تک آتا نہ تھا۔ استاد نے بھوپ کلیان کی چیز چھیڑ دی۔ وادی سُر پر پہنچی تھی جو فرمائش کرنے والے بولے بی جان! ہم بھوپال کے رہنے والے تو ہیں نہیں یہ شہر دلی ہے۔ میں تو گھبرا گئی۔ استاد نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی حضور انہے ابھی یاد نہیں کرایا۔ اب اگلے مجرے پرسن لیجئے گا۔ اب تو زمانہ ہی اوندھا ہے نہ کسی کو سُر کی پہچان نہ تال کی

گٹ پٹ ۔ گٹ پٹ کرنے والے سوٹ بوٹ پہن کر روں رال سننے آجاتے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو انھیں گانے سے کچھ مطلب بھی نہیں ہوتا۔ اپنے گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی تفریح چاہتے ہیں آنکھیں سینکیں اور سیدھے ہو لئے۔ سوالیسوں کو بہلانا ہی کیا۔ تم خود ہی دیکھ لو جگو کی لونڈیا خاصی چل نکلی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش کل تک ناک پونچھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ ہماری انور تو ماشاءاللہ ویسے بھی ہوشیار ہے

کمو۔ مچھلی کی جائی کو کون تیرنا سکھائے۔ بھلا جانی نوا کی نواسی اور پھر ہوشیار نہ ہو۔ تو پھر اب سوچنا کیا ہے۔ درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست دوکان سجا کر بیٹھو سال چھ کھا ہے۔ گاہک پھنسا سمجھو اور تم تو قسمت کی دھنی ہو۔ دوکان لگانے سے پہلے ہی گاہک ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بچی کو کمانے اور سونے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔ ایک کمرہ میں ہوگا تو ایک دروازہ پر ایک سیڑھیوں میں۔ یہ الفاظ سن کر میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور کمو نے ایک اُلہانہ قہقہہ لگایا۔

جانی۔ میں صلاح لینے آئی ہوں تم کو ہنسی دل لگی کی سوجھ رہی ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ ٹھیا کے کر کون بیٹھے۔

کمو۔ بیٹھے نہ بیٹھے گوہر کی ماں۔ انور کی نانی۔ پرانی استانی۔ بھلا آپ سے بہتر اس کام کو کون انجام دے سکتا ہے۔

جانی۔ ہزار دفعہ تو سمجھا چکی۔ اب اور کیوں کر کہوں کہ میں توبہ توڑنی نہیں چاہتی۔

کمو۔ ہم بھی تو کہہ چکے۔ پھر جوڑ لینا۔ دس بیس ملا نے کھلانا۔ سو پچاس

نمازیں پڑھنا کچھ خیر خیرات دینا۔ ہم جیسوں کی دعا لینا۔ بس بیڑا پار ہے۔

جانی۔ میں کہتی ہوں آج تمہیں یہ ہو گیا رہا ہے۔ بڑے آئے میری توبہ تڑوانے والے۔ ذرا سوچو تو سہی محلہ والے کیا کہیں گے۔ آج جو تھوڑی سی آبرو بنائے بیٹھی ہوں خاک میں مل جائے گی۔ رہنا ٹھہرا شہر ہی میں کس کو منہ دکھاؤں گی

کمو۔ بیگم جب آپ کی نواسی صاحب کوٹھے پر بیٹھیں گی تو جناب کی کونسی عزت رہ جائے گی۔ ناک تو یوں بھی کٹے گی یوں بھی۔

جانی۔ تمہاری تو عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ میرے ساتھ جانے میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ اب تو یہ بہانہ ہے بھی۔ لڑکی تھی برقعہ سر پر ڈال نکل گئی اپنی بچی کو ساتھ لے گئی۔ میں نے تو عاق کر دیا ہے جیسا کرے گی ویسا بھرے گی۔ مجھے کوئی واسطہ نہیں رہ جانے۔ اس کا کام ہم نے تو اپنے پونے پر بہت سمجھایا۔ ہم نے یہ کام کر کے کونسا پھل پایا جو یہ پائے گی۔ اپنی عقبیٰ خراب کرے گی۔ بچی کی زندگی سو وہ جانے اپنا کوئی زور تو ہے ہی نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ میں الگ کی الگ رہوں گی۔ اور کام کا کام ہو جائے گا۔ اصل مشکل تو یہ ہے کہ وہاں اس کے ساتھ کون رہے۔ لڑکی بھی بالکل الّو ہے کسی کی باتوں میں آ گئی تو اس کی بھی زندگی خراب ہو گی اور ہمارا بھی کمائی کا وسیلہ جائے گا ——— تمہیں میری قسم اس وقت کام آ جاؤ۔ ننھا۔ سے سو اب مجھے کسی پر بھرآ نہیں۔ ہاں کوٹھے پر پلنگ ڈلوا دوں گی۔ بس دیکھ بھال رکھنا۔ اونچ نیچ کا خیال رکھنا۔ اپنے سے زیادہ مجھے اس معاملہ میں تم پر اعتبار ہے۔ ننھا۔ ہموں نہیں

نہ کرنا ورنہ لڑائی ہو جائے گی۔

اتنا کہہ، جانی بوا نے کچھ عجب ڈھب سے کمو کو راضی کر لیا۔ طے پایا کہ استاد سگھڑا خاں دوپہر کو آ جایا کریں۔ سارنگی یہیں پڑی رہے۔ گلی میں سے روز روز بغل میں دبا کر لائیں گے تو دس کی نظر پڑے گی۔ سو باتیں پیدا ہوں گی۔ کوٹھے پر کواڑ بند کر کے سبق دے دیا کریں۔ ابھی تو کانوں میں رس ڈالیں۔ جب ذرا اچھی میں طاقت آ جائے تو سرگم کہلوانی شروع کر دیں۔

ہم کوٹھری میں دبکے بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔ کان ضرور گنہگار تھے سمجھ میں کچھ آتا نہ تھا۔ ابھی سن ہی کیا تھا جو ان گہرائیوں کو پاتے اور ان بلندیوں تک پہنچتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس وقت کا ایک ایک بول پتھر کی لکیر ہو گیا۔ اور ہوتا بھی کیوں نہیں۔ زمانہ نے وہ زخم لگائے کہ آج تک نہ بھر سکے۔ برسات ہی میں نہیں رستے۔ سال پینسٹھ دن کسک دیتے ہیں۔

آج جب کہ زمانہ نے خوشیاں مجھ سے چھین لیں اور غم گلے کا ہار ہو گیا ہے تو وہ وقت یاد آتا ہے جب بیماری کے بعد میں نے پہلے دن ان کو کوٹھے پر دیکھا تھا ـــــ کچھ نہ پوچھو سیروں خون بڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قارون کا خزانہ پا لیا ہو۔

ہم یوں ہی ٹہلتے ٹہلاتے گڈی چرخی ہاتھ میں لے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ جب سے وہ بیمار پڑی تھیں ہم کبھی کبھار ہی چھت پر چلے جاتے تھے۔ اپنی چھت بری لگنے لگی تھی۔ دل کو قرار نہ تھا۔ اور ان کے کوٹھے کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آج بھی ہم نے گڈی اڑانی شروع کر دی اور اس جاری

نظر بھی نہ ڈالی —— وہ کہیں دھوپ میں بیٹھنے چھت پر آئی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ تو محض بہانہ تھا۔ اُدھر بھی لگی ہوئی تھی اور آنکھیں سینکنے کا خیال یہاں تک لایا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سے آئی بیٹھی راہ تک رہی تھیں —— جب ہم نے اُدھر رُخ ہی نہ کیا تو آخر کار آہستہ آہستہ کھنکاریں۔ میں چونک سا پڑا۔ آواز کانوں میں آئی۔ نظریں فوراً اُدھر جا پہنچیں۔ دل کا حال کچھ نہ پوچھو۔ بلّیوں اُچھل رہا تھا —— جب ہم رجوع ہوئے تو وہ آنکھیں جھکا کر ہو بیٹھیں ——

شمع خموش جل رہی تھی۔ پروانہ تلملاتا پھر رہا تھا۔ ہمارا عجیب عالم۔ کبھی گاتے تو کبھی کھنکارتے۔ گھڑی قہقہہ لگاتے تو گھڑی اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہنا چاہتے۔ غرضیکہ ایک دیوانگی کا سا عالم تھا اور شادیٔ مرگ کی کسر

اُدھر ایک عالم استغنا طاری اِدھر قیامت کی بے قراری۔ پہلے تو نظریں نیچی کئے بیٹھی رہیں۔ پھر گاہ گاہ نگۂ غلط انداز پڑنے لگی۔ لیکن ہنوز روزِ اوّل کا سا عالم۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے پُرانا سبق آیا گیا ہوا وہ دفتر گاؤ خورد ہوا دیرینہ معاملات از یاد رفت کی مد میں آ گئے۔ لوحِ دل صاف ہو گئی۔ نقشِ محبت نقشِ باطل کی طرح مٹ گیا۔ ایسی انجان بنی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے

ہم سے کچھ میل ہی نہ تھا گویا ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا

میں ہکا بکا پریشان کہ، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ تو بالکل نئی بن گئیں —— ہمارا دل ہے کہ لوٹا جائے۔ وہاں پلٹ کر دیکھنا حرام ہے

آخر کار بمشکل تمام ہمارے سینکڑوں سلاموں کے جواب میں انہوں نے بھی چار انگلیاں ماتھے پر رکھیں اور ایک نظر بھی ادھر ڈالی۔

کمزوری سے آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ جیسے صبح کے وقت تالاب میں کنول جھکولے کھائے۔ چہرہ پر زردی کھنڈی تھی۔ جس طرح رخِ عروس پر اُبٹنے کا ہلکا سا رنگ رہ جائے۔ کتابی چہرہ سُت سُتا کر سیپی سا نکل آیا تھا۔ سچ ہے بھلوں کو سب ہی کچھ لگے ہے بھلا۔ بیماری نے حُسن دلوانہ سازمیں اضافہ کر دیا تھا۔—— آج بھی اُس آفتِ جان کی صورت میری آنکھوں میں پھر رہی ہے —— سفید لیٹھے کا آڑا پاجامہ۔ ململ کا کرتہ۔ اودی دھسری دلائی سر پر —— تاروں بھری رات میں چودھویں کا چاند بنی بیٹھی تھی۔ بہر نوع یہ بے رخی اور انداز استغنا ادائے معشوقانہ تھی اور کچھ کچھ کسمسا منظر۔ تھوڑی دیر میں وہ کھل گئیں اور پھر وہی پہلے سے راز و نیاز شروع ہو گئے —— اس روز مجھے مکمل ترین خوشی تھی اور اس کے بعد سے یہ لفظ میرے لئے محرومِ معنی ہو گیا —— شاید یہ نعمت مدت العمر میں ایک ہی بار مقدر کی جاتی ہے۔

ابھی تک آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ نظریں گلے مل رہی تھیں۔ دل دل سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مردمِ چشم اس لبت چینی کو پتلیوں میں محصور کر لینا چاہ رہا تھا۔ زبان پر آرہا تھا کہ

داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار   گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

کہ ان کی نانی آن پہنچیں اور میرے کان میں دوشِ صبا پہ سوار یہ آواز آئی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد   روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

محلہ میں کوئی شخص یہ غزل لہک لہک کر گا رہا تھا۔

نمو کا زمانہ ۔ حکیم صاحب کی توجہ ۔ صحیح اغذیہ ۔ چند روز میں دیکھتے دیکھتے طبیعت اُبھر گئی ـــــ مریض اب تنا رست رہتا ۔ لیکن حکیم صاحب کی آٹھویں دسویں رات ، برات کی آر جار جاری ۔ اور کیوں کر نہ ہوتی ۔ ابھی علاج جاری تھا ۔ اور سب سے بڑھ کر جلاب ہوئے تھے ۔ اور وہ بھی ایسے ویسے معمولی نہیں الملناس کے ـــــ ہم کبھی گھڑی گھڑی پل پل کی خبر رکھتے ۔ کچھ تو گونگے لوگوں کی اشاروں میں بتاتی کچھ کموچر سے یہ سے معلوم ہو جاتا ۔

قائلِ بہ تجلّی نہ شود شائقِ دیدار   پروانہ بہ مہتاب تسلّی نہ تواں کرد

ایک روز ابر آیا ہوا اور وہ گلِ رعنا گلابی دوپٹہ اوڑھ کر چھت پر آگئی ۔ ہم پر ایک بجلی سی گری ۔ طبیعت تڑپ گئی ۔ منائے نہ مانے ۔ دل چاہے کلیجہ سے لگا لوں آنکھوں میں بٹھا لوں ـــــ میں نے اشارہ کیا ڈیوڑھی میں آؤ ۔ ہم گلی میں آتے ہیں ۔ پہلے تو وہ نہ سمجھیں ہی نہیں ۔ جب لکھ کر دکھایا تو پہلے تو دانتوں میں انگلی دے لی ۔ پھر دونوں ہاتھوں سے انکار کیا اور منڈیا بھی سانتہ ہے ۔ اس کے بعد ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ پٹواؤ گے ۔ دونوں کان پکڑے ۔ ہلکے ہلکے رخساروں پر طمانچے مارے ۔ زبان دانتوں تلے دبائی ۔ مدعا تھا ۔ نا بابا میری توبہ ہے ۔ تم دیوانہ ہوئے ہو عقل ماری گئی ہے ۔ ہوشوں کی دوا کرو ـــــ یہاں ہوش ہوتے تو ان کی دوا کی جاتی وہ تو کب کے نار کر چکے تھے ـــــ بس اُڑ گئے اور انھیں مانتے ہی ہی ۔

اب ہم نے ان کے گھر کے آگے کا دورے کاٹنے شروع کیے جب کوئی اُدھر سے گذرے تو نظریں اور رُخ دوسری طرف کرلیں ۔ ورنہ ٹکٹکی باندھے

اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں گلی میں بیل فیتہ بیچنے والے نے آواز لگائی اور وہ اس بہانہ سے دروازہ تک آئیں ہم بھی لگے بھاؤ تاؤ کرنے ہاتھ میں بیل پر نظریں اس گلِ اندام پر۔ اُدھر ان کا بھی یہی حال۔ دس دس دفعہ ایک ایک بیل کے دام پوچھیں ——— پھیری والا بھی ایک گھاگ تھا تاڑ گیا۔ بھانپ گیا اور ایک بیل دکھاتے ہوئے بولا۔ لوجی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر آتی ہے۔ وہ بھی گھبرا گئیں۔ ہم بھی دھک سے رہ گئے۔ اُدھر سے اشارہ ہوا کہ اس وقت ٹل جاؤ کہیں بات کھل نہ جائے تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا اور بادلِ ناخواستہ چلے آئے۔ بیگم نے ایک کرتہ وہ بیل کے قابل لے کر بڈھے کو چلتا کیا۔ ہم پھر لگے گلی میں چکر کاٹنے

سامنے سے علالی سیتا آن پہنچا اور ہی بنکارا۔ دیکھا ہے تیری گلی کے سو سو پھیرے۔ تو نہ روٹھے چاہے زمانہ۔ کہو یار گرداں ہوگئے گرد ان دی کچھ کام وام بھی بنایا یا خالی خولی ہیر گھمائی ہی کر رہے ہو ——— میں نے بات ٹالنے کو کہا یار بہت دن سے بائیسکوپ نہیں دیکھا ——— بولا وی اب تو لیلا مجنوں کا فلم اپنی گلی ہی میں چالو ہوگیا ہے۔ بس اتنی کسر ہے یاروں کی مانو تو ایک لوٹا (کچھوٹا) پیالہ ہاتھ میں لے کر بس وہ گجل گا وہ دہی تیری گلی میں آیا۔ لیلیٰ تیری گلی میں آیا ——— اتنا کہنے کے بعد مجھے گول گول دیدوں سے دیکھا اور بولا بیٹا یاروں سے چھپاتے ہو اچھی بات ہے جو میں بھی ڈھنڈورانہ پیٹ دوں تو بھٹیا دے کا نہیں کسی چمار کا کہنا اور اُسو قت (اس وقت) بھی موچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہوں جو یار غار کی مدد بغیر تیرا

کام بن جائے تو اس میں دیکھو جس میں بھنگی کود دے۔

میں بولا سیتا یہ تو آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ میں اور تجھ سے پردہ رکھوں۔ بات چھپاؤں۔ دیوانہ تو نہیں ہوا۔ عقل تو ٹھکانے ہے۔ بولا یہ بات ہے تو لا زلدی (جلدی) سے خورمہ (قورمہ) کا ہاتھ اور فوراً بتا کو یہ بتا کچھ معاملہ پٹا بھی یا نہیں۔ دیکھ تجھے میری جان کی قسم چھپائیو نہیں — میں نے کہا یار کیا بتائیں۔ تیری قسم ابھی تو تاک دیکھ لیا۔ دل شاد کیا ہی ہیں ہیں — بولا وی یار تو بھی نرا نری گھامڑ ہی رہا۔ میں تو قسم خدا کی اب تو ڑی نیا پانچہ بھی کر ڈالتا اور وہی اس کمو حالی نے بھی کوئی رستہ نہیں بتایا۔ بس بیٹا تم بھی نرے جنٹرمین ہی ہو۔ عینک لگا کر معشوق دیکھنے والے۔ ہم جیسے دل پھینک ہوتے تو کدی کا کام بنا لیا ہوتا۔ اچھا ہے اپنا کیا ہے تو یونہی جھڑتے رہو۔ چچا یاروں سے الگ الگ رہو گے تو بس نامحروم (محروم) ہی رہو گے۔ میں نے کہا تجھ سے الگ رہتا کون ہے۔ بولا ناحق بن ناحق مجھے غصہ نہ دلا۔ قسم ہے قلا اُڈو کی پکا بیٹھا ہوں۔ آج پورے آٹھ دن بعد تو صورت دکھائی ہے اور وہ بھی استفاقیہ (اتفاقیہ)۔ میں نے کہا تجھے ہماری مصیبت کی تو خبر نہیں۔ ماسٹر جی نے ڈھیروں کام بتا دیا۔ ابا کا کہنا ہے جو اب کے سے فیل ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔ اب تو ہی بتا کتابوں سے سر پھوڑوں یا تیرے ساتھ گتے خسی کرتا پھروں۔ اس کے جواب میں مجھے بہت شریر آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ وی یاروں کو پڑاتا ہے۔ اس وخت تو یاں گلی میں کھڑا بڑی کتابیں دوہرا رہا تھا نا۔ یہاں تو

میں کھلبس گیا اور بولا کبھی جیسی چاہئے قسم لے لے۔ تیرے پاس آنے کے ارادہ
سے نکلا تھا یہاں ڈماگی ذرا کھٹک گیا تو جانے دل کے معاملہ میں ہم کہتے
ہیں آج بائیسکوپ چلے گا۔ ان باتوں سے مینا کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ اور
بائیسکوپ کے ذکر نے تو بالکل ہی ٹھنڈا کر دیا اور وہ شام کو ملنے کا وعدہ کر
سیدھا ہو لیا۔

ایک روز ان کے گھر حکیم صاحب آئے۔ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے۔ پان چبائے
باتیں بنائیں۔ خوش گپیاں کیں۔ دیر تک مریضہ کی نبض پر انگلی دھرے بیٹھے
رہے۔ ان کی رائے میں اب پھنسیں کافی ہو گئی تھیں۔ مواد پک گیا تھا۔ جلاب
کا نسخہ لکھ گئے ---- شام کو وہ کوٹھے پر آئیں۔ ہاتھ کھول کر انگلیوں
کی گنتی سے بتایا کہ دس پندرہ دن ہم کوٹھے پر نہیں آسکیں گے۔ پینے کا
اشارہ کیا۔ ہاتھوں سے بڑا سا پیالہ بنا کر دکھایا۔ مدعا تھا کہ بہت سی دوا
پینی ہے۔ یعنی جلاب۔

جلابوں کے دوران میں ایک دو نہیں بیسیوں جگہ سے پھول پان
کنٹھے نقل آئے۔ لیکن جس اہتمام سے حکیم صاحب قبلہ نے بھیجے وہ سب سے
بڑھ چڑھ کر تھا ---- ہزار پان کا بیڑا۔ ورق لگی گلوریاں۔ چاندی کا
عطردان۔ سینکڑوں کنٹھے۔ ہزاروں گجرے۔ تانبے کی قلعی دار سینیوں میں سجے
سجائے۔ ان پر ٹھپا لگے۔ لال سبز خوان پوش۔ اس سب پر طرہ یہ کہ مریضہ
کے واسطے پوما پھیروں کا گہنا ہم بھیجے گئے ---- ہم کو بعد میں معلوم ہوا
کہ یہ غرض مدعا کا لطیف پیرایہ تھا۔

نہیں معلوم کیوں پھر حکیم صاحب کے توڑ پر ہمارا بھی کچھ کرنے کو دل چاہا اور
تیسرے دن یعنی دوسرے جلاب پر گو ہم پھول پان کا انتظام تو نہ کر سکے پھر بھی
ایک پشمینہ رومال میں عطر کی شیشی لپیٹ کر ممو کو دی۔ اس نے کہا کس بہانہ دوں
ڈر لگتا ہے کہیں بات کھل نہ جائے تاہم یہ تدبیر قرار پائی کہ وہ اپنی طرف سے دے
دے۔ ہمارا نام درمیان آنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

خدا خدا کر کے تینوں جلاب ختم ہوئے۔ سنا ہے کہ اطبا دشمن کو ایک، دوست
کو دو اور اولاد کو تین دیتے ہیں ——— جذبات کی خبر نہیں۔ بہر نوع حالات
یہ تھے کہ جلاب حکیم صاحب نے اکٹھے تین ہی دئے۔ نیز احتیاط بھی اولاد ہی کی سی
کی۔ مسہل کے دوران میں کئی بار خود تشریف لائے۔ بڑی بڑی دیر بیٹھے رہے۔۔
آخر طبیب ہی تو تھے۔ مریض سے یہاں دلچسپی اس کی دلدہی کوئی ان کا فرض تھا۔
یہ پتہ ہی ہے کہ دوا سے زیادہ معالج کی توجہ تو کرتی ہے۔ دوا تو مرض
روکتی ہے۔ اور یہ دل جوئی ہے ڈھارس بندھاتی ہے لیکن تعجب یہ تھا
کہ اس حسن اخلاق کا مظاہرہ ہی ہمارے ساتھ عمل میں نہ آیا۔

کوئی پندرہ روز بعد چلتی لچکاتی، سو بل کھاتی قدم قدم پر ٹھٹکتی کوٹھے
پہ آئیں۔ ہم تو آنکھیں لگائے بیٹھے ہی رہتے تھے جھٹ ہی سلام داغا انھوں
نے بھی ایک عجیب انداز سے مڑ کے جھک کر جب سلام دیا۔ ہمیں تو خدائی
مل گئی بہجت دارین کے ساتھ نیاز کر مزاج قیامت ڈھا جاتا ہی
انھوں نے گردن اونچی کر کے ہماری جانب نگہ التفات ڈالی تو ہمارا
بھیجا ہوا رومال گلے کا ہار نظر آیا۔ دل باغ باغ ہو گیا سوچا اب دل یہ ہمارا

ہے. لیکن چپ ہو گیا. تھوڑی دیر بعد انھوں نے خود ہی رومال دکھا کر پوچھا ہم نے کہا جی ہاں اس غلام نے ہی بھیجا تھا ——— بیگم نے گلے میں سے کھول کر کھیلتے کھیلتے ایک مرتبہ ہونٹوں سے لگایا پھر سینہ پر ڈال لیا ——— بوا وہ ادائیں وہ اظہار خلوص و محبت بھلایا نہیں جاتا. اب بھی اگر کسی عورت کے ہاتھ میں اس ڈھنگ کا ریشمیں رومال دیکھ لیتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے. دل سنبھالے نہیں سنبھلتا. نقوش اول دل نشین نہیں بلکہ سویدا گزیں ہوتے ہیں اور محو ہو نہیں سکتے.

چند روز میں کمزوری جاتی رہی ——— ایک روز استاد گھر انا ل کی بلاؤ ہوئی بمعمر انسان. سرخ ڈاڑھی. پوپلا منہ. تیز تیز آنکھیں چھوٹا قد — لکڑی ٹیکتے ہوئے آئے لڑکی باقاعدہ شاگرد کرائی گئی.

ہمارے بھی پینگ بڑھتے گئے. حکیم صاحب کی ریشہ دوانیاں تو جاری ہی تھیں. اب تحفہ تحائف بھی آنے لگے. لیکن اس شان کے کہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جو چیزیں کوئی مریض بطور نذرانہ لایا انھوں نے کچھ ادھر بھیج دیں.

اب حکیم صاحب کا بلا وجہ یہاں آنا اور ان بیگم کا ڈولیوں میں چڑھ چڑھ کر جانا نیز آگے کی نسبت ذرا پیسہ کی ہر بہر. خوان پر خوان اُترنے چھپائے چھپ نہ سکے. اول تو ہمسائے پڑوس میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں پھر ہوتے ہوتے گلی بھر میں چرچہ ہو گیا. ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی. تو نے مجھ سے کہی. میں نے تجھ سے. شدہ شدہ بچّہ کی زبان پر یہی ذکر تھے ——— محلہ میں سے آتے جاتے ایک آدھ من چلے نے جانی بوا پر بھی فقرہ کسا. ایک بولا

تو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ دوسرے نے زبان پکڑی اور کہا یاد دلا ہوا ہے
حج کر کے نو سو کھائے —— یہ چبھتی ہوئی باتیں سن جانی بوا بلبلائی ہوئی
گھر آئیں سب کو اکٹھا کیا۔ کمو چرسیہ کی بھی طلبی ہوئی۔ حالات ناقابل برداشت
ہوئے جاتے تھے۔ شہدے نچے راہ چلتے ٹانگ لینے لگے۔ اس طرح گذر ہونی
ناممکن۔ برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک میں ملی جا رہی تھی۔ پھر یہ بھی اندیشہ
تھا کہ جو کل کلاں کو یہ بات زیادہ کھلی تو نوالی گیری ختم۔ کوئی شریف اپنے
اپنے گھر میں آنے دینے کا بھی روادار نہ ہوگا۔ اور ان کے روٹی ٹکڑے کا بھی
سہارا۔ حرام کمائی یہ بیگم کھاتی نہیں۔ اپنے دست رنج پر گذر بسر —— حکیم صاحب
کی آرجار نے اور بھی شگوفہ کھلا دیا۔ سارا شہر ان کو جانے۔ بچہ بچہ ان سے واقف
کوئی انجان غیر معروف شخص آئے جائے تو دس بہانہ بنائے جا سکتے ہیں۔ انکے
آنے پر کیا بات بناؤ۔ جب تک بچی بیمار تھی کسی نے شبہ نہ کیا۔ کہنے کی بھی گنجائش
تھی کہ بھئی بیمار کو دیکھنے آئے ہیں۔ اب اللہ کے فضل سے بچی تندرست ہو گئی
پھر کیا عذر تراشیں —— ایک طرف سے یہ بھی آرا اٹھائی کہ جانی بوا بیمار
بن جائیں تاکہ حکیم صاحب کے آنے کا عذر شرعی باقی رہے۔ اس پر بڑھیا بھی
تڑبھڑ بولی۔ بولی اے نوج دور پار۔ میرے بیری بیمار پڑیں۔ کہنے والوں کے
منہ میں خاک۔ کمو بھی چیں بہ جبیں ہو کر کہنے لگا لڑکی دیوانی ہوئی ہے۔ عقل کے ناخن
لے۔ خال زبان نکالتی ہے اتنا نہیں سوچتی جو یہ ایک ہفتہ گھر بیٹھ جائیں تو
سارے ٹھکانے چھٹ جائیں گے۔ تم میں سے تو کوئی اتنا بھی نظر نہیں آتا جو ان
کے منہ میں پانی بھی ٹپکا دے۔

انجام کار قرار پایا کہ حکیم صاحب کی طرف سے ذرا کھچائی کرو۔ مدعا یہ کہ حکیم صاحب آئیں تو بچی کو چھپا دو۔ کہہ دو کہ گئی ہوئی ہے۔ دو چار دفعہ کے بعد کسی ڈھب سے یہ آواز کان میں ڈال دو کہ محلہ والوں نے دم عنیق میں کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ سٹہ کرتے فقرہ کستے ہیں آوازہ تو آوازہ پھینکتے ہیں۔ ہم بھی سر نہیں اٹھا سکتے۔ بات یہ ہے کہ ہم غریبوں کے گھر آپ جو کرم فرمائیں گے تو آپ سے آپ انگلیاں اٹھتی ہیں۔ غریب کی ہر طرح مشکل۔ حضور تو غربا نوازی فرماتے ہیں۔ پھر دنیا پتہ نہیں کیا کیا سمجھتی اور کیا کیا کہتی ہے۔ خلق کا حلق بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہم پر بات آتی ہے۔ حضور کے آگے تو کوئی اُف نہیں کر سکتا۔ پر ہم بیچارہ کیا کریں۔ وہ ہی گلی والے جو سرکار کو آتے جاتے سلام کرتے ہیں بعد میں ہمارے منہ آتے باتیں بناتے ہیں۔

غرضیکہ اس تدبیر پر عمل کیا جانے لگا۔ چند بار غریب حکیم صاحب محروم دیدار لوٹے۔ نظر بی دید کی طالب یہاں درشن کھوٹے۔ پھر حسب قرارداد طریقہ قرینہ سے طے شدہ باتیں بھی تھوڑی تھوڑی کر کے گوش گذار کر دی گئیں ——— یہ بیچارہ تاب فرقت لا نہ سکے۔ بڑھاپے میں لگتی ہے تو بجھائے نہیں بجھتی ہیں۔

جوانی سے زیادہ عہد پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

پیسہ کی کمی، ٹتی خیر سے دواخانہ چل رہا تھا۔ پھر نذرانہ بھی آتے رہتے علاوہ، دیں میں ڑکے نام کے دس بیس روپیہ ہر مہینوں سے بٹور لیتے۔

کبھی کبھی باہر سے بھی بلاوا آ ہی جاتا۔ پھر تو اچھی بڑی رقمیں چیرتے۔ مزید برآں گھر کی جائداد بھی کتنی۔ پر تھے ذرا کنجوس مکھی چوس —— پیسہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتے۔ روپیہ کو دیکھ کر کہتے تجھے نہ اٹھاؤں تیرا ابھائی اور ملاؤں —— پر غریب دل کے ہاتھوں مجبور رہتے اور طبیعت چھوکری پر ٹوٹ گر آئی لگے بچارے عشق کے مارے دو جھٹکوں میں سونا اگلنے۔ یہی ان زرکنوں کے مدنظر تھا۔

حکیم صاحب نے بالمشافہ بات کرنی کچھ مناسب نہ سمجھی۔ ان کے ایک دوست تھے ماسٹر صاحب کہلاتے —— رفیق نام خیر سے حضرت اپنی قماش کے ایک ہی تھے۔ ایسی چلتی رقم جو کہیں بندھی نہیں چھٹی ساتویں تک تو ہندوستان میں تعلیم حاصل کی۔ پھر کچھ سیاسی تحریکوں میں رقمیں سیدھی کیں۔ پولس میں بھی آر جار۔ مجسٹریٹوں سے بھی دعا سلام۔ دوائیں حکیم صاحب کے پاس سے افسران کو جائیں۔ رنگ جمے جناب ماسٹر صاحب کا۔ غرض کہ ان حیلوں حوالوں سے رشوتیں بھی بالا ہی بالا اڑا جاتے۔ اہل غرض دیکھتے کہ ماسٹر صاحب کا بڑا رسوخ ہے۔ زبان کے میٹھے تھے۔ ہر ایک کے پھٹے میں پاؤں دینے کو تیار۔ وہ غریب ان کی معرفت کام کرانے چاہتے۔ یہ ہاتھ رنگتے۔ نیز حکیم صاحب کے ہاں کے روز کے حاضر باش۔ مریضوں سے سعی سفارش کے نام کا لیتے سو جدا۔ اور فی مریض حکیم جی سے کمیشن الگ اینٹھتے۔ مدعا یہ کہ ان جھانسے جھپٹوں میں دنیا کو الو بنا اپنا الو سیدھا کر چار پانچ ہزار کی رقم نکال پاس پورٹ بنوا سیاں نے ولایت کی راہ لی۔ تعلیم میں جو کمی تھی وہ یوں پوری ہو گئی۔ سال بھر بعد واپس آئے۔ ڈگری

وگری کچھ لائے نہیں تاہم تھے ولایت پلٹ اور اب کس کی شامت نے دھوکا دیا تھا کہ ان کے تعلیم یافتہ ہونے میں شبہ کر سکتا۔ ہر کہ شک آورد کافر گردد۔ خیر سے وہاں کی تو ہوا میں علم ہے اور انھوں نے ایک سال وہ ہوا ضرور کھائی تھی اس میں چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ واپس آتے ہی لگے لونڈے پڑھانے اب۔ ابھی خیر سے حکیم صاحب ہی کے صاحبزادہ سے کی ——— وہ یہاں کسی کے بس میں آتے بھی نہ تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے سینکڑوں ماسٹر بدلے گئے۔ پر یہ کسی کے قابو میں آئے ہی نہیں۔ ماسٹر کے نام سے گھبراتے کتاب کی صورت سے بدکتے۔ ماشاء اللہ پندرہ برس کی عمر ہونے آئی تھی۔ اور اللہ کے فضل سے الف کے نام بھلا ابھی نہیں جانتے تھے ——— ماسٹر صاحب قبلہ نے حکیم صاحب پر یہ رنگ جمایا کہ بندہ ولایت سے خاص جدید طریقہ تعلّم سیکھ کر آیا ہے۔ بچہ کا دل اُچاٹ ہونے نہیں پاتا۔ ان ولایت والوں نے کمال کی ترکیب نکالی ہے۔ کتاب وتاب کی حاجت ہی نہیں۔ باتوں باتوں میں سب کچھ سکھا دیا جاتا ہی۔

اوّل تو یورپ رٹرن استاد ملا۔ پھر مفت کا۔ اس پر طرہ یہ کہ کتابوں کا بھی خرچہ نہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ حکیم صاحب فوراً ہی تو راضی ہوگئے۔ ہاں منہ چھوانے کو اتنا کہا ضرور کہ آپ بلا معاوضہ یہ تکلیف کیوں فرمائیں۔ اس پر ماسٹر صاحب نے جواب دیا بھلا حکیم صاحب یہ آپ کے فرمانے کی بات ہے۔ خانہ زاد تو غلام ہے۔ میرے لئے یہی شرف کیا کم ہے کہ میاں کو پڑھاؤں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ صاحب زادے صاحب پر یہ نہ ظاہر ہونے پائے کہ میں انھیں پڑھانے پر مقرر کیا گیا ہوں ورنہ میں جانوں

وہ جانیں میں اپنے طریق سے سب کچھ کر لوں گا۔ اللہ نے چاہا تو سال بھر میں آپ دیکھئے گا کہ میاں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

رفیق صاحب عرف ماسٹر جی تھے۔ حرفوں کے بنے ہوئے۔ لونڈے کو پکڑ لگے ولایت کی باتیں بنانے وہاں کے قصے سنانے۔ نو عمری کا زمانہ۔ ابھرتی اُمنگیں۔ اُٹھتا ہوا شباب۔ لڑکے کی یہ حالت کہ ماسٹر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ان کا پیچھا نہ چھوڑے۔ یہ روزانہ نت نئی داستانیں گھڑ کر سنائیں۔ حکیم صاحب بھی خوش کہ اب بچہ دل لگا کر پڑھ رہا ہے اور کیوں نہ ہو صاحب ولایت کا خاص طریقہ تعلیم ہے۔

مدعا یہ کہ حکیم صاحب کو رنڈی کے ہاں پیام سلام لے جانے اور معاملہ چکانے کے لئے نو عمر صاحب زادے کے استاد سے بہتر کوئی نظر نہ آیا۔ اور بات بھی یہی تھی جس نے ان کے صاحبزادہ کو شیشہ میں اتار دیا۔ اس کا رنڈی کو باتوں میں لے آنا کوئی بعید از قیاس امر نہ تھا۔

قصہ مختصر اب تک جو بات پردہ پردہ میں ہوتی تھی۔ ماسٹر صاحب کے توسل سے صاف صاف معاملہ کے طریقہ سے ہونے لگی۔

جب ان ولایت پلٹ صاحب نے دیسی نائکہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی تو پہلے تو جانی لوہانے اپنی توبہ تلاّ کا زور باندھا۔ نوج دور پار اللہ نہ کرے اب میرے گھر میں لنگوڑی حرام کی کمائی آئے۔ نا صاحب ہم اس گوں کے نہیں۔ میں نے آبرو خاک میں ملا کر کیا پھل پایا جو یہ ہتھال ہو جانی گی۔ اللہ ایمان سلامت رکھے۔ ایمان ہے تو جہان ہے۔ میری طرف سے حکیم صاحب سے

حکیم صاحب سے فرما دیجیے گا کہ یوں ہم ہر طرح خانہ زاد ہیں۔ اُن کا ہم پر احسان ہے۔ بچی کی انھوں نے جان بچائی ہے۔ اگر میری کھال کی جوتیاں بھی بنا کر پہن لیں تو شریف ہوں تو دریغ نہیں کروں گی۔ پر یہ بات تو اب اس گھر میں میرے جیتے جی ہو نہیں سکتی۔

ماسٹر جی نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ جب حکیم صاحب آتے ہیں تو تم لڑکی کو کہاں سرکا دیتی ہو۔ جانی بوا نے کہا آپ ماشاءاللہ سیانے ہیں حکیم صاحب بلا وجہ ہمارے ہاں آنے جانے سے نظروں میں چڑھتے ہیں۔ ہم پر کبھی حرف آتا ہے۔ اہل محلہ باتیں بناتے ہیں۔ آپ جانیں آبرو تو غریب امیر سب کی ہی ہے۔ میں نے سوچا نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ نہ لڑکی ہوگی نہ حکیم صاحب آئیں گے۔ پھر یہ ٹھیرا آگ پھونس کا بیر۔ اب بچی بھی ماشاءاللہ سیانی ہے۔ یہ عمر ایسی ہوتی ہے جو اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے بیریوں کے کان بہرے۔ لڑکی کی طبیعت ذرا بھی ادھر مائل ہوگئی تو ہم کدھر کے رہے۔ میں نے بھی یہ چونڈا کوئی دھوپ میں تو سفید کیا نہیں ہے۔ سوچ سانچ کر یہی صورت نکالی کہ بدعا ہی آنکھوں سے اوجھل کر دو پھر بدعی کیوں آنے لگا۔

ماسٹر صاحب بھی بڑے پورے تھے ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

بہرصورت یہ آتے جاتے رہے۔ بڑھیا سے باتیں بنائیں۔ لڑکی کو بھی بھانپا۔ نظروں میں کھپ گئی دل میں اتر گئی۔ — جب بڑھیا ویسے قابو میں آتی نظر نہ آئی تو یہ حضرت اُس سے گٹھ گئے اور اب ان دونوں ٹھہر فن شاگردوں نے حکیم صاحب کو گھیرنے کے نقشہ جمانے شروع کیے۔ سامنے کی

چال تھی۔ جا حکیم صاحب سے جڑ دی کہ لڑکی کا رُخ آپ کی طرف تھا۔ وہ لوگ تاڑ گئے۔ بس خانہ بدل دیا۔ تاکہ شہ نہ پڑ سکے۔ آپ جانئے ان کا یہی تو ایک مہرہ ہے۔ اگر زد میں آجائے تو بساط اُلٹی سمجھئے۔ —— پرحضور ہے غضب کی لاکھوں میں ایک سمجھئے۔ اس وقت شہر میں ظالم کے جواب کی ایک نہیں ہے۔ یہ پردز ہو حسن بانو تو اس کے آگے پانی کبھی نہیں بھرتیں حسن گلوسوز پایا ہے آج خیر سے گلابی دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ بس کیا بتاؤں خدا گواہ ہے گالوں کا رنگ اور اس کا رنگ ایک ہو رہا تھا۔ یوں سمجھئے گلاب کی پنکھڑی ہے۔ پھر یہ خدائی خوار نانی کا خار برا لگا ہوا ہے۔ یہ کانٹا نکلے تو کام بنے۔ حکیم صاحب نے نہایت فلسفیانہ انداز میں کہا ماسٹر صاحب گل بے خار کجا است۔ اب تو فکر معقول بفرما کی ضرورت ہے۔

آخر کار ہمارے ماسٹر صاحب نے بڑھیا کو نیچا دکھانے اور حکیم صاحب کو سرمنزل پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن ساتھ کے ساتھ یہ آواز بھی کان میں ڈالدی کہ روپیہ اچھا خاصا خرچ کرنا پڑے گا۔ حکیم صاحب نے مرے دل اور دبی زبان سے کہا۔ بھئی خرچ تو ہوتا ہی ہے۔ پر جہاں تک ہو سکے ذرا کفایت سے کام لینا۔

اب یہ حسن وعشق کا ڈرامہ جاری ہوا اور ماسٹر صاحب کی ڈائرکشن میں شروع ہوا۔ تو بہ کردہ طوائف کی پانزدہ سالہ چھوکری پر پنجاہ سالہ حکیم صاحب ریشہ خطمی ہو رہے ہیں۔ شربت وصل کے طالب ہیں۔ شربت دینار لنڈھایا جا رہا ہے۔ حکیم صاحب کے بھروسہ کے دوست ان معاملات میں چاق چوبند تھیں

چھیڑنے کی نیت سے بڑھیا رنڈی سے مل گئے ہیں۔ حکیم صاحب بھروسہ پر رہے ہیں دل کی نیا یار کے حوالے کر دی ہے۔ اور وہ ہے بیڑا غرق کرنے کی فکر میں۔

یہ ہوا اس ڈرامہ کا خلاصہ اب ذرا تفصیل میں آئیے۔

حکیم صاحب کشتوں کے تو پھکے ہوئے تھے ہی۔ کچھ آتشِ عشق نے اور سوختہ کر دیا۔ اوپر سے ماسٹر صاحب نے دی ہوا۔ اور پھر روز نت نئی تدبیر سے۔

جہاں دیکھا کہ تسلسل فراق سے آگ دھیمی پڑی۔ فوراً میرے یار نے دو جھونکے دیدیئے۔ کہا چار روز میں دیدار کراؤں گا۔ کوئی نہ کوئی صورت بناؤنگا۔ اُمیدِ وصال کے ساتھ آتشِ شوق کا بھڑکنا لازم۔ لیکن یہ مار آستین اس شعلہ رو کو دور سے ہی دکھاتا تھا۔ ہاتھ تاپنے نہ دیتا تھا۔ معمولی سا داؤں تھا۔ کہہ دیا بائیسکوپ میں جائیں گی۔ آپ بھی تشریف لے آئیے گا —— اب یہ اپنی اماں نانی خالہ سب کے ساتھ برقعہ اوڑھے بیٹھی ہیں۔ حکیم صاحب نظریں بچا بچا کر دیکھ رہے ہیں۔ بیگم صاحب نے ناتھا سیلانے کے بہانے سے چار انگلیاں پیشانی پر رکھ لیں۔ یہ باغ باغ ہوگئے۔ کبھی ذرا سی نقاب سرکا کر دیکھ لیا۔ جو جو کبھی ایسی ہی مہربان ہوئیں تو بڑھیوں کی طرف سے آڑ کر کے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا دیں۔ بس پھر کیا تھا حکیم صاحب کی ساری محنت وصول ہوگئی۔

جب ان ڈھیل اور کھینچ کے پیچ لڑانے والوں نے دیکھا کہ اب اگر زیادہ کھچائی کی تو گڈی کنّوں سے جائے گی۔ تو اس نونہالِ حُسن کو سیرِ باغ کے لئے لے گئے۔ حکیم صاحب بھی نب۔ موٹر میں ایک طرف جا کھڑے ہوئے۔ یہ پھرتی پھرتی اُتی نظریں بچاتی دومنٹ کو موٹر پاس جا پہنچی۔ حکیم صاحب کو دیکھ کر خوف زدہ ہرنی

کی طرح ٹکٹکیں۔ پھر شرما کر گردن جھکا کر سلام کر لیا۔ اگر موقعہ ہوا تو مزاج پرسی کی بھی نوبت آگئی۔ ان کا گل مراد کھل گیا۔ سیر چمن سے باغ باغ واپس آئے۔

ماسٹر صاحب کا یہ عالم کہ پل پل کی خبریں پہنچائیں۔ لڑکی کا رجحان آپ ہی کی طرف یقیناً ہے۔ میں تو پہلے ہی دن سمجھ گیا تھا۔

آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ جاتے ہیں لفافہ دیکھ کر

آپ کا ذکر آتے ہی چہرہ پرخون دوڑ جاتا ہے میں نے بھی باتوں باتوں میں کچھ تھوڑا بہت قبلوا لیا ہے اور اب تو آپ نے خود بھی نگاہیں دیکھ لیں۔ آنکھ چھلتی ہی نہیں یاری کی۔ اور پھر آپ جیسے نظر باز تھے۔ مختصر حکیم صاحب بیچارے ہر عنوان سے اُلو بنائے جا رہے ہیں۔ گلچھرے اُڑا رہے ہیں ماسٹر صاحب۔ رقم خرچ ہو رہی ہے حکیم صاحب کی۔ رنڈی کی لونڈیا سکھائی پڑھائی۔ پھر مچھلی کی جائی کو تیرنا کون سکھائے۔ حکیم صاحب کی طرف کبھی محبت بھری ...... نگاہوں سے دیکھے۔ پھر خود ہی شرمندہ ہو کر رہ جائے۔ ہونہار تھی۔ اشاروں پر چلنے لگی۔ کچھ ایک بڈھے کو دیوانہ بنانے میں اسے بھی مزا آنے لگا۔ یہ ہمیشہ تھا۔

نوبت بہ اینجا رسید کہ ایک روز ماسٹر صاحب نے حکیم صاحب کی تصویر مانگ لی۔ دینے کو تو انھوں نے بغیر حیل حجت کے دیدی۔ پر برابر پوچھتے رہے کیا کرو گے۔ کیوں لی ہے۔ مدعا کیا ہے۔ کسے دکھانی ہے۔ انھوں نے کچھ نہ بتایا اور تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز یہ بیان دیا کہ ہم نے ان کے ہاں جا ایک کونے میں بیٹھ آپ کی تصویر دیکھنی شروع کر دی۔ پھرتی پھراتی وہ بھی آن پہنچیں بولیں کیا دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کچھ نہیں ایسے ہی ایک دوست کی تصویر ہے

اتنا کہہ کر ایک جھلک ان کو بھی دکھا دی۔ پہچان تو فوراً گئیں۔ لیکن چند ذکر پوچھنے لگیں کس کی ہے۔ ہم نے کہا لائے ہیں ہم کہیں سے۔ کسی بے وفا کی ہے۔ ضد کرکے مجھ سے لے لی دیکھ کر بولی۔ اے یہ تو ہمارے حکیم صاحب ہیں۔ اس کے بعد آپ کی تعریف کرنے لگیں۔ اظہار احسان مندی کیا۔ بولیں میری جان بچائی ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ کاش یہ لونڈی کسی قابل ہوتی۔ ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ زبان سے اظہار منت پذیری تھا۔ آنکھوں سے محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ بڑی دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر میں نے ان سے لے شیروانی کی جیب میں رکھ لی اور شیروانی ان کے سامنے ایک کونے میں لٹکا دی۔ خود وہاں سے تھوڑی سی دیر کو ٹل گیا۔ اب جو آ کر دیکھتا ہوں تو تصویر غائب۔ ہم لگے ادھر اُدھر ڈھونڈنے وہ بھی ٹہلتی ٹہلاتی نکل آئیں۔ بولیں کیا کھو یا گیا۔ میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کسی کی تصویر۔ دل میں چور تھا اور ہے بھی الھڑ بالکل اپلی۔ چہرہ پر ہوائیاں سی تو اڑ گئیں۔ میں بھی ایک کائیاں ڈھونڈتا رہا۔ اور یہ مصرعہ بھی گنگناتا رہا۔ ع

ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

تھوڑی دیر بعد ہم نے کہا جس نے لی ہے اگر خود قبول دے تو ہم پھر جاگے ہوئے چیز اسی کو دیدیں گے۔ ہمارا کیا ہے ہم ایک اور مانگ لیں گے۔ شرما کر بدلی۔ پھر قبلوانے آئی میں کیا مزیداری ہے۔ غرضکہ تھوڑی سی مندم ضد کے بعد تصویر ان کے گریبان سے برآمد ہوئی ---- آپ ہیں قسمت کے دھنی آج ہم بھی قائل ہوگئے۔

آہستہ آہستہ آگ بھڑکتی رہی۔ ہوا دینے والے چنگاریوں کو شعلے بناتے رہے۔ حکیم کا خرمن خرد پھونک گیا۔ دل میں کچھ ایسی لگی جو بجھائے نہ بجھی۔

ایک روز ظالم نے نئی چھوڑی۔ کہنے لگا کئی دن سے ان کے سر میں درد تھا ان لوگوں نے آپ کے علاج سے احتراز کیا۔ ڈاکٹروں واکٹروں کے پاس گئیں۔ کسی طرح افاقہ نہ ہوا تو آخر حکیم کا علاج کرانا چاہا۔ میں نے چھوٹتے ہی آپ کا نام لیا بڑھیا بولی۔ اے ذرا سی بات کے لئے کیا تکلیف دینی۔ کسی اور کو دکھا لیں گے۔ ایک دن میرا ادھر جانا نہ ہوا۔ کل جو پہنچا تو وہ واپس رہی ہے۔

میں نے کہا کسی کو دکھایا تو وہ بیگم خود ہی دبی زبان سے بولیں۔ اچھن میاں کو دکھایا ہے۔ بڑھیا گھریال گھونٹ کر چپ ہو گئی۔

یہ تو ظالم نے افسانہ کی تمہید شروع کی تھی۔ اب دیکھئے اس بنیاد پر یہ نہاد کیا عمارت کھڑی کرتا ہے۔ اور حکیم صاحب کی امیدیں کیوں کر ڈھاتا ہے کیسی کیسی جھنجوڑیاں دیتا ہے۔ اپنی کارگذاری کس کس طرح دکھاتا ہے۔

مجھ کو من وعن یوں معلوم ہوا ہے کہ ان حضرت نے کچھ عرصہ کے بعد کچھ بہت فخریہ انداز میں مجھے سنایا۔

یہاں تک بیان کریں یار زندہ صحبت باقی کہہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر چلا آیا۔

دوسرے دن جاتی بوا چشم براہ بیٹھی تھیں۔ میں نے یوں اندازہ لگایا کہ بار بار مڑ مڑ کر سڑک کی جانب نظر دوڑاتی تھیں جب میں دور سے آتا دکھائی دیا تو جھٹ اٹھ ایک کونے میں جا بیٹھیں۔ میں کہنے کو بے قرار تھا وہ سننے کو بے چین۔

تکلف برطرف۔ سلام دعا کے بعد میں نے داستان شروع کی۔

عیاں ہوا یہ تو گھر کے بھیدی نے ایک مہرہ چلا تھا۔ نقشہ تو دماغ میں اور ہی جما تھا ——— بات یہ تھی کہ جن حکیم صاحب کا انھوں نے نام لیا کہ ان کا علاج شروع ہوا ہے۔ ان سے حکیم جی کی عید تھی۔ قصہ کچھ نہ تھا نہ جائداد کے معاملہ نہ پرگنوں کے۔ ایک رنڈی پہ بات بڑھ گئی۔ اچھن میاں کی اس پر نیت تھی۔ بیچ میں یہ ہمارے والے کباب میں ہڈی کی طرح کود پڑے۔ انھوں نے کہلوا کر بھی بھیجا۔ ادھر سے ٹکا سا جواب دے دیا گیا کہ صاحب کوئی آپ کے نام میں ان کے قبالے تو لکھے ہوئے نہیں۔ بازار کا سودا ہے۔ جو دام دے گا لے گا۔ اچھن میاں کو یہ بات ناگوار گذری۔ اس روز سے دعا سلام بند راہ و رسم ختم۔ ملنا جلنا بالائے طاق۔ ماسٹر جی کو یہ سارا معاملہ الف سے یے تک معلوم تھا۔ اس شاطر نے پہلے ہی سے ایسے کا نام لیا کہ صاحب کی ایڑی سے لگی تو سر سے نکل گئی۔ ——— بولے یار غضب ہو گیا جو وہ چڑی تن کا غلام سا یہ ترپ لگا گیا تو بڑی کرکری ہو گی۔ ……

ماسٹر صاحب نے سب کچھ جانتے بوجھتے پوچھا۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ حکیم صاحب بگڑ کر بولے میاں تم کو نہیں معلوم اس مرک کی اور ہماری پرانی لاگ ڈانٹ چلی آ رہی ہے۔ وہ ہوا یہ کہ چندا کے قصہ میں ہم پہ داؤں کر گئے تھے۔ ٹانپا کا ٹانپتا ہی رہ گیا۔ اور ہم پنچھی کو لے اڑے۔ یہ جو پہنچے تو کابک خالی۔ بڑا ہی ستھرا داؤں ہوا تھا۔ کبھی فرصت میں سنائیں گے۔ سو جب سے یہ خار کھائے بیٹھا ہے۔ ماسٹر یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کا وقت ہے۔ جو خدا نخواستہ یہاں اس کا پتہ چل گیا تو سخت کوفت کی

بات ہے۔ ماسٹر صاحب مونچھوں پر تاؤ دیکر بولے۔ آپ فکر نہ کیجئے جو یاروں کے دم میں ایسا دم ہے تو دو دن میں پتہ کٹوا دوں، تو بات نہیں۔ اب ذرا ان پر رنگ ٹھہرا چڑھانا پڑے گا۔ چاہے سو پچاس بڑھتی ہی کیوں نہ خرچ ہو جائیں۔ حکیم صاحب بولے اب اس کی پرواہ نہ کرو۔ تم جانو عزت کے آگے پیسہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اب تک تو ..... جو اس کمبخت کا یہ داؤں کھرا ہو گیا تو اپنی پوزیشن نیچی ہو جائے گی۔ اور تم جانو اس کی ہمیں تاب نہیں۔

ماسٹر صاحب وہاں سے یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اپنا خود یہی قول ہے کہ جان جائے آن نہ جائے۔ کوئی نہ کوئی ایسا گھسا دوں گا کہ نہیں سے جائے۔ جو اور کچھ نہ بن پڑا تو میں بھی چپڑا کے ہاں کی دوا میں زہر ملا دوں گا۔ جائے گا کہاں ہم سے بچ کے۔ ہزاروں داؤں تو ناخنوں میں پڑے ہیں۔ حکیم صاحب گھبرا کر بولے۔ بھئی ایسا ظلم کبھی نہ کرنا۔ ماسٹر مسکرائے فرمایا۔ لگی ہوئی ہے سرکار کی۔ خدا نے چاہا تو اوپر ہی اوپر پتہ کاٹ دوں۔ ہم نے بھی نہلے پہ دہلہ نہ لگایا تو کیا جم ہی گیا۔

بہرکیف اب گوٹ تو پھنس ہی چکی تھی۔ مزید برآں مہدی سے رقابت آن پڑی۔ حکیم صاحب فرعنی گاہک کی دھونس میں دام بڑھاتے رہے اور سدملی بیعانہ کی رقمیں گھٹواتے رہے۔ ہم کو اڑتی اڑتی خبریں کمو چرسیہ سے ملتیں ایک رات ہم اس کی کوٹھی میں بیٹھے ذکرِ حبیب سے دل بہلا رہے تھے کوئی نو کا عمل ہوگا جو اس کی روٹی لئے وہ خود تشریف لائیں۔ آج گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ اماں مہمان گئی ہوئی تھیں۔ نانی کی ناف ٹل گئی تھی وہ پڑی کراہ رہی

تھیں۔ سو یہ فرض ان کو انجام دینا پڑا۔ ہم باتوں میں محو تھے۔ پاؤں کی آہٹ سنائی نہ دی اور وہ سر پر آن پہنچیں۔ شاید باتیں بھی سنی ہوں کہ ایک دم آواز دادا کھانا لے لینا۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ میں کونے میں دبک گیا۔ کمّو نے ہاتھ باہر نکال کٹورہ لے لیا۔ وہ بولیں اے دادا تم ابھی کس سے باتیں کر رہے تھے۔ جواب ملا کسی سے بھی نہیں۔ فرمایا میں نے خود آواز سنی ہے۔ وہ بھی ایک استاد تھا۔ بولا آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہا ہوں گا۔ بولیں لے مجھے جنے دانے ہو میں نے خود اپنے کانوں سے آواز سنی ہے۔ اب کمّو شیخی میں آ گیا۔ کہنے لگا ہاں وہ ایک گلی کا لونڈا آ گیا تھا اسی سے ذرا باتیں کرنے لگا تھا۔ بیٹا تم جانو کسی طرح وقت بھی کاٹوں۔ فرمایا ہم بھی تو دیکھیں کون ہے۔ اتنا کہہ اور اپنا رُخ روشن دروازہ کے اندر کر دیا۔ ہم سُکڑے سُکڑائے بھیگی بلّی بنے عجب حلیہ سے بیٹھے تھے۔ آنکھ ملا نہ سکے اور وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

تھوڑی دیر بعد پانی کا کٹورہ لائیں اور بولیں لو دادا ٹھنڈا پانی۔ اندر منہ ڈال کر مجھے دیکھ کر فرمایا۔ الٰہی توبہ یہ گلی کا لونڈا ابھی نکلا نہیں۔ کیوں میاں کیا گھر کے قبالے کر جاؤ گے۔ میں نے کہا آپ کا گھر آپ کو مبارک۔ ہم تو فقیروں کی طرح دروازہ پر بیٹھے ہیں، وہ بھی اگر اجازت ہو تو۔۔۔ —— فرمایا بھل منسائی سے تو جان بھی حاضر ہے۔ بیٹھے رہو سائیں۔ میں کہتی ہوں دادا فقیر صاحب کو بھی روٹی کھلا دو میں اور لائے دیتی ہوں۔ بڑھیا ادھر منہ کئے پڑی تھی۔ آج گھر کی مالک یہی تھیں۔ کٹورہ بھر کر سالن نکال لائیں اور ایک جھتّی روٹیوں کی چینی کی طشتری میں ایک چمچہ بھی ساتھ۔ بولیں لیجئے سائیں صاحب ہماری خاطر سے کچھ کھائیے۔ کیا کرتا

پردہ والا گھر ہے۔ اس لئے اندر نہیں بلا سکتے۔ مجبوری ہے۔ معاف کیجئے گا۔۔۔۔

جانی بخدا قسم ہے لو میں نے اس مزے کا سالن پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ رنڈی کے ہاتھ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ بالم کچھ ایسا بھونتی تلتی ہے اور اس غضب کا چٹخارہ ہوتا ہے کہ آدمی ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ جو کسی کو اعتبار نہ ہو تو ایک دفعہ آزما کر دیکھ لے۔ میرا ذمہ جو رنڈی کی ہنڈیا چکھنے کے بعد قائل نہ ہو جائے۔ کیا بتاؤں کچھ لذت ہی جدا ہوتی ہے۔

گھر خالی تھا۔ بڑھیا بیمار۔ دل ملے ہوئے۔ گویا اپنا یار رات کو بڑی دیر تک ڈیوڑھی میں بے تکلف ملاقات رہی۔ ہم بائیسکوپ کی سکنڈ شو کا بہانہ کر گھر سے غائب ہو گئے۔ وہ بڑھیا کو سلا کر آئیں۔ دوران گفتگو میں حکیم صاحب کا بھی ذکر آیا بولیں کیا کروں۔ گھر والوں کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مجھے تو اس کی صورت بری لگتی ہے۔ بال داڑھی میں بھا بھا پھرتا ہے۔ دانت باہر نکلے پڑتے ہیں۔ کنکھیوں کی طرح آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا۔ کمبخت گینڈا کا گینڈا اونا بھینسا بنا ہوا ہے۔ اور بے خبر سمجھتا ہے اپنے کو حسین۔ —— بہر نوع آج ان کی جانب سے بھی کھلا کھلا اظہار محبت ہوا۔ ملنے کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن اپنے سر کی قسم لے لی کہ یہ بات حشر تک نہ آنے پائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ بس میں جانوں یا تم۔ میرے دادا سو یہ کنواں میں جو بات پڑ گئی پھر نکلی نہیں ہمارے گھر والوں کو ان پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اگر بازار جانا ہوا تو بھی وہاں ساتھ رہیں گے پھر تمہیں آنے جانے کی آسانی ہو گی۔ میں نے کہا وہاں تو آپ کے دس گاہک ہوں گے۔ ہماری پھر کب پرسش ہو گی۔ ایسی باتوں کو ٹال جاتی تھی کچھ جواب نہ ملا۔ ماشوقہ

کا ذکر کبھی آیا ہے لگی وہ بھی نیت رکھتے ہیں۔ اپنے ولایت کے قصے سناتے رہتے ہیں۔ یوں رنگ جمانے رہتے ہیں۔ فلاں نواب کی لڑکی مجھ پر مری تھی ایک رئیس کی لونڈیا کو روتا ہوا چھوڑ آیا ہوں۔ کیا پوچھتی ہو دل اب وہیں پڑا ہے۔ ولایت بھی عجب جگہ ہے۔ مجھ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوتیں دی جاتی ہیں غرضکہ دورے وہ بھی ڈالتے ہیں۔ بڑا یار بار قسم کا آدمی ہے۔ حکیم صاحب اس کے پنجوں میں پھنسے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی نیا راگ دیتا ہے۔ اور جس کل چاہتا ہے نچاتا ہے۔ بہلا پھسلا کے ہر مہینہ چار سو پانچ سو کی رقم لاکر نانی کے حوالے کر دیتا ہے ایک دن وہ کہہ رہی تھیں جانے بالا ہی بالا خود کیا اُڑا جاتا ہو گا ——— باتیں کرتے کرتے مجھے دلاسا دے کر جاتیں کہ ابھی آئی ذرا دیکھ آؤں۔ بڑھیا جاگ تو نہیں اٹھی پھر آ جاتیں۔ ڈھائی تین گھنٹے منٹوں کی طرح گذر اور اب ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔ جاتے جاتے ایک دو دفعہ آئے۔ دروازے کے پاس کھڑے کھڑے بھی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ لمحات دل پر کندہ ہیں۔ نہ بھولا ہوں نہ بھولوں گا۔

آخر کار جب یہ سرگرمیاں چل نکلیں اور دس پانچ رائج الوقت چلتی چیزیں یاد ہو گئیں تو کوٹھے کی تلاش شروع ہوئی۔ چاوڑی میں مطلب کی جگہ ملنی آسان تھی ایک صاحب جائداد کے داروغہ صاحب سے نذرانہ کا وعدہ کیا۔ تب کہیں خدا خدا کر کے گلی مرغان کے نکڑ کا کمرہ ملا۔ اس میں ان کی اماں کے ملنے والے شیخ جی نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ اور کچھ خالو نے بھی ہاتھ بٹایا۔ ایسے لوگوں کو بڑھیاں اسی دن کے لئے لگائے رکھتی ہیں۔ بہرکیف سارے انتظامات بھرپور ہو گئے اور یہ بیگم گھر سے نکل کر کوٹھے پر جا براجیں۔

جنگلی کبوتر کا انڈا پالتو کے نیچے بٹھایئے۔ اچھے سے اچھا دانہ کھلایئے۔ دنیا بھر کا چوگا بھرایئے۔ جب تک پر نیچے رہے گا پڑا رہے گا۔ پر پرواز نکلے اور یہ جنگلیوں میں جا ملا ——— وحشی کو اہلی کیا نہیں جا سکتا۔ بازاری گھر والی بن نہیں سکتی۔ وہ تو خون کا اثر ہوتا ہے رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ ——— چوناں گن۔ گی ہی پر پھولتی ہے اور رنڈی کی لونڈیا کو کوٹھے ہی کی ہوا راس ہے۔

شمشاد عرف شمو رنڈی کی بیٹی رنڈی کی نواسی کسبیوں کے گھر میں پیدا ہوئی آنکھ کھول کر وہی ماحول دیکھا۔ اب کچھ عرصہ سے نانی جان توبہ کر بیٹھی تھیں۔ وہ بھی عصمت بی زہے چادر ہی قسم کی۔ اپنی عمر ڈھل گئی۔ گاہک ٹوٹ گئے۔ لڑکیاں سب آدمی کی بچیاں تھیں۔ دوکان چلتی نظر نہ آئی۔ اپنے کونہ میں ہو بیٹھیں ——— اس پر بھی یہ حال کہ نانی اماں بھی اکثر پرانے ملنے والوں سے کوٹھڑی بند کر کے باتیں کریں اور اماں خالہ کے نوشنیچ جی اور بابو جی کھلے ڈنڈے آتے ہی رہتے تھے ——— شمو بھی اب انجان نہ تھی سب کچھ دیکھتی اور سمجھتی تھی۔

کچھ خاندان کا اثر کچھ جوانی کی عمر لچکتی ہوئی امنگیں چھلکتا ہوا شباب۔ کوٹھے پر جاتے ہی شمو نے تو وہ رنگ نکالا کہ یا ید و شاید ——— آٹھ روز کے اندر سارے شہر میں شہرت تھی کوٹھا بھرا رہتا تھا۔ ایک ایک رات میں دو دو مجرے آتے۔ گلا ورثہ میں ملا تھا۔ پھر کچھ اس کی محنت اور سگھڑاپا بھی کاہنا نا چھوکری تو دیکھتے دیکھتے اڑنے لگی ——— گھر میں تو وہی معمولی لٹھا ململ پہننے کو ملتا تھا۔ اب نت نئے ساڑی۔ باڈیس جمپر آتے

لگے۔ کچھ ان کی فرمائشیں کچھ چاہنے والوں کی دلداری۔ زیور سے صندوقچہ بھر گئے۔ کپڑوں سے صندوق۔ ان کا بھی نیا نیا شوق۔ دن میں دس دس جوڑے بدلیں ــــــ ہم عمروں میں آرجار شروع ہوگئی۔ ایک دن زہرہ کے ہاں سنگھار میز دیکھ آئیں۔ شیخ یوسف سے ٹھڑے کھڑے منگوائی ــــــ حکیم صاحب کی آتش شوق رقیبوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھی۔ پھر لونڈیا نے بھی وہ جوبن نکالا کہ حکیم صاحب کا راہوار دل روکے نہ رکا۔ گاہ دوپہر کو بلا لیتے چلتے ہوئے بیس پچیس روپے لفافہ میں بند کر حوالہ کرتے۔

یہ دینے لینے کا سلسلہ یوں شروع ہوا کہ ایک دو مرتبہ تو شمشاد طلبی پر چلی آئی۔ پھر لگی دینے ٹالے بالے۔ یہاں لگی تھی بھرپور۔ ماسٹر صاحب نے کان میں آواز ڈال دی کہ اس کا کوٹھے کا حرج ہوتا ہے۔ حکیم صاحب بولے دن کو کونسے تماشبین آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا حضور آپ کو خبر نہیں دن دہاڑے بھی لُوٹتی ہے اور رات کو تو پھر اندھیر مچاتی ہی ہے۔

زفروغ چہرہ زلفت رہِ دل زند ہمہ شب

چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد

خیر سے ان کی دوکان اچھی چل رہی ہے۔ دن کو بھی بُشنی آتے رہتے ہیں۔ شام تک بچی سو پچاس سمیٹ کر اٹھتی ہے۔ جو بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ پوج کر ہی جاتا ہے ــــــ صاحب میں تو یہ غنیمت سمجھتا ہوں کہ اچھن میاں سے پیچھا چھٹا۔ حکیم صاحب بولے ہاں بھئی وہ تو تم نے سنایا ہی نہیں۔ وہاں کیا داؤں چلے۔ ماسٹر صاحب نے عجب انداز سے کہا۔ قربان جاؤں استاد کے۔ آپ کے

غلام کو ایسی سوجھی کہ چاروں اکھنوں سے گئے۔ ان قدموں کی قسم ایک ہی گھسے میں اڑا دیا۔ ایسا ترپ لگایا میاں یاد کریں گے پتہ ہی کاٹ دیا ——— میں نے کہا یہ کہ ایک دو روز گیا نہیں۔ اُن کا ایک کام اٹکا ہوا تھا۔ جب آدمی بلانے آیا۔ میں نے منہ پر رومال رکھکر بات کی اور کہہ دیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دو چار دن میں آؤں گا۔ اب جو میں گیا تو مزاج پرسی ہوئی۔ میں نے کہا کیا بتاؤں، ناگہانی میں پھنس گیا تھا، نیکی گلے پڑ گئی۔ خدا ہی نے بچا لیا۔ ورنہ ناکردہ گناہ مارے جاتے۔ سچ ہے گر تو ڈرنہ گر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ ان لوگوں نے اصرار کرکے پوچھا کہ خیر باشد کچھ تو کہئے آخر ہوا کیا۔ ہم نے کہا وہ اچھن میاں ہیں نہ بڑے حکیم صاحب بنے پھرتے ہیں۔ جناب نے ایسا طوطا پال رکھا ہے کہ الاماں والحفیظ۔ میری تو اب ڈنڈوت ہے۔ دور ہی سے سات سلام کرتا ہوں بڑی بی مٹک کر بولیں اے اچھن میاں کو اللہ نہ کرے کیا ہو گیا۔ میں نے کہا آپ کو کیا خبر ان حضرت کے اعمال سامنے آرہے ہیں۔ جوانی کی غلط کاریوں کا اب نتیجہ بھگت رہے ہیں اور مجھ کو بھی لعنت خدا میں پھانس لیا وہ تو یہ غنیمت سمجھئے جان بچ گئی۔ نہیں تو اب تک خدا گنج جا پہنچے ہوتے۔

بڑھیا بولی مطلب بتاتے نہیں۔ بات کو طول دئے جاتے ہیں۔ ماسٹر جی تم بھی ہو بڑے تکلّی۔ وہ بھی اس پر ٹھنک کر بولیں اے ہاں ان کے ولایت میں یونہی باتیں ہوتی ہوں گی۔ میں نے کہا بیگم بگڑتی کیوں ہو۔ بتا تو رہا ہوں۔ بات ہے کوئی منہ کا نوالہ تو نہیں۔ آپ کے حکیم صاحب نے خیر سے جوانی میں ایک بڑی بیماری خرید لی تھی۔ ماشاء اللہ عیاشی کے یہی پھل ہوتے ہیں۔ تماشبین

توانھیں تمغہ کہتے ہیں اب ان کی وہ بیماری رفتہ رفتہ منہ تک آگئی ہے اور حلق میں ایک پھپھولے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اپنی ساری دوائیاں آزمالیں کوئی فائدہ نہ ہوا مطبوخ بھی لئے۔ ماء الجبن بھی۔ کالے پیادہ کے بھی جلاب ہوئے۔ پر مرض نہ جانا تھا نہ گیا۔ مجھ کمبخت کو ان کی بیماری کا کیا پتہ تھا۔ کسی کو کیا معلوم کہ ان کے منہ میں سانپ کا سا زہر ملا چھالا ہے۔ وقت کی خوبی مقدر کی بات ایک دن ان کا جھوٹا پانی پی لیا۔ گھنٹہ بھر بعد کھانسی سی اُٹھنی شروع ہوئی۔ نسخہ پیا، افاقہ نہ ہوا۔ حلق کا پتہ نہیں۔ دھسک اُٹھے جائے اور حلق کے اندر کھجلی سی ہو اور آگ لگی رہے۔ آخر ہار جھک مار کر اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو دکھایا۔ وہ ولایت میں ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے تھوک کا معائنہ کرایا۔ پتہ چلا یا دفرنگ کے جراثیم ہیں۔ میں پریشان کہ یا بار خدایا یہ کہاں کا عذاب آیا۔ ڈاکٹر اپنا یار ہی تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا تجھ سے کیا پردہ جیسی چاہے قسم لے لے۔ اب تک تو خدا نے بچا رکھا ہے۔ آگے کی خبر نہیں اور ہم تو پھونک پھونک کر قدم رکھنے والوں میں ہیں۔ اللہ بری گھڑی سے بچائے وہ بولا نہیں تو تم نے کسی ایسے مریض کا جھوٹا پانی پیا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور خیال آیا کہ حکیم صاحب کا بچا ہوا پانی پینے کے بعد یہ تکلیف شروع ہوئی تھی۔ ہم نے بتا دیا ڈاکٹر بولا بے شک انھیں یہ مرض ہے۔ ابھی پندرہ روز ہوئے جب میرے زیر علاج تھے ——— میں نے بھی باتوں باتوں میں حکیم جی سے پوچھا وہ کچھ تھوڑا بہت اگل دئے۔ ڈاکٹر نے ہم کو ہدایت کردی کہ گھر میں کسی سے بات مت کرو۔ جب کسی سے بولو دور فاصلہ سے اور منہ پر رومال رکھکر

سو آپ کے ہاں سے جب کانڑا گیا تو اُس سے بھی ہم نے اسی طرح بات کی۔ بڑھیا بولی ہاں اُس نے آکر کہا تو تھا کہ اللہ جانے ماسٹر جی کے منہ میں کیا ہو گیا ہے۔ رومال رکھکر بات کر رہے تھے۔ میں نے کہا یہی وجہ تھی ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اپنا کھانا پینا بالکل الگ رکھو ابھی ابتدا ہے۔ آسانی سے اچھے ہو جاؤ گے پر کسی اور کو نہ لگا دینا یہ کم بخت ناشدنی مرض بات کرنے سے بھی اُڑ کر لگتا ہے

یہ باتیں سن کر لڑکی کا تو چہرہ اُتر گیا۔ اور نانی جان بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ نتیجہ ظاہر اچھن میاں پر ڈیوڑھی بند۔ حکیم صاحب بولے یار تیرے قدم لے۔ خدا گواہ ہے کاٹے کا منتر نہیں۔ اب وہ گھر تو اُن پر جہنم کو بند ہو گیا۔

ہاں تو لو امیں باتوں باتوں میں کہاں کہاں پہنچ گیا —— ہاں تو ہاں۔ حکیم صاحب گاہ گاہ یاد فرمانے لگے۔ مہینہ دو مہینہ تو یہ قصہ چلتا رہا۔ پر یہ جیب کھپا کی حکیم صاحب کو گراں ضرور تھی ——— عجب مصیبت دل سے پیسہ کبھی نہ نکلے اور دل مانے بھی نہیں۔ آخر یہ تجویز ہوا کہ حکیم صاحب خود وہاں تشریف لے جایا کریں۔ لیکن چاوڑی کا معاملہ ٹھہرا بڑے بڑے ان کو جانیں پہچانیں۔ دن دہاڑے کوٹھے پر چڑھیں تو کیوں کر بات کو موقع نہیں دس اور جیے رہتے۔ پھر چار جاتے تو آٹھ آتے۔ کمرہ بند کروائیں تو یہی قسم کا سوال ——— پر واہ رے ماسٹر یار ہو تو ایسا تو ہو فوراً بولا ایک ترکیب تو میں بتاتا ہوں اگر آپ منظور کر لیں تو ہے بڑا سیدھا لٹکا۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا تو فرمایا۔ آپ غریب خانہ پر تشریف لے آئیں۔ وہاں سے ڈولی میں بیٹھ کر ان کے زینہ پر جا اتریں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔

اوّل تو حکیم صاحب نے اس مضحکہ خیز تجویز پر عمل کرنے سے مطلقاً انکار کیا۔ لیکن پھر قدرے نیم راضی سے ہو گئے۔

برسات کا موسم اُمنگوں کے دن۔ اودی اودی کالی کالی بدلیاں، سیاہ کاریوں کی جانب اُمڈ رہی ہیں۔ رم جھم رم جھم مینہا برسے۔ پپیا ملن کو جیورا ترسے۔ اس موسم میں بوڑھے جوان کی تخصیص نہیں۔ بدلی آئی اور نیت بدلی۔ اپنی اپنی توفیق مطابق سب ہی گُل کھیلتے ہیں۔

حکیم صاحب کا تو پھر پوچھنا ہی کیا گستوں کی خشکی میں جو لگی برسات کی بھیگی ہوئی ہو تو بے آپے ہو گئے۔ اور ترد امنی پر آمادہ ——— دل کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ سچ ہے۔

ہر کسی کی سمجھ میں آ جائیں دل کے ایسے معاملات نہیں

اگر کسی پر طبیعت آ جائے اور وہ من کو بھا جائے تو پھر اور کسی سے اندر والا بہلتا نہیں ——— حکیم صاحب نے گو ایک آدھ زیر علاج طوائف کو بلا لیا۔ باغ میں جلسہ جمایا پر کچھ طبیعت خوش نہ ہوئی۔ بوتلیں لنڈھائیں لیکن روح تشنہ کام رہی۔ نگاہیں کسی اور ہی کی متلاشی تھیں۔

ایک مریض نے جلسہ دیا۔ گلابی باغ میں انتظام ہے۔ گڑھیا ئی چڑھی ہے۔ جھولے پڑے ہیں آتیوں کی نانہ نیق بھری دکھی ہیں۔ اور چار گلعذار جمع سب یار دوست مع صاحب بے تکلف محفل۔ طبلہ گھڑک رہا ہے۔ مینہہ برس رہا ہے۔ ملہار گائے جا رہے ہیں۔ پینگ بڑھ رہے ہیں۔ پھنیاں پھنیاں بارش ہو رہی ہے۔

کپڑے جسم پر چپکے جاتے ہیں۔ دھول سے بدن جھلک رہے ہیں۔ پیمانہ ہائے حسن وعیش چھلک رہے ہیں۔ ایک نظر پی جا رہا ہے تو کوئی جھپا جا رہا ہے۔ جو زیادہ کھلی ہوئی ہیں وہ اشارہ پا نئی نویلیوں کو گدگدا رہی ہیں ——— بوتلوں پر بوتلیں کھل رہی ہیں۔ ساغر گردش میں ہے قسمیں دے دے کر پلایا جا رہا ہے۔ دوئی کا نقش دلوں سے مٹایا جا رہا ہے۔ تکلف اٹھایا جا رہا ہے۔ نہ پینے والے پر سب ٹوٹے پڑتے ہیں۔ زبردستی دھینگا مشتی تک نوبت آتی ہے۔ بالجبر پلائی جاتی ہے ——— دم کے دم میں بارش تیز ہونے لگی۔ ہلڑ سا مچ گیا۔ تو مجھ پہ میں تجھ پہ۔ سب بارہ دری کی طرف بھاگے۔ ایک کا پیر پھسل گیا۔ قہقہوں کی آواز بلند ہوئی۔ گرنے والی نادم۔ تیوری پہ بل۔ ہونٹوں پہ ہنسی کچھ جھپی جھپی کوٹھڑی میں جا گھسیں۔ دوسرا جوڑا بدل باہر آئیں۔ اب سب گیلی یہ شوخی۔ دو چار فقرہ ہوئے۔ ایک بے تکلف نے جا پیچھے سے گلاس الٹ دیا ——— نوکر گرم گرم پکوان لا رہے ہیں۔ گوشت کے پارچے تلے جا رہے ہیں۔ سیخ کے کباب بھی ہیں۔ تکے بھی، شامی بھی موجود۔ ایک ایک کو اپنے ہاتھ سے کھلا رہا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں دل لیا جا رہا ہے۔

اشارہ پاتے ہی سازندوں نے ساز چھیڑا۔ اور مطربہ نے یہ گیت

آنکھوں کی مستی۔ گالوں کی سرخی۔ ہونٹوں کا رس

میاں گھول دے، گھول دے۔ گھول دے۔ ہونٹوں کا رس میاں گھول دے

رندوں کے دل میں آگ لگی ہے مے سے اسے تو بجھا۔ میخانہ کا در ذرا کھول دے

اسے گھول دے۔ گھول دے۔ گھول دے ذرا گھول دے

زیور بھی سے سے۔ تن من بھی لے لے۔ بالا جو بندیا تیرا۔ تو تل تو مجھ کو مول دے
گھول دے۔ گھول دے۔ گھول دے۔ ارے گھول دے
پی کر رہوں گی، پینے چلی ہوں۔ لینا جو ہو آج بول دے
بول دے پیا ذرا بول دے

ابر کے پیچھے ابر، بوند کے پیچھے بوند۔ پھوار پہ پھوار۔ کچھ ایسی مستانہ وار آ رہی تھی جیسے عاشق گریز پا معشوق کے پیچھے ——— جل تھل بھرے تھے۔ ہوا سرسرا رہی تھی۔ دل کی نیا جھکولے کھا رہی تھی۔ حکیم صاحب کے منہ سے بے اختیارانہ نکل گیا ——— ایسے میں اگر آپ بھی آجائیں تو کیا ہو ———

ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ ماسٹر صاحب نے جلسہ دینے والے کے کان میں ڈالی۔ مریض کو معالج کی خوشنودی ہر طرح منظور تھی۔ فوراً موٹر بھیجی گئی، اور بی شمشاد تشریف لے آئیں۔ ——— ———

یہ سب بالا ہی بالا ہوا۔ حکیم صاحب کو کانوں کان خبر بھی نہ تھی۔ اب جو اچانک کمرہ میں یہ چھما چھم کرتی داخل ہوئیں تو حکیم صاحب کا دہن مبارک جو شراب پینے کے لئے کھلا تھا کھلے کا کھلا رہ گیا ——— وہ شرمائی لجائی آنکھیں جھکائے سلام کر ایک کونہ آن کر ہو بیٹھیں ——— حکیم صاحب سکوت بر سکتہ کے عالم میں تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔

جاننے والے جان گئے۔ دیدہ ور پہچان گئے۔ انجانوں نے بھی کچھ نہ کچھ تاڑ ہی لیا ——— رنڈی کی چشم قیافہ شناس، اور پھر دل کے معاملات گانے والی نے بھی راز دل پا لیا۔ سچ ہے آنکھ چھپتی ہی نہیں۔ یاری کی ادھر پھر

طوائف سے ——— حکیم صاحب بوکھلائے سے لونڈا یا لجیائی سی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آپس میں پیار ہے۔ بہر نوع موقع شناس نظر باز مطربہ نے بتا بتا کر یہ غزل گانی شروع کی

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے! اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
ان کو دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک منجم نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

رہا سہا راز اس غزل نے طشت از بام کر دیا ——— پنجاہ سالہ حکیم صاحب بمع ریش و خش دولہا میاں سے بنے بیٹھے تھے اور سامنے چاردہ سالہ دولہن عجب مضحکہ خیز منظر تھا۔ وہ تو کچھ شراب نے ڈھیٹ بنا دیا۔ ورنہ معاملات حدود سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔

دور پر دور چل رہے تھے۔ سینوں میں دل دلوں میں ارمان مچل رہے تھے۔ چہل ہو رہی تھی فقرہ بازی کے زور بندھے تھے ——— نہ شراب کی کمی تھی نہ پینے والے کم ظرف۔ نہ پلانے والے تنگ حوصلہ۔ کوئی ایک مانگے تو دو پلائے۔ اور خیر سے دونوں چڑھا جائے ——— نگاہیں مخمور باتیں بہکی بہکی۔ پیر لغزیدہ دست وپا کا ہوش نہیں ——— طوفانِ طرب بپا تھا اور ہر قدم موج میں بہا چلا جارہا تھا ——— موج سے سر سے اونچی جارہی تھی قُل قُل مینا

اپنی طرف بلا رہی تھی مطرب طرب زا۔ ساز دم ساز۔ طبلہ کی گمک بجلی کی چمک چھال پڑے جھکا جھور۔ سب پئے ہوئے سب رنگے ہوئے۔ ایک حمام میں سب ننگے۔ ہوش میں تھی تو بس یہ نو وارد۔

بد رنگ پتہ رہ نہیں سکتا۔ ساری سہیلیاں اس کو لپٹ گئیں۔ نا نکڑ چل نہ سکی۔ کپڑے سارے شراب میں غرق۔ دو نے پکڑے ہاتھ۔ ایک نے گلاس ہونٹوں سے لگا ہی دیا ——— ان بیگم نے حکیم صاحب کی دہائی دی۔ انھوں نے تنبادتی ڈانٹ بتائی۔ دو رنگی دنیا دکھائی۔ زبان کہہ رہی تھی خبردار۔ آنکھ کا اشارہ تھا تیرا بھلا ہو پلادے۔ مجھے تو عرصہ سے چڑھی ہوئی ہے آج اس کو بھی چمکا دے ——— جب شمشاد بالکل مجبور ہو گئی تو بولی ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں خود پی لوں گی۔ قسما قسمی کے بعد سب الگ الگ ہو گئیں۔ اس نے کہا سازندوں کو یہاں سے اٹھا دو اور مجھے ایک گلاس بنا دو پہلے ساتھ والوں کو بلا آؤں تاکہ انھیں خبر نہ ہو۔ پھر میں بھی پی لوں گی۔

ان بیگم کا جب بلاوا آیا تھا تو ہم کمہتے کے پاس کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم نے بھی سوچا دیکھیں تو سہی جلسہ کیسا ہوتا ہے نوکر ون نے خاں صاحب خاں صاحب ایک طرف کو بٹھا دیا۔ پان سگرٹ حوالہ کیا۔ کمتو تو جہ سس کا دم لگا بیں ہو گیا۔ ہم لگے تماشہ دیکھنے۔

غرضکہ اس ترتیب سے گلاس لے وہ بیگم ہمارے پاس آن پہنچیں اور بولیں بچ نہیں سکتی۔ آؤ شروع کریں ——— ننھی کو انگلیوں میں پکڑ کر ایک گھونٹ اس نے لیا۔ پھر ایک میں نے۔ اس کے بعد گلاس چھوڑ چلی

گئی ـــــ خود بھی پیتی رہی مجھے بھی لالا کر دیتی رہی ـــــ رنڈی اس طرح حق وفا ادا کرتی ہے۔

نو بجے کے قریب جلسہ ختم ہوا۔ گمو بھی چیتا۔ لڑکی کو دیکھا تو ہوش اڑ گئے منہ سے بھبکا آرہا۔ چال لڑکھڑاتی ہوئی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کچھ پی ضرور ہے ـــــ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ادھر بھی طور بے طور نظر آئے ـــــ وہ بھی ایک گھاگ تھا فوراً ماسٹر صاحب کو بلایا۔ بولا میرا تو کچھ نہیں حکیم صاحب کا اعتبار جائے گا اور ساتھ کے ساتھ آپ کا بھی۔ یہ حرکت اچھی نہیں کی۔

ماسٹر جی کو بھی جواب نشیب و فراز نظر آتے تو گھبرائے۔ بولے کیا کرنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں ان کا گھر جانا تو کسی طرح مناسب نہیں۔ ان کی نانی فوراً تاڑ جائے گی۔ اور وہ بھی اگر نہ آئے تو سازندوں کا منھ کون بند کرے گا واہ ماسٹر صاحب اچھا سلوک کیا۔ اپنے ساتھ ہمارا بھی منہ کالا کرایا۔ مجھے تو یہ اطمینان تھا کہ آپ موجود ہیں نہیں تو ایک سکنڈ کے لئے بھی لڑکی کو اس طرح نہ چھوڑتا۔ بتایئے اس کا کورا بدن۔ کورا پنڈا۔ حضرت نے جواسے بوتل کا پانی پلا دیا میں اب کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور خدا جانے بے ہوشی میں کیا ہوا ہو۔ سچ ہے لڑکی کے معاملہ میں کسی مرد کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ اچھے رہے صاحب آپ نے اپنا بن کے دغا کی ـــــ ماسٹر صاحب نے بہت اظہار ندامت کیا۔ اور کہا بھائی حکیم صاحب کے آگے بھلا میری کیا چل سکتی تھی ان کو اس وقت چڑھی ہوئی تھی ویسے تم اطمینان رکھو۔ جیسی چاہے قسم لے لو

میں نے لڑکی کو نظروں میں رکھا مل اتنا قصور ضرور ہوا کہ انھیں دو پگ پلانے گئے ہیں۔ میں نے بہت روکا۔ پر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کمو بہت برہم تھا۔ بولا آپ کو پتہ بھی ہے پہلی دفعہ طوائف کی لڑکی کسی کے ساتھ شراب پیتی ہے تو اس کی رقم کتنی لیتے ہیں۔ آپ اچھے دوست ہیں جو ہمارا نقصان کرا دیا اور منہ دیکھتے رہے۔ ماسٹر نے منت سماجت سے کام لیا۔ ہاتھ پیر جوڑے کہا بھائی اب تو خطا ہو گئی معاف کر دو اور برائے خدا کوئی تدبیر بتاؤ ——— کمو کو اپنی بھی فکر تھی کہ اگر یہ بات کھل گئی تو اس پر بھی بات آئے گی کچھ سوچ کر بولا۔ ایسا کریں کہ اس وقت تو ہم لوگ موٹر میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ جب یہ سب طوائفیں رخصت ہو جائیں گی تو واپس آجائیں گے۔ ایک دو گھنٹہ یہاں اور گزار لیں گے۔ اتنے میں ٹیم لگانے کا وقت بھی نکل جائیگا اور اس نیک بخت کا نشہ بھی کچھ اتر جائے گا۔ لیکن ایک مشکل ہے روپیہ آپ لوگوں نے کل چار گھنٹہ کے دیئے تھے اور وہ بھی دن کے یہ جو ٹیم کا حرج ہوگا اسے کون بھرے گا۔ ماسٹر صاحب بولے اس کی فکر مت کرو۔ میں بیس پچیس روپیہ دوں گا یا دلواؤں گا۔

ماسٹر صاحب نے جا سارا ماجرا حکیم صاحب قبلہ سے کہا۔ انھیں تو خدائی مل گئی۔ وہاں تو آرزو یہی تھی کہ اس وقت یہ محبوبۂ دل پسند کسی عنوان جانے نہیں۔ بیس پچیس کیا بلا تھے اس وقت تو تھیلی کا منہ بھی کھولا جا سکتا تھا ——— خدا کی شان ہے جو مریض کوڑے کی دو اکمسک کمسک کر دے یا کیھوں کو کوڑی کوڑی کو ترسائے۔ ایک پیسہ دانتوں میں پکڑ پکڑ کر خرچ کرے

ایسی کا جب دل آجائے عشق کا بھوت قابو پا جائے تو چاہے جائداد منتقل کرا لو پھر انکار نہیں ——— سب کے جانے کے بعد ان کے ٹکنے کا سن کر باچھیں کھل گئیں۔ ماسٹر صاحب کو شراب لانے کے بہانے سے چٹخانا چاہا وہ بولے ہے تو سہی۔ اور سچ مچ تھی بھی ابھی اچھی خاصی باقی حکیم صاحب نے فرمایا۔ تم تو باؤلے ہوئے ہو شیمپین لائو نئے پر مہر لگائیں گے ——— موئے بے سروڑے۔ بیس اکیس کا اور چپت پڑا۔

حکیم صاحب نے جلدی جلدی سب کو ٹالا اور اب لگے راہ دیکھنے ——— کموکو ڈر تھا کہ ہم دونوں نشیہارے کہیں حدوں سے نہ گزر جائیں، اس کے قابو سے نہ نکل جائیں۔ اور حکیم صاحب کے ڈرائیور کے سامنے بات کھل نہ جائے۔ اس لئے مجھے باغ ہی میں چھوڑ گیا تھا۔

تھوڑی دیر تو حکیم صاحب ٹہلتے رہے پھر لگے بوکھلا بوکھلا کر شراب پینے اس جلسہ کے بعد میں نے سینکڑوں ہی شرابی دیکھے۔ لیکن ان جیسا ٹھری باز پینے والا آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ وہ ظالم تو کچھ اس طرح پیتا تھا جیسے آج کے بعد پھر ملے گی ہی نہیں۔ اور اب بھی کوئی گلاس چھینے کھڑا ہو۔ بھاگ دوڑ مچ رہی ہو گلاس پر گلاس چڑھائے جاتا۔ اور دروازہ کی جانب دیوانہ وار گھور رہا تھا کہ اتنے میں ہورن کی آواز آئی اور یہ نہایت بے تعلقی کے انداز سے گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھے۔ جیسے بے قراری سے انتظار کیا ہی نہیں جا رہا تھا۔

کمو بھی ایک ہوشیار تھا۔ کمرہ کے ایک کونے میں کھونٹا سا گڑا بیٹھا رہا اور ہم بھی اِدھر اُدھر تانک جھانک کرتے رہے۔

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے۔ والا مضمون تھا۔ پانی سامنے تھا اور حکیم صاحب پیاسے۔ اتنے میں شیمپین آگئی۔ ماسٹر صاحب ایک زمانہ شناس بوتل رکھ، بہانہ کر باہر چلے گئے۔ اپنی طرف سے یار کو موقع دے رہے تھے۔ دوسری جانب یہ اطمینان تھا کہ کمو ناگ کی طرح بیٹھا ہے۔ حکیم جی نے اپنے ہاتھ سے الٹ کر کمو کو دی۔ اُس نے انکار کر دیا۔ وہ ذرا بگڑے۔ چھوکری کو کمو موٹر میں سکھا پڑھا کر لایا تھا۔ کسی عنوان پینے پر راضی نہ ہوئی تاہم باتوں باتوں میں حکیم صاحب کا دل خوش کر دیا اور کچھ اس طرح اظہار خلوص کیا کہ یہ لٹو ہو گئے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھا۔ اظہار مجبوری کیا۔ کوٹھے پھر نہ آنے کی شکایت بڑا آدمی ہونے کا طعنہ۔ فرمایا ہم غریبوں کے ہاں کیوں آنے لگے۔ آپ کی بلا سے کوئی راہ دیکھا کرے۔ آپ کا تو جب دل چاہے ہم کو بلا لیں۔ بتائیے بالفرض ہمارا صورت دیکھنے کو جی چاہے تو ہم کیا کریں صاحب۔ عورت ہر طرح مجبور ہے، ——— بڈھے کا دل سینہ میں لوٹن کبوتر بنا تھا۔ کچھ تو پہلے ہی سے گرداں تھے کچھ اس لاسے نے گرویدہ کر لیا۔ لونڈیا نے ایسی چھیپی ماری کہ نکلنا تو دور کنار نکلنے کی کوشش کرنی بھی ناممکن ہو گئی۔ فرمایا نہ آنے کی کیا بات۔ ہزار بار آؤں گا کیا بتاؤں۔ سارا تنہر جانتا ہے۔ ذرا اس سے جھجکتا ہوں ——— پھر بھی

ع مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت

بڑھو پھیلتے جا رہے تھے۔ چھوکری بھی جال پھیلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فرمائش ہوئی کہ اپنے ہاتھ سے پلا دو۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ آنکھیں بچا گلاس منہ سے لگا دیا۔ خدا کی شان چوزہ مرغ بھرا رہا ہے۔ اسے الٹی گنگا

کہتے ہیں۔ یہ منڈی کی دنیا ہے۔ یہاں شکاری شکار ہوتا ہے بعض قادر بے مقدرت نظر آتی ہے۔ گنجشک فرومایہ شاہیں پہ تاک لگاتی ہے۔ لومڑی شیر کو شکار فرماتی ہے۔

غرضکہ دو گھنٹے باتیں کرتے گذر گئے۔ اتنے میں شمو کے نشے اتر گئے اور حکیم صاحب نے بادل ناخواستہ ان کو رخصت کیا۔ موٹر تک پہنچانے آئے۔ بیس روپیہ ماسٹر صاحب کی معرفت ممو کو دلوائے۔ کوئی بارہ کا عمل ہوگا جو ہم گھر پہنچے۔

جس دن سے شمشاد نے چاوڑی میں کمرہ لیا تھا، میں بلا ناغہ گھر دیر سے پہنچتا تھا۔ پہلے کچھ دن تو بہانہ بازی چلتی رہی۔ ایک دوست کے ہاں دعوت ہے۔ سکنڈ شو میں جانا۔ قوالی کا بہانہ۔ کاٹ کی ہنڈیا کب تک چڑھتی۔ ابا کو شبہ ہونے لگا۔ ایک رات ہم کوئی دو بجے کے عمل میں گھر پہنچے۔ اماں نے کنڈی کھولیں۔ ابا ٹہل رہے تھے مجھ پر غصہ کی نظر ڈالی۔ پر کچھ بولے نہیں۔ ہم جا پلنگ پر لیٹ گئے۔ ابا برابر ٹہلتے رہے جب انھوں نے سمجھا کہ میں سو گیا تو اماں سے کہنے لگے کہ تم نے لڑکے کو بگاڑ دیا ہے۔ اگر یہی ڈھنگ رہے تو خاندان کی ناک کٹوائے گا ساری ساری رات باہر رہتا ہے۔ خدا معلوم کہاں کہاں خدائی خوار پھرتا ہے۔ آج کئی کئی مہینہ سے میں یہی رنگ دیکھ رہا ہوں مجھے یہ حرکتیں پسند نہیں۔ تم روک سکو تو روکو نہیں تو ایک نہ ایک دن میں آڑے ہاتھوں لوں گا۔ نہیں تو یاد رکھنا لڑکا ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ زیادہ ڈھیلی ڈوری چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ جو ابھی سے غلط راہ پر پڑ گیا تو ساری عمر ٹھوکریں کھائے گا —— اماں نے کہا تم سمجھتے ہو مجھے فکر نہیں۔ تمہارے

سر کی قسم، رات رات بھر اسی خلجان میں گزر جاتی ہے۔ کیا میرے آنکھیں نہیں ہیں پر کیا کروں اندر والا نہیں مانتا۔ ڈرتی ہوں اگر سختی کی اور کہیں نکل گیا تو کیا کروں گی۔

ابا بگڑ کر بولے۔ جوان ڈراﺋے بھاگنے سے بوڑھا ڈراﺋے مرنے سے۔ مجھے پرواہ نہیں ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ نکل جاﺋے۔ میں جانوں گا جہاں وہ چار مردہ گاڑے اسے زندہ گاڑ دیا۔

ان الفاظ کی اماں تاب نہ لاسکیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ——— بوا اس وقت تک ان آنسوؤں کی قدر نہ تھی اب پتہ چلتا ہے کہ یہ آنسو نہیں ہوتے جگر پانی ہو ہو کر بہتا ہے ——— سچ ہے۔ قدر یا با آں زماں دانی کہ خود با یا فتنوی۔

ایک لڑکا چھت پر کھڑا دھوپ میں گڈی اڑا رہا تھا۔ باپ نے منع کیا وہ نہ مانا۔ بڑے میاں نے بہو کی گود سے ان صاحبزادہ کا بچہ لے وہیں جا کھڑے ہوﺋے۔ وہ بلبلا اٹھا بولا۔ کیا غضب کرتے ہو۔ لو لگ جاﺋے گی۔ بڑے میاں نے کہا اور تجھے نہیں لگ جاﺋے گی۔ تو نے اس کے ساتھ ابھی دو سال جان کھپائی ہے۔ اور ہم نے بیس سال تک تیرے لئے دن رات ایک کئے ہیں۔ لڑکا کوٹھے سے اتر آیا ——— سچ ہے اولاد کے غم میں آنکھ نہیں روتی۔ دل روتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بیٹھا دل مل رہا ہے۔ کلیجہ مسو سے ڈالتا ہو۔ مرد کمر پکڑ کر ہو بیٹھتا ہے۔ عورت کی کوک سے ہوک اٹھتی ہے۔ یہ خانہ ہی جدا ہے اور پھر ماں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس کی تو دنیا اولاد سے وابستہ ہوتی ہے۔ منہ دیکھ کر جیتی ہے۔ وہ خوش ہیں

تو یہ شادماں۔ ان کا بال بیکا ہوا اور اس کی جان پر بنی۔ جب تک چھوٹا رہے رکھوا کرے۔ اسے سوکھے میں سلائے آپ گیلے میں پڑے۔ نہ دن کو دن سمجھے نہ رات کو رات ——— بچہ سو رہا ہے یہ ممتا کی ماری بیٹھی منہ تک رہی ہے۔ جاگ جانے کے ڈر سے پیار نہیں کرتی۔ بچہ سوتے سوتے ڈر گیا۔ اس کے دل کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ کلیجہ سے لگا لیا۔ پروانہ وار نثار ہے۔ بڑی بڑی نفیس مزاجوں کو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دھوتے دیکھ لیا۔ جن نازک مزاجوں کی پلنگ کی چادر میں سلوٹ پڑ جائے تو صبح سسر میں درد موجود۔ اور ماماؤں پر سر گرانی اتری۔ صاحب اولاد ہونے کے بعد انہی کی چھپر کھٹ کی پٹی پر پڑے دیکھ لیا۔ بچہ کو نہالچہ پر سلایا وہ اس پر سے سرک آیا۔ چادر پر چکنا لگ گیا وہاں سوزنی ڈالی۔ اور پڑ رہیں۔ یہ وہی بیگم ہیں جن کی چادر پر کبھی کسی نے دھبّہ نہ دیکھا تھا۔

وہ نازک اندام جو بھاری کنٹھا پہنتے گھبراتی تھیں۔ بچوں کو لادے لادے پھرتی ہم نے خود دیکھ لیں۔ نوکر ماما اللہ کے دیئے سب موجود۔ پر بچہ کی ضد ہے کہ ہم تو امی کی گود میں کوٹھے پر جائیں گے۔ اب یہ ہانپتی جا رہی ہیں اور ایک ایک سیڑھی چڑھتی جا رہی ہیں۔ سارا جوبن گھلا جب ایک بالا پالا ——— منت مرادوں پال پوس کر بڑا کیا۔ زیروں سے شیر ہونے لگے باہر سیر کو جانے۔ جتنی دیر بچہ باہر رہے ماں بیٹھی دعائیں مانگتی رہے۔ گھر آئے تو یہ ممتا کی ماری آنکھیں بچھائے۔ کبھی کبھار دبی زبان سے پوچھ بھی لے میاں کہاں گئے تھے بڑی دیر میں آئے۔ جو صاحبزادے انسانیت کی

جون میں ہوئے تو کہہ دیا ہاں ذرا دوستوں میں دیر ہو گئی، نہیں تو بس اتنی سی بات پر بگڑ گئے۔ اب کھانا نہیں کھاتے۔ گھر بھر منا رہا ہے۔ ماں بیٹھی کر رہی ہے کھانا چنا دھرا ہے جب تک یہ نہ کھالیں گھر والوں کو ٹکڑا توڑنا حرام ——

یہ بادشاہت بھی ماں باپ کے دم تک ہے۔ پھر کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا ہاں اگر بیوی اچھی مل جائے تو ناز برداری ہو جاتی ہے پر یہ تبادلہ کی دنیا ہے یہاں رکھپت رکھاپت کا معاملہ ہے۔ سو دفعہ وہ آپ کے ناز اٹھائیں تو ایک دفعہ آپ کو بھی سہنی پڑتی ہے۔ ماں باپ کی شفقت کی بنیاد ہی قربانی پر رکھی ہیں ہماری خوشی ان کے لئے سب کچھ ہے۔

سو ابا کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی کہ جانوں گا اسے زندہ گاڑ آیا اماں کی ہچکی بندھ گئی۔ اور لگیں چپکے چپکے زار وقطار رونے۔ ابا تھوڑی دیر تو ٹہلتے رہے۔ آخرکار اماں کو دلاسا دینے لگے۔ بولے کہ خوف نہ کرو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ پر اتنا خیال رہے کہ ہاتھی کے دانت نکلے پیچھے اندر نہیں جاتے۔ ایک دفعہ بگڑ گیا تو پھر سدھارا نہ جائے گا۔ ابھی کچی ٹہنی ہے جس طرف چاہو موڑ لو اسی عمر میں بچے بگڑ جاتے ہیں۔ تو اپنی جگہ سمجھا لیجو۔ بس اب دل بھاری نہ کرو اماں بولیں۔ میں جانتی ہوں لڑکا بگڑتا جا رہا ہے۔ بری صحبت میں پھنس گیا ہے۔ تم باپ ہو تمہارا نام اسی سے چلے گا۔ تمہارا فرض ہے کہ اسے روکو۔ پر میں اس کمبخت دل کو کیا کروں۔ جب سے اس کی جان سے دور وہ جا رہے ہیں اور اب سے دور اس کی بیماری دیکھی ہے اندر والے کو کسی بات کی تاب نہیں۔ ذرا کی ذرا میں کبوتر کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ بہتیرا سمجھاتی ہوں نہیں مانتا۔ اللہ جانے کب تک

کی لکھی ہے اور کیا کیا دیکھنا مقدر ہے۔ اب تو وہ مٹی عزیز کردے تو بہتر ہے۔ ابا بولے باؤلی ہوئی ہے۔ اب بڑھاپے میں تجھے دغا دے گی۔ نیک بخت مرنا تھا تو پہلے ہی مرتی۔ میں دس کر لاتا۔ سینکڑوں منہ پھاڑے بیٹھی تھیں۔ پر اب مجھ بڈھے کو کون پوچھے گی۔ —— ابا کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ اور بیٹی اماں ہی کے سامنے ہو گی۔ ہمارے دل کو اطمینان ہو گیا اور آنکھ لگ گئی۔

صبح صبح اماں وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ جو ہم اٹھے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو باہر جانے ہی کو تھے جو انھوں نے اشارہ سے روکا۔ ہم اپنے پلنگ پر ہو بیٹھے۔ ابا کی عادت تھی کہ وہ صبح کی نماز ادا کر ٹہلنے چلے جاتے تھے۔ اس وقت گھر میں میں اور اماں ہی تھے۔ وظیفہ سے فارغ ہو اماں مجھ سے بولیں۔ بیٹا یہ تم رات بھر کہاں غائب رہتے ہو۔ میں نے کہا کہیں بھی نہیں۔ انھوں نے میری جانب عجیب نگاہ سے دیکھا۔ اور کہا۔ میاں یہ کہیں بھی نہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا آخر یہ جو تم رات کے دو بجے آتے ہو تو کہیں نہ کہیں تو یہ وقت گزارتے ہی ہو گے۔

میں۔ ایسے ہی بائیسکوپ وائیسکوپ چلا جاتا ہوں۔

اماں۔ اول تو یہ روز روز کا بائیسکوپ جانا ہمیں پسند نہیں۔ اور جاؤ بھی تو چھ بجے والے میں جاؤ کہ آٹھ نو بجے تک اپنے گھر آ جاؤ۔

میں۔ سیکنڈ شو میں بھیڑ کم ہوتی ہے اس لئے دیر سے جاتا ہوں۔

اماں۔ میاں تم تو کچھ نئی نئی باتیں کرتے جاتے ہو۔ یہی تم تھے۔ یہی بائیسکوپ۔ کچھ دن پہلے تم سدا چھ بجے والے میں جاتے تھے۔

میں۔ جب میں بچہ تھا۔

اماں۔ اور اب خیر سے تم کون سے بڑے ہو گئے۔ بیٹا ہماری نظروں میں تو آج بھی تم بچہ ہی ہو ہاں تم اپنے کو بڑا سمجھنے لگے ہو تو دوسری بات ہے۔

میں۔ تو پھر میں ساری عمر بچہ ہی بنا رہوں گا۔ صاف بات ہے۔ مجھ سے یہ قید نہیں اُٹھے گی۔ اس وقت آؤ۔ اس وقت جاؤ۔ ایسا ہی ہے تو ایک پروگرام بنا دو۔ بس اس کے اوپر قیدیوں کی طرح چلتا رہوں گا۔

اماں۔ میاں تم تو بگڑنے لگے۔ تم کو خدانخواستہ قیدی کون بناتا ہے قیدی تو ہم ہیں کہ تمہارے انتظار میں راتوں کو پڑے جاگتے ہیں۔

میں۔ کیوں جاگتی رہتی ہو۔ کوئی میں کہتا ہوں کہ جاگو۔

اماں۔ نہیں بیٹا تم کو کیا غرض ہے جو ہم کو جاگنے کو کہو۔ یہ بدنصیب دل نہیں مانتا۔ اتنا کہنے کے بعد ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس وقت ان کی آنکھ کی سیپی سے گرے ہوئے موتیوں کا خیال آ کر دل بھر آتا ہے اور اس وقت مجھ بدنصیب کو ان کی اس حرکت پر غصہ آنے لگا دل گھبرانے لگا اور بولا۔

میں۔ دیکھو مجھے اس طرح تنگ نہ کرو۔ نہیں تو کہیں نکل جاؤں گا۔

اماں۔ یہ تو میں جانتی ہی تھی۔ دیکھو ریاض ماں باپ کو ستانا نہیں اچھا ہوتا۔

میں۔ اللہ کرے میں ستانے والا مر جاؤں، خدا کرے میں رہوں ہی نہیں جو تم کو ستاؤں۔

اماں۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ ہمارے دل کو تاب نہیں ہے

ریاض، ہم پر رحم کرو۔

ہوا اس خیال سے میرے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ کاش بدنصیب اولاد کو ماں باپ کی قدر پہلے سے ہو جائے تو دنیا بہشت بن جائے۔ یہ دولت ایک دفعہ جا کر پھر ہاتھ نہیں آتی۔ اور جب چلی جاتی ہے تو انسان ہاتھ ملتا ہے میری اماں زیادہ بولتی نہیں تھیں۔ اتنا کہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ روتی رہیں آنسو بہہ بہہ کر دوپٹہ پر ٹپک رہے تھے اور وہ غم کا مجسمہ بنی بیٹھی تھیں۔ میں تھوڑی دیر تیوری پر بل ڈالے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر چلا آیا۔ اماں نے اتنی آواز اور میرے کان میں ڈال دی کہ یہ باتیں تمہارے باپ کو ناپسند ہیں۔ جو یہ راتوں کو دیر سے آنا نہ چھوڑا تو کسی نہ کسی دن ان کو سمجھانا پڑے گا۔ میں جہاں تک روک سکتی تھی روک چکی۔

اب رات خاصی آگئی تھی اور میں دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے ابوا کے پاس سے اٹھا۔

گھر پہنچا تو بیوی چشم براہ بیٹھی تھی۔ چہرے پر تشویش کے آثار تھے مجھے خلاف معمول دیر ہو گئی تھی۔ میری بیوی نے مجھ سے کبھی شکایت نہ کی تھی یہ تو نہیں کہ میں اتنا اچھا میاں تھا کہ اسے کبھی شکایت کا موقع نہ آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے ہمارا ہر فعل اور ہر عمل قابل اعتراض ہوتا تھا۔ پر بات یہ تھی کہ میں اب تک اس کا نہ ہوا تھا۔ اور شکایت اپنے سے کی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کو سوت کا جلاپا ہوتا ہے۔ لیکن سوت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ وہ شغل جو ہم کو بیوی اور بچوں سے بے خبر کر دے۔ عورت کے لئے سوت ہے وہ اُف نہیں کرتیں لیکن اندر ہی اندر سلگتی ہیں —— لڑکی اپنا سب کچھ تج کر میاں کے گھر آتی ہے۔ زندہ آتی ہے اور مر کر جاتی ہے۔ بیاہی بیٹی کا ماں باپ کے گھر ٹھکانا نہیں۔ بُرا ہو یا بھلا۔ مرنا ہے اور بھرنا ہے۔ فینس پر آتی ہے اور چار پائی پر جاتی ہے۔ ایک اجنبی کے گھر کو اپنا بناتی ہے۔ نازوں کی پالی ناز برداریاں کرتے عمر بتاتی ہے۔ جو میکے میں ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی اس نکٹے کو بٹھاتی ہے۔ ماں باپ جس کی ناک بھوں دیکھتے تھے وہ بہاری نظریں دیکھ دیکھ کر دن گزارتی ہے۔ میاں کی تیوری پر بل آیا اور اسکی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اب پروانہ وار پھر رہی ہے۔ کبھی پان بنا کر لاتی ہے کبھی حقہ بھرے سامنے کھڑی ہے۔ پوچھتی ہے چونا تو زیادہ نہیں۔ آنچ تو ٹھیک ہے۔ اے لو میں الائچی ڈالنی بھول گئی۔ اللہ جلنے یاد پر کیسے پتھر پڑ گئے ہیں ابھی لائی۔ ہم اگر مسکرا دیئے تو وہ کھل گئی یہ وہی بیگم ہیں جنھوں نے میکے میں کبھی پھلی بھی نہیں پھوڑی تھی —— سسرال میں بھی اللہ کا شکر ہے نوکر چاکر ماما دادا سب موجود ہیں لیکن میاں کی خدمت کرنا اس کا دھرم ہے۔ اسے خوش رکھنا اس کا ایمان۔

سسرال والوں کی نرم گرم اٹھاتی ہے۔ کوئی بات بُری لگ جاتی ہے تو منھ ڈھک کر اکیلے میں رو لیتی ہے۔ میاں آیا تو ہنستا نس لٹانس۔ منہ دھو لیا آنکھ پوچھ لیں جو کچھ سرخی انھیں نظر آ گئی تو پوچھ لیا کہ آنکھیں لال کیوں ہیں تو کہہ دیا ننھی کے ہاتھ سے گیند لگ گئی تھی۔ اب تک درد ہو رہا ہے اگر جا ہنے

والے ہوئے تو لگے رومال سے سینکنے۔ انھیں بھر پائے ہوئے ابھی میاں نے دو منٹ بھی یہ مشقت نہ کی تھی جو وہ بولیں۔ بس رہنے دیجئے۔ آپ تھک جائیں گے۔ یہ وہی بیگم ہیں جن کے سامنے رات رات بھر کہانیاں کہی جاتی تھیں۔ جن کے سر میں خادمہ گھنٹوں تیل ڈالتی تھی۔ بگڑ جاتیں تو مہینوں منایا جاتا۔

ہم نے وہ بیویاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں کہ شام ہوئے۔ دولہا میاں آوارگی کو جا رہے ہیں اور بیوی کمریا میں عطر لگا کر انگرکھے کا دامن اور آستین چُن رہی ہیں۔ عطر بھی وہ لگایا جا رہا ہے جو اس صابر و شاکر کی ماں نے بھیجا تھا خود ایک دفعہ بھی نہ لگایا۔ سب میاں کے کپڑوں میں لبسا دیا۔ جو ماں نے کبھی پوچھا تو کہہ دیا ہاں روز لگاتی ہوں ــــــ جب تک میاں صاحب باہر رہے تو خیر مناتی رہی۔ چوں کہ اس کی دنیا تو انہی سے ہے۔ بُرا ہے چاہے اچھا ہے اس اُمید پر جی رہی ہے۔ سب کچھ سہہ رہی ہے کہ کبھی تو خدا سنے گا اور اس کا میاں اس کا ہو کر رہے گا ــــــ نشہ باز میاں بد مست آئے۔ نوکر چاکر سب سو چکے ہیں۔ لیکن اس لونڈی کی آنکھ نہیں جھپکی۔ اپنے ہاتھ سے کھانا چُن رہی ہے۔ پنکھا جھلتی جاتی ہے۔ کھلاتی جاتی ہے۔ خود بھی بناؤ سنگے بیٹھی ہے۔ شاید ایک نظر دیکھ لیں ؏

عمرے گزشت و ما بہ اُمیدِ اشارتے
چشمے بر آں دو نرگسِ جادو نہادہ ایم

غرضکہ میری بیوی نے میرے گھر آ کر سکھ نہ پایا تھا۔ لیکن حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ آیا تھا ــــ عورت کا عیش شوہر کی نگاہِ التفات میں ہے

عورت کو سونے کے چبوترے پر بٹھا دیجئے دنیا بھر کا عیش و آرام دیجئے لیکن اگر میاں کا پیار نہیں ہوا تو اسے کچھ نصیب نہیں اور میری بیوی اب تک اس سے محروم تھی۔ نہ اس لئے کہ میں اسے چاہتا نہ تھا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی اور دل میں اس کی قدر کرتا تھا۔ لیکن یہ عیب میرے گلے میں ایسا پڑا تھا کہ ذاتی شرمندگی مخلا بالطبع ہونے نہ دیتی تھی۔ نہ یگانگت پیدا کرنے دیتی چرس کا دھواں ہمارے درمیان حائل تھا۔ یہ سوت تھی جس نے میری بیوی سے مجھے چھین رکھا تھا۔ یہ دیو معصیت تھا جس نے جنت ارضی کا دروازہ مجھ پر بند کر رکھا تھا۔ اب جب سے اس کے آتشیں چنگل سے میں رہا ہوا تھا۔ میرے اور بیوی کے درمیان سے حجابات اُٹھ گئے تھے۔ آدم و حوا مل گئے تھے۔ وہ مجھے اپنا سمجھنے لگی تھی۔ میں اس کا ہو گیا تھا اور یہ عجیب شیریں خمار تھا۔

وہ ڈرتے ڈرتے مجھ سے ناز کرنے لگی تھی۔ شوخی کی بات کہہ کر میرا منہ تکتی کہ کہیں بُری تو نہیں لگ گئی۔ اکثر عذر بھی پیش کرتی اور کہتی کہ میں بہت بڑھتی جا رہی ہوں خفا نہ ہو جانا۔ میں مر جاؤں گی۔ میں کہتا دیوانی ہو گئی ہے۔ میں اب زندگی کے معنی سمجھ رہا ہوں۔

میری بیوی پر اب شباب آ رہا تھا۔ التفات یوسف اسے زلیخا بنا رہا تھا۔ میں اکثر کہتا کہ تو اب خوبصورت ہوتی جا رہی ہے۔ وہ کہتی آپ محبت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں ـــــ گھر جنت بنا تھا اور ہم آدم و حوا مارِ افیون درمیان نہ تھا۔ یہ خلد مجھے ہاتھ سے جا کر ملی تھی۔ اب جیتے جی نہیں جا سکتی تھی۔

القصہ جب میں گھر پہنچا تو بیوی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے پریشان تو وہ پہلے بھی ہوتی تھی پر میں نہ دیکھتا۔ دل تو اس کا پہلے بھی دُکھتا تھا۔ مگر مجھے محسوس نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں اس کی پہلے بھی جانب در لگی رہتی تھیں لیکن میرے دل کے کواڑ بند تھے۔

اس نے میرے پہنچتے ہی دستر خوان بچھایا۔ کھانا چنا۔ اب تک خود بھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے کہا آخر تم نے کیوں نہ کھالیا۔ بولی دل نہ چاہا۔ یہ مشرقی بیوی۔ اب اوپر او پر کا تار مجھے دبتی جاتی ہے۔ تلچھٹ خود لے رہی ہے۔ ہر چیز میں نہ معلوم طریق سے یہی کوشش کرتی ہے کہ میں اچھا کھاؤں وہ گذر کرے کبھی کبھی نیچی نظروں سے میری جانب دیکھتی جاتی ہے۔ جب میری نگاہ پڑتی ہے تو آنکھیں بچا جاتی ہے۔ میں نے اپنی طشتری اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی اور اس کی اپنے آگے لے لی۔ بولی۔ اے یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا بیگم، میں اندھا نہیں ہوں۔ تم نے بہت دن پتھر کے لئے قربانیاں کر لیں۔ اب ایک قدر دان انسان ان کی قدر کرے گا۔ اور آئندہ گذشتہ کی تلافی کرتا رہیگا کاش کر سکے۔ اس کی نگاہیں زمین پر گڑی تھیں۔ لیکن جسم کا رُواں رُواں اظہار احسان مندی کر رہا تھا۔ میں نے دونوں طشتریوں کا سالن ایک میں کر لیا۔ اور اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا اس کے منہ میں دیا۔ کچھ ایسی شرما سی گئی جیسی نئی نویلی دولہن۔ اس کی شرم آگیں نگاہیں میرے سینہ میں اتری جاتی تھیں۔ حیا پرور ادائیں دل میں کھبی جاتی تھیں۔ مجھے نشہ ہونے لگا۔ کیف کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نشہ میں لذت ہی اور تھی۔ اس سرور میں لطف ہی نرالا

تھا۔ نشہ کا تو میں عادی تھا۔ ولے یہ شراباً طہورہ کا تھا اور میں تسنیم دربغل اس کی تیکھی چتون ادرک کی شراب تھی۔ اُس کی ہنسی دودھ اور شہد —— نظروں ہی نظروں میں مجھ سے اجازت لیتے ہوئے بولی۔ آپ اب وہاں کیوں جاتے ہیں۔ وہ اس موضوع کے قریب کچھ اس طرح آرہی تھی جیسے ہرنی شکاری سے ڈرتی بھی جائے اور پانی کے پاس آئے بغیر رہ بھی نہ سکے۔ میں نے کہا بتا تو چکا ہوں۔ خود بچ گیا ہوں۔ اب ایک اور بھٹکی ہوئی کو بچانے جاتا ہوں۔ بولی، نہ جب سمجھی تھی نہ اب سمجھی۔ اس پہیلی کی اُلجھن کیا ہے —— میں نے اُس کو بُوا کی بابت بتایا۔ اس کی رائے تھی کہ گھر لے آؤ۔ اُس فضا میں رہیں گی تو بچ نہ سکیں گی۔ ماحول بدل دو، فطرتِ سعید عود کر آئے گی۔

دوسرے دن پُروا سرسرائی اور ابر آگیا۔ آسمان پر ایک دھواں سا چھا گیا۔ اس میں بجلی کی چمک جیسے چلم سے شعلہ نکلے۔ کڑک کی پکار جیسے مست کی للکار سیاہ بادلوں میں سے بوندیں کچھ اس طرح گر رہی تھیں جیسے سیہ کار کے بعد جبینِ گناہ سے پسینہ ٹپکے —— میں گھر سے چلنے پر آمادہ ہوا۔ بیوی جانتی تھی کہ ایسی رُت میں رُک نہیں سکتا۔ منع کر نہ سکتی تھی۔ جانے دینے کو دل نہ چاہے۔ عورت کو تدبیر کون سکھائے۔ فوراً بولی کڑھائی کر رہی ہوں، کھا کر جانا۔ میں نے کہا آکر کھاؤں گا، تم فکر نہ کرو۔ میں نے قدم اٹھایا۔ دل کہہ رہا تھا کہ جلدی کر کہیں یہ ابر و باد بُوا کے قدم نہ اکھاڑ دے۔ میری تو دنیا بدل گئی۔ ان کے گرد

وہیں ابھی وہی ماحول ہے —— کہتے ہیں کہ محبت عقل کو راہیں بتاتی ہے۔ اب یہ محبت پر ہے کہ کوئی بھٹکاتی ہے کوئی صراطِ مستقیم دکھاتی ہے۔ عورت جب اپنے مرد کو بُری راہ سے روکنا چاہتی ہے تو اس سے زیادہ بدتر کوئی نہیں۔ بیوی نے مجھے جاتا دیکھ کر ایک اور تدبیر کی۔ بولی میں سوچ رہی تھی بُوا کے لئے بھی لے جاتے پل کی چوتھائی میں تیار کئے دیتی ہوں۔ ذرا چولھا سُلگنے کی دیر ہے —— لکڑیاں برساتی ہوا پاکر سیل گئی تھیں۔ کچھ انہوں نے آگ دیر میں پکڑی کچھ بیوی نے بھی جان بُوجھ کر دیر لگائی۔ یوں دکھاوے کو تو بہت ہاتھ چلا کر کام کیا۔ دو لکڑیاں چولھے میں لگائیں۔ دو باہر اوے میں رکھ دیں کہ گرمی پاکر خشک ہو جائیں۔ اور لگی کلّے پُھلا پُھلا کر چولھا پھونکنے۔ میں نے کہا لاؤ بیبن میں گھول دوں جواب ملا آپ باہر بیٹھئے۔ یہاں دھواں ہو رہا ہے۔ جب اُس نے میری طرف دیکھا تو آنکھیں دھوئیں سے خونِ کبوتر ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا، آج ہم تم مل جل کر پکوان کریں گے۔ منہ سے تو کچھ نہ بولی پر نظریں کہہ رہی تھیں۔ میری قسمت اس قابل۔ میں نے پھکنی ہاتھ سے لے لی اور چولھا سُلگانے ہو بیٹھا۔ اُس نے بِجبینا لگایا، میں نے پھنکائی شروع کی۔ اس فضا نے کچھ ایسا مست کر دیا کہ نہ بُوا یاد رہیں نہ شاہ بڑا اور ہم دونوں کم وبیش دو گھنٹہ بیبن متھتے۔ چولھا سلگاتے اور کڑھائی کرتے رہے —— میں نے آج تک اپنی بیوی کو اس ماحول میں دیکھا ہی نہ تھا۔ خدا کی قسم، عورت کھانا پکاتی جتنی پیاری لگتی ہے اس کا جواب نہیں۔ ہم بیبن متھتے بیٹھے پہلے ہی ہچکولے میرا دھیا باہر وہ مسکرا کر بولی میں کہتی ہوں آپ رہنے دیں جس کا کام اُسی کو ساجے۔ اتنا کہہ میرے۔ اتنا کہہ میرے ہاتھ سے کونڈا لے دم کے دم میں چندن سا کر دیا۔

ہوا سے بال منہ پر آئے۔ ماتھے پر پسینہ تھا وہاں جم گئے۔ اس سگھڑ کے ہاتھ بیسن میں سنے تھے ہاتھ کی پُشت سے ہٹائے۔ نہ پوچھو وہ اس وقت کس درجہ حسین نظر آ رہی تھی۔

میں نے اپنی عمر میں بہت سے شعلہ روآبِ آذر رنگ کے بھڑکائے دیکھے لیکن اس کے عارضِ روشن پر جب آگ کی لپیٹ پڑتی تو وہ کندن کی دمک دیتا تھا اور وہ مِسِ خام تھے، سیندور ملے ہوئے —— ہم پیاز کترنے بیٹھے تو آنکھوں میں ہاتھ لگا لیا۔ خیر سے جو کام مشکل سمجھتے ہمدردی میں آ کر وہ ہی کرنے بیٹھنے اور بگاڑ دیتے۔ کڑاہی میں پھلکی پھینکی تو لگدے کا لگدا چھوڑ دیا۔ غرض کہ ہم کام بگاڑتے رہے، وہ سنوارتی رہی۔ باورچی خانے سے متعلق ہر چیز اس کی فرمانبردار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی انگلیوں کو پہچانتی اور اس کے ہاتھ کو جانتی تھی۔ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لے رہا تھا اور وہ لجائی جا رہی تھی۔ —— کیا کیا بیان کروں اور کب تک بیان کروں۔ اس عیش و نشاط کو دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من —— میں دیکھ رہا تھا کہ بیوی کا دل کسی عنوان نہیں چاہتا کہ میں آج جاؤں لیکن اس کی جبلّی شرافت مجبور کر رہی تھی کہ خود مجھے بھیجے۔

نہایت سلیقہ سے تلوان باندھا اور کہا یہ لیتے جائیے۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ دل میں ہزاروں وسواس آ رہے ہیں ولے خاوند کی خوشنودی سب پر حاوی تھی، اب وہ میرے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب تھی اور میں اس کی ہر ادا سمجھ لیتا تھا —— چلتے چلتے میں نے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کیا تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ اُس نے میری جانب

نظریں اٹھا کر دیکھا جو کہہ رہی تھیں یہ آپ نے کیا کہا جو آپ پر بھروسہ نہ کروں گی تو جیوں گی کیسے میرا ہاتھ آہستہ سے دبا کر کہا۔ جائیے خدا حافظ!

میں بارہ بجے کے قریب شاہ بڑے پہنچا۔

دل میں برسوں سے تھی خلش جس کی

وہ ہی برچھی جگر کے پار ہے آج!

دل میں جو خوف تھا، جس بات کا دھڑکا تھا، وہ ہی سامنے آئی۔ مجھے آنے میں دیر ہوئی، ابر آ گیا۔ دل نرو کا گیا۔ انتظار نے ستایا۔ ماحول نے مجبور کیا —— بُوا نے دم لگا لیا —— میں جب پہنچا تو سرخ سرخ آنکھوں سے میری جانب دیکھا جو کہہ رہی تھیں آپ کا اجارہ نہیں آنا۔ میرا دل چاہا میں نے دم لگایا۔ میں دل کی راجہ ہوں تم آئے کیوں نہیں، کیا انسان اس ماحول میں بچ سکتا ہے۔ اس متبرّدانہ شوخ چشمی پر پتھر لگانے کے لئے میرے سامنے دو کش لئے۔ انہوں نے چلم رکھی اور میں نے اٹھائی۔ منہ سے لگانے کو تھا جو بُوا نے روکا میں نے کہا ڈوبیں گے تو دونوں، تریں گے تو ساتھ۔ جواب ملا مجھ خانماں برباد کے ساتھ اپنا گھر کیوں تباہ کرو۔ میری تو دنیا ختم ہو چکی تمہاری باقی ہے، بیوی ہے بچے ہیں۔ تم ان کا سہارا ہو۔ وہ تمہاری طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ میرا کیا ہے۔ میری دنیا لٹ چکی۔ سانس کا پنچھی جب تک آ رہا ہے آ رہا ہے کچھ دن کی گزارنی ہے ہر طرح گذر جائے گی۔ یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہے کہ نہ میں کسی کا سہارا نہ خود کسی کے سہارے —— میں نے کہا بُوا کیا کہہ رہی ہو، میں تو اس بلا سے نجات پانے میں آپ ہی کا سہارا ڈھونڈتا ہوں۔ یہ الفاظ سن کر انہوں نے مجھے دیکھا نظریں کہہ رہی تھیں، کیا سچ کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا، میرے بال بچوں کی قسمت آپ

کے ہاتھ ہے۔ اتنا کہتے ہوئے میں نے پکوان ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا بیوی نے بھیجا ہے اور سلام کہا ہے —— انہوں نے میری جانب خاص نظر سے دیکھا اور کہا کیا تم نے گھر میں میرا ذکر کر دیا۔ میں نے کہا بے شک! بولیں غضب کیا۔ مجھ جیسیوں کا نام بھی بہو بیٹیوں کے سامنے لینا گناہ ہے۔ اتنا کہہ کر سر جھکا لیا اور کچھ دیر ساکت و جامد بیٹھی رہیں۔ واللہ عالم کیا یاد آرہا تھا۔ حافظہ تصورات کے پردہ پر کیا فلم دکھا رہا تھا۔ بُوا غم خموش کا مجسمہ بنی بیٹھیں تھیں۔ ماتھے کی شکنیں قلبِ شکستہ کا پتہ دے رہی تھیں۔ تیز تیز تنفس طوفان درون کا حال بتا رہی تھی۔

آخر جب اس تلاطم درِ آغوش سکون کی تاب نہ لا سکا تو بولا' بُوا اس میں سے کچھ چکھ لیجئے' بیوی نے اپنے ہاتھ سے تل کر بھیجا ہے۔ سر اٹھایا اور کہا' میں اس کے قابل نہیں کبھی تھی' وہ زمانے یاد آرہے ہیں۔ زمانہ نے وہ ورق الٹ دیا۔ اب بہو بیٹیوں کے ہاتھ کا پکا کھانے کے قابل میرا منہ نہیں۔ میں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس نے تو ابھی مجھ سے کہا تھا کہ بُوا کو گھر لے آؤ۔

مسکرائیں اور بولیں' خدا انھیں خوش رکھے۔ دودوں نہائیں پوتوں پھلیں میاں جیئے۔ کہہ دینا کہ میرا دل تم کو دعا دیتا ہے۔ خدا قبول کرے۔

بُوا کچھ دیر خموش بیٹھی رہیں۔ آنکھوں کا ایک نکتہ پر قیام بتا رہا تھا کہ کسی چھوٹے ہوئے مرکز کی یاد آرہی ہے۔ سینہ میں سانس کی حرکت کچھ ایسی بے تابانہ تھی جیسے پر شکستہ پرندِ یادِ آشیانہ میں تڑپے۔ بند ہونٹ کسی سدِ ورد ماضی کا پتہ دے رہے تھے۔ جبڑے آہنی سلاخوں کی مانند جکڑے تھے۔

اس غم پر شکوہ کا میرے قلب و دماغ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ میں بھی خاصی دیر غیر متحرک

بیٹھا دیکھتا رہا ــــــ دُنیا میں ہر حرکت کے بعد سکون اور ہر سکون کے بعد حرکت لازم ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کر دیا۔ گلگلوں کی غوری میں سب مثل اسب تھے، لیکن ایک سب سے بڑا نہایت کڈھب بدنما الگ جھلی کھا رہا تھا۔ بُوا نے اسے اٹھایا۔ میری طرف دیکھا اور کہا پکوان کرنے میں تم نے کبھی بیگم صاحبہ کی مدد کی تھی میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ خموش ہو گئیں اور پھر آہستہ آہستہ کھانے لگیں۔ اب چونکہ موضوع چھڑ گیا تھا میں نے ان کا دل بہلانے کو باتیں شروع کر دیں۔ بولا بیبن میں نے گھولا اُچوٹھا میں نے جھونکا۔ پیاز کترنے بیٹھا تھا، ہاتھ آنکھوں میں لگ گئے اور وہاں تھوڑا سا بیبن بھی تھنے میں گر گیا۔ وہ بولیں، تم بیٹھے رہو۔ میں دم کے دم میں سب کر لوں گی مجھے اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا برا لگا، سوڈگا چلتی پینے اس میں پانی زیادہ ہو گیا۔ اب جو تجّا مارا تو چھینٹیں اُڑ کر دھائی میں۔ وہ تو خیر ہو گئی وہ بچ گئیں۔ اس کے بعد بُوا میں نے کان پکڑے، پھر سب کام انھوں ہی نے کیا۔

میں باتیں کرتے میں کچھ ایسا منہمک تھا کہ بُوا کی طرف دیکھا بھی نہیں اور بولے چلا گیا۔ اب جو ادھر نظر ڈالی تو اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ پکوان وہ کچھ اس طرح کھا رہی تھیں جیسے کوئی اپنے لختہائے قلب و جگر چبائے۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ جب کبھی روزمرہ کے گھریلو معاملات اور واقعات کا ذکر آتا، بُوا کی حالت غیر ہو جاتی میں اپنی بکواس پر شرمسار ہوا۔ بُوا نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ہاں پھر کیا ہوا۔ میں نے کہا حضور معافی کا خواستگار ہوں، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پر ایسا اثر ہوگا میری طرف دیکھے بغیر انہوں نے کہا۔ اگر جسم کا کوئی حصّہ جل جائے۔ تو اسے تھوڑا اور سینک لینا چاہیئے، پھر چھالا پکتا نہیں۔ تم کہے جاؤ ــــــ جب میں پکوان کی سب تفصیل

سُنا چکا تو بولیں: میں اپنا ماضی بھلا دینا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ ماحول اختیار کیا جہاں گھر ملیہ کوئی شے میرے سامنے آنے نہ پائے۔ آج جب تم یہ پکوان بندھا ہوا لائے میری نظروں میں گھر اور گھر والیاں پھر گئیں۔ مرد نہیں جانتے۔ ہم عورتیں پہچانتی ہیں شریف گھرانہ کی مستورات جس چیز کو ہاتھ لگا دیں۔ اُس پر اُن کی مُہر ثبت ہو جاتی ہے۔ جس طرح یہ برتن باندھے گئے تھے۔ اس طریقہ سے سوائے گھر کی تربیت یافتہ بچی کے اور کوئی باندھ نہیں سکتا۔ مجھے یاد ہے ایک ماما نے میری بقچی میں سے کارچوبی جوڑا چرا لیا۔ پھر اُسے اپنی دانست میں بالکل اسی طرح باندھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بقچی کبھی عید بقرا عید یا شادی بیاہ کے موقعہ پر کھلتی ہے۔ اتنے عرصہ میں بات آئی گئی ہو جائے گی۔ میں جو گھنٹہ بھر بعد کوٹھڑی میں جاتی ہوں تو بقچی کی گرہ اور طرح کی بندھی ہوئی۔ فوراً ماتھا ٹھنکا۔ اب جو کھول کر دیکھا، تو کارچوبی جوڑا غائب۔

آج پہلی مرتبہ تھی جو بُوا کی زبان پر گذری ہوئی داستان آئی۔ میری ہمت افزائی ہوئی۔ امید بندھی کہ ایک نہ ایک دن یہ سینہ میں دبا ہوا دفینہ میرے حصے میں آئیگا۔ یہ قصہ غیر مسموعہ میرے سُننے میں آئے گا۔

میں نے تو اپنی داستان محض اس لئے شروع کی تھی کہ سوئی چبھو کر اس ٹھہرے ہوئے رکارڈ کے دل کی سنوں۔ آج ایک جھلک نظر آئی۔ ڈھارس بندھ گئی اور میں نے اپنی پرانی راگنی الاپنی شروع کی۔ بولا جی بُوا میں نے بیان کرتے کرتے کہاں چھوڑا تھا۔ وہ بولیں شمشاد باغ میں جلسہ میں گئی تھی۔ تم نے پہلی مرتبہ اس کے ساتھ شراب پی۔ گھر دیر سے آئے۔ والدہ نے سمجھایا، تم بگڑے۔ میں نے کہا جی ہاں یاد آ گیا۔ ہاں تو شمشاد اب رنڈی بن چکی تھی۔ جب تک گھر میں تھی خون اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

خاندان کا ماحول کہیں کہیں چھلک جاتا، پھر بھی شرافت کی نقاب۔ پردہ دار گھر کی آڑ اور توبہ کے پردے نے رنڈی کی حقیقت کو حجاب اندر حجاب کر رکھا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، خانگی میں وہ بے باکی نہیں ہوتی جو رنڈی میں ہوتی ہے۔ عورتیں دونوں آوارہ اور عصمت فروش ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ایک کے دروازہ پر پردہ پڑا ہے۔ ایک کا دروازہ ہر آنے والے کے لئے بے حجابانہ کھلا ہے۔ جس طرح مصرعہ تاریخ میں ایک حرف کا تخرجہ اور نامیہ سن بدل ڈالتا ہے بعینہٖ زندگی میں ذرا سی چیزوں کی کمی اور زیادتی انسان کے نظریاتِ حیات بدل ڈالتی ہے۔

مجھے ایک گھرانہ یاد ہے ہم اپنے بچپن میں اُن کی بہت تعریف سنتے تھے، اس گھر کے نوعمروں کی یہ خصوصیت تھی کہ چوبیس گھنٹہ کسی نہ کسی کام میں رندھے رہتے اس کا سبب اُس گھر کی تربیت بتائی جاتی۔ کہتے تھے کہ اُن کے والد نے کبھی گھر میں نوکر ماما نہ رکھے۔ حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ سارا کام بچے کرتے تھے، ہاں اتنا ضرور تھا کہ ہر کام کی اُجرت مقرر تھی۔ ایک بچہ اٹھا اُس نے سارے گھر میں پانی بھر دیا۔ ابا نے ایک پیسہ نذر کیا۔ دوسرے نے جھاڑو بہارو کر دی ایک پیسہ اس کو بھی ملا تیسرے نے پانی ڈال کر چھترانی سے راحت خانہ صاف کرائے۔ انہیں بھی اُجرت ملی آج اسی گھر کے لوگوں کو یہ دیکھتا ہوں کہ ہمہ وقت کولھو کے بیل کی طرح کام کرتے ہیں، لیکن فی سبیل اللہ کچھ نہیں۔ ہر کام میں کچھ نہ کچھ منفعت کا پہلو نظر میں رکھتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں، کان گناہگار ہیں کہ جو اماں کا کفن بھی لائیں۔ تو اس میں سے بھی دو پیسہ بچا کر جیب میں رکھ لیں۔

بہر نوع انور جب تک گھر میں رہی کچھ اور تھی جب سے کوٹھے پر آئی، بدل ہی

کئی ــــــ شمشاد کا رنگ حقیقی تو یہی تھی۔ اب جو اس شمعِ عقل پر سے فانوس اٹھا اور پروانے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے تو حالت ہی اور ہو گئی۔ بیگم نت نئی ادائیں سیکھ گئیں۔ انداز و ادا اٹھائے نہ اٹھیں۔ اٹھلا کر چلے۔ مڑک کر بولے۔ اداؤں میں تلے۔ غمزہ سنبھالے نہ سنبھلیں ــــــ چاہنے والوں کی بھیڑ، عشوہ و غمزہ و ادا کا ہجوم، غرض کہ یہ محفل در آغوش خلوت و جلوت میں گھری سی رہتی ــــــ میری دلداری کا خیال رکھتی، لیکن شاہانہ و ترکانہ ادا کے ساتھ گاہ گلہائے مراد سے دامانِ دل بھر دیتی۔ گاہ مژگان کے خار سینہ کے پار۔ اس زمانہ میں میری زندگی متضاد جذبات کا گہوارہ بنی تھی۔ دل و دماغ جھنجوڑے سے جا رہے تھے۔

شمو روز نت نیا شکار پھانستی۔ حکیم صاحب فتراک میں باندھے جا چکے تھے۔ زلف کے چکر میں آ چکے تھے۔ ماسٹر صاحب روز آتے، پیغامِ سلام لاتے۔

رنڈیوں کو شریفوں کو ذلیل کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔ شاید اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ چونکہ ہم ان کو ذلیل بھی سمجھتے ہیں اور اپنی ہوس رانی بھی انہی سے کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم رنڈی کو اپنے آلہ عیش کی حیثیت سے عالم وجود میں لاتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ ہم کو تختۂ مشق بنا لیتی ہے۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ میں نے ایک بار نہیں بار بار طوائفوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ بڑے بڑے شریفوں کی بھد اڑائی جاتی ہے ــــــ ایک روز شمشاد کے ہاں طوائفوں کی کوئی بے تکلف چھوکریاں میٹھی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں، ایک بولی، ڈپٹی انعام اللہ کے بیٹے احتشام اللہ میرے گھر آنے جانے لگے، باوا جان کو یہ بات گوارا نہ تھی، انہیں خیر سے اپنے ڈپٹی پنے کا غرہ تھا، ایک روز ہم سب کو تھانہ میں بلوا بھیجا۔ جو جو بھی منہ میں آئی، اول فول بکی ہیں

آنکھیں نیچی کیے سنتی رہی۔ خطا بیٹے کی خفگی طوائف پر اتر رہی تھی۔ دام اپنے کھوٹے تھے، دوش پرکھنے والے کو دیا جا رہا تھا۔ پر کرتے کیا، دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ تھانہ کا معاملہ پھر ڈپٹی صاحب کے اثر و رسوخ، وہیں جھنجھنیاں پہنوا دیتے۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی۔ ارشاد ہوا، کان کھول کر سن لو جواب میں نے سنا کہ احتشام نے تیرے کوٹھے پر قدم رکھا تو خیر نہیں ہوگی۔ بڑے گھر میں بیٹھی نظر آؤ گی۔ کہیں اماں جان کے منہ سے اتنا نکل گیا۔ حضور جو وہ خود آئیں تو ہم کیا کریں۔ اب ڈپٹی صاحب آئیں تو جائیں کہاں، ایسی ایسی کہیں جو دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ میں خون کے سے گھونٹ پیتی رہی اور سب سنتی رہی۔ پر دل میں ٹھان لی کہ جو تیرا گھر بے چراغ نہ کیا تو میرا نام بھی مینا نہیں —— احتشام کی آتشِ عشق جتنی بھڑکا سکتی تھی۔ بھڑکائی۔ برسوں ایک پیسہ کی شرمندہ نہ ہوئی۔ اسے خوش رکھنے اور اپنی محبت کا سکہ جمانے اچھے اچھے لکھ پتیوں کو دھتا بتا دی۔ ڈپٹی صاحب کے اثرات شہر تک تھے۔ میں اپر شہر جا بسی۔ احتشام کا کرایہ اپنے پاس سے دیتی ہفتوں اور مہینوں ایسی ایسی مہمانداریاں کرتی کہ کیا کوئی رئیس کرے گا۔ وہ آئے اور میرا گھر اندر کا اکھاڑا بنا۔ دن رات شہر بھر کی طوائفیں جمع دونوں وقت دسترخوان پر دس بیس طرح کے کھانے۔ اور تیس چالیس کھانے والیاں۔ غرض کہ میں نے بھی سنبھال سے خوب راج رچوایا۔ انہی کے ہاتھوں ایک دو چیزیں بازار میں فروخت کرائیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ صاحبزادہ نے باوا جان کو زہر دیا۔ مرنے والا آخر دم احتشام احتشام کرتا رہا۔ ۲ دو دن بیٹے کے مارے ڈھگڈگی میں دم اٹکا رہا۔ دنیا نے آن کر قدر کی پر میں نے اسے اپنے پاس سے مسکنے نہ دیا۔ یہ

جمادی کہ گرفتار کرانے بلا رہے ہیں۔ تم گئے اور پھنسے اس پر بھی مجھے صبر نہ آیا مرنے کے بعد بیٹے کے ساتھ قبر پر گئی اور اُس سے اپنی آنکھوں کے سامنے بڈھے کی گور کو ٹھوکریں لگوائیں اور کہا اب منع کر ہمیں۔ سو بہن یہ تو ہمارا کارنامہ ہے۔ پر کرتی کیا، ڈپٹی بے ایمان کی گالیوں نے میرے سینہ میں وہ آگ روشن کی تھی جو بجھائے نہ بجھتی تھی۔ راتوں کو جاگ جاتی اور رہ رہ کر اپنی لاچاری اور اُس کے ظلم کا خیال آتا۔ میں دھاروں روتی، اپنی بوٹیاں کاٹتی۔ یہ ٹھان لی تھی کہ چاہے میں جان سے جاؤں، پر اس ڈپٹی سے ایسا بدلہ لوں گی جو مرتے دم تک یاد رہے۔ سو اس کی شان کے قربان۔ اُس نے دلوا دیا اور میرے دل میں ٹھنڈک پڑی۔

دوسری بولیں مرزا یوسف کی بیوی کی ریت کا جوڑا جب میں نے منگوا کر پہن لیا۔ تب بات کی۔ تیسری نے فرمایا، مری ہوئی ماں کے ہاتھوں میں جو کڑے اکلوتے بیٹے نے اتارے تھے وہ دوسرے روز ان کلائیوں میں پڑے تھے۔

غرضکہ سب اپنی اپنی کارگذاریاں سنا رہی تھیں اور شمو خموش بیٹھی تھی۔ اس سے اب تک کوئی ایسا بلند مرتبت کارنامہ سرزد نہیں ہوا تھا —— میں بھی ایک طرف بیٹھا تھا، اُس شوخ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کچھ دل میں ٹھانی ہے۔ خدا عشاق کی خیر کرے۔

میں اتنا کہہ کر اُسے وعدۂ فردا کر چلا آیا۔

گھر آ بیوی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ کسی شریف گھر کی ہیں۔ خدا معلوم کن مصائب اور حادثات کا شکار ہو کر ان دھاڑوں کو پہنچی ہیں۔ میں نے

یوں جانا کہ تیرے ہاتھ کی بندش دیکھ اور کڑھائی کا حال سُن وہ تو زار و قطار رونے لگیں۔ منہ سے اتنا نکلا کہ گھر کی پلی بڑھی بچیوں کے ہاتھ کی گرہ ہی الگ ہوتی ہے۔ تجھے لاکھوں دعائیں دے رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تو آپ کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے گھر بے برکت ہے۔ کوئی بڑی بوڑھی نہیں۔ بچّوں کو دوا درمن بھی ٹھیک نہیں ملتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس قابل کہاں۔

دوسرے دن پھر جانے کو تیار ہوا۔ اب بیوی کا اطمینان ہو گیا تھا۔ موسم کبھی کچھ لغزش آفریں نہ تھا۔ میں نے کہا، کل مجھے جانے میں دیر ہو گئی، بُوا نے چرس پی لیا جب میں پہنچا تو میری طرف تیکھی چتون سے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ میں جو چاہوں گی سو کروں گی تم ہوتے کون ہو۔ اگر تم کو میرا خیال ہوتا تو اتنی دیر نہ کرتے۔ میرے سامنے بھی دو کش لگائے۔ میں نے بھی چلم اٹھائی وہ تو بے قرار ہو گئیں، بولے کیا غضب کرتے ہو۔ میرا کیا ہے نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا تمہارے بال بچے ہیں، ان کا خیال کرو۔ ان کی خوشیاں تم سے وابستہ ہیں، بیگم صاحب کیا کہیں گی۔ اپنے سر کی قسم دے کر چلم لے لی۔ میرا ارادہ پینے کا تھا ہی نہیں۔ صرف انھیں دکھا رہا تھا۔ پر میں نے بھی اتنی بات اُن کے کان میں ڈال دی کہ تریں گے تو دونوں ڈوبیں گے تو ساتھ ——— بیوی نے یہ باتیں سُن کر آسمان کی طرف دیکھا۔ زبان خموش تھی۔ نظریں اس مجیب الدعوات سے کچھ عرض کر رہی تھیں۔ جب میں چلا تو دروازہ تک مجھے دیکھتی رہی۔

میں شاہ بڑے پہنچا، بُوا بولیں آ گئے۔ میں نے جواب دیا، حضور کل

دیر کر کے پچھتایا تھا۔ اب ایسی خطا کبھی نہیں ہوگی۔

ہمارا جانا اور داستان شروع ہونا لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ میں نے کہا، عشق کا بھوت سر سے نہ اترنا تھا نہ اترا۔ ہمارا کم بخت دل نہ ماننا تھا نہ مانا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ ہم برابر شمشاد کے کوٹھے پر جاتے رہے۔ راتوں کے دیر سے گھر آتے رہے ــــــ اماں ابا رات رات بھر جاگتے۔ منصوبہ باندھتے۔ ایک دوسرے کے سچے شریکِ غم بُری اولاد کے غم میں دن کاٹتے۔ ہم ماں باپ کی حالت سے بے خبر روز سرِ شام کوٹھے پر جا براجیں۔ دالان میں ایک طرف ممّو کا پلنگ پڑا تھا۔ وہیں ہم بھی بیٹھے رہتے۔ نانی نواسی کے شکار کردہ ایک ہی قفس میں پڑے ایک ہی فتراک میں بندھے ــــــ وہ قفس آشنا تھا، میں نوگرفتار۔ اُس کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ میری ابھی بند ــــــ بیگم کا یہ عالم کہ چوبیس گھنٹے تماشبینوں، چاہنے والوں۔ نازبرداروں میں گھری رہیں۔ ہم بیٹھے راہ تکیں، وہ ہنسی دل لگی میں بسر کریں رات گئے۔ اگر قسمت سے موقع مل گیا تو دس پانچ منٹ کو آگئیں، ہمارا بھی دل بہلا گئیں ورنہ:

محفل ان کی، ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

شمشاد کا یہ عالم تھا۔ ادھر ہمارے اماں ابا نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس کی شادی کر دو۔ شاید سدھر جائے۔ میری سگی خالہ کی لڑکی کوئی سترہ سال کی تھی۔ اماں نے اُن سے ذکر کیا۔ میرے اطوار کچھ پوشیدہ نہ تھے اور جو

ہونے بھی تو میری اماں کسی کو دھوکہ میں رکھنے والی نہ تھیں۔ انہوں نے اول ہی بہن سے کہدیا کہ لڑکا اچھا نہیں ہے پر ہے شریف کی اولاد، آج نہیں تو کل انشاءاللہ راہ پر آجائے گا۔ جب تک ہم دونوں زندہ ہیں، ہر طرح کے ذمہ دار ہیں، اپنے بعد تجھ سے وعدہ کرتی ہوں، اُس کے باپ نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ جو تھوڑی بہت جائداد ہے وہ بہو کے نام کر دیں گے۔ میں جانتی ہوں۔ اینٹ پتھر میاں کا بدل ہو نہیں سکتے پر کیا کریں، ہم اس کے سوا اور کچھ کر نہیں سکتے۔ خدا سے دن رات دعا کرتی ہوں کہ اسے سیدھا راستہ دکھائے۔ ہم دونوں نے یہ سوچا ہے کہ شاید گھر بار بال بچوں میں پڑ کر ٹھیک ہو جائے۔ اب تمہیں سولہ آنے اختیار ہے جو دل ٹھکے تو لڑکی دے دو۔ نہیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ کیا کروں اپنا دھن کھوٹا ہے۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آنکھوں کا تارا بنا کر رکھوں گی ——— چھوٹی بہن بھلا کب انکار کر سکتی تھی۔ کہا، آپا جان میری طرف سے تو لڑکی آپ کی ہو چکی ذرا اس کے باپ سے اور پوچھ لوں۔

چچی نے ڈرتے ڈرتے شوہر سے ذکر چھیڑا وہ بولے، جہاں تیری مرضی ہو کر دے مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ میں ریاض کو اپنا ہی بیٹا سمجھتا ہوں۔ بُرا ہے یا بھلا اپنا ہے۔ آپا کی بات میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔ جو لڑکی کا مقدر اچھا ہے تو ٹھیک ہو ہی جائے گا، نہیں تو اچھے سے اچھا دیکھ کر کر دو گی جو بچی کا مقسوم خراب ہے تو وہاں بھی خرابی پڑ جائے گی میں تقدیر کا قائل ہوں۔ تو آپا سے کہہ دے لڑکی اُن کی ہے جب چاہیں دو بول پڑھوائیں اور لے جائیں۔

ہم کو کسی قسم کی ضمانت نہیں چاہیئے۔ اطمینان رکھو۔ شریف ماں باپ کا ہے۔ ایک نہ ایک دن راہ پر آہی جائے گا۔ خدا کرے میری لڑکی کی قسمت سے ان کا لڑکا درست ہو جائے تو میں جانوں گا۔ میرے بھر پائے ہوئے۔ بیوی نے کہا کبھی اور سوچ لو۔ میرا خیال نہ کرنا۔ جواب ملا باؤلی میں تیری بہن کو اپنی بہن سمجھتا ہوں، جو آج کو اختری کا لڑکا ہوتا اور وہ مانگ ڈالتی تو کیا تو انکار کرتی۔ میں کہتا ہوں، ایک لڑکی کیا ہزار لڑکیاں ہوتیں تو ان پر سے نثار تھیں۔ بھلا اپنے کہیں ملتے ہیں۔ بیوی آب دیدہ ہو گئی۔ سر جھکائے شوہر کے سامنے بیٹھی تھی۔ عمر بھر کی خدمت کا ثمرہ مل رہا تھا۔ انہوں نے محبت سے گلے پر ایک تھپڑ مارا اور اُٹھ کر چلے گئے۔

ماں کے دل کا اللہ ہی مالک تھا۔ آنکھوں دیکھتے آنکھوں کے تارے کو اندھے کوئیں میں کون دھکا دیتا ہے۔ پر ایک پیٹ میں رہنے کی محبت نے مجبور کر دیا۔ مری ہوئی ماں کی دعا یاد آ گئی۔ مرحومہ اکثر دونوں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا کرتی تھیں۔ خدا تم میں محبت اور سلوک دے۔ سوچا چار دن کی زندگی بُرے بھلے ملے دے کٹ جائے گی۔ اگر اس وقت قدم ڈگمگا گئے

تو وہاں ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ بہن نے عمر بھر میں ایک دفعہ انچلا پھیلایا تھا اسے کیسے خالی جانے دوں ——— !

دل پہ پتھر رکھ اللہ پہ بھروسہ کر حامی بھر لی۔

اب ادھر کی سُنئے۔ ہم کو شادی کرنے میں کوئی خاص حذر نہ تھا۔ پھر ہوا یہ کہ خبر شدہ شدہ شمشاد کے کانوں تک پہنچ گئی ——— ہم جو شام کو پہنچے تو بیگم کا سر ریشمی رومال سے بندھا ہوا تھا۔ رومال بھی وہ ہی جو اس غلام نے نذر کیا تھا ——— محترمہ چارپائی بچھائے انگنائی میں لیٹی ہیں۔ شیخ یوسف سر دبا رہے ہیں۔ ہم غریب اپنی حیثیت سے کمتر کے پاس جا بیٹھے۔ اُس سے پوچھا مزاج کیسا ہے۔ بولا دوپہر بعد سے سر میں درد بتا رہی ہے اور کچھ بگڑی بگڑی سی ہے واللہ عالم کیا بات ہے، تم کو بھی دو تین بار پوچھ چکی ہے۔ میں غوطہ میں گیا۔ سوچا، آخر میری پرسش اس طرح بالتکرار کیوں ہوئی ——— تھوڑی دیر بعد شمو کی آواز آئی۔ اے جاتے ہو یا نہیں۔

میں کہتی ہوں، کیسے لیچڑ آدمی ہو، کسی کا دم نکلا جا رہا ہے۔ تم ٹس سے مس نہیں ہوتے ان الفاظ پر شیخ یوسف اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ عسر بدہ جو بولی۔ دیکھو بڑھیا لانا۔ لو یہ

لو یہ پیسہ لیتے جاؤ ـــــ شیخ صاحب آج کل بری طرح پھنسے ہوئے تھے اور خوب اسامی بنائے جا رہے تھے۔ ان کے والد شیخ محمد احمد کو گذرے ابھی ایک سال مشکل سے گذرا تھا کہ صاحبزادہ خوش گذارنی میں پڑ گئے۔ قبول صورت لڑکا تھا، عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی۔ پڑھے لکھے نام کو نہ تھے۔ باپ نے سگرٹس کی ایجنسی میں دولت کمائی تھی۔ بیٹا دھوآں دھار اڑا رہا تھا۔

ان کے جاتے ہی بیگم چارپائی سے اٹھیں۔ مجھ پر ایک نگہ غلط انداز جس میں ترشی اور تلخی کی آمیزش تھی، ڈالتی ہوئی کمرہ میں جا بیٹھیں۔ میں جانتا تھا کہ درد سر نہیں، بلکہ سر گرانی ہے۔ گو اس وقت اس ملکۂ حسن کے حضور کوئی درباری نہ تھا اور میرے لئے میدان خالی، تاہم مصلحتاً کمّو کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا وہ اٹھلاتی ہوئی آئیں اور کمّو کی کوٹھری کے آگے سے قدرے آہستہ خرامی کے ساتھ گذر گئیں۔ اس بار غرورِ حسن نے ہماری جانب اجازت یک نگہ بھی نہ دی۔ اور وہ اپنے آنچلے کو بل دیتی، ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے گذر گئیں۔

رنڈی کی چھوکری کی چال ہی الگ ہوتی ہے۔ کچھ اتراہٹ پنے میں ادائے رقص شامل کچھ بے نیازی میں تصنع کا انداز۔ والہانہ طرز میں خود اعتمادی کا امتزاج غرض کہ وہ ادا دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان نہیں کی جا سکتی۔

اس بپھرے ہوئے انداز اور بگڑے ہوئے تیوروں نے دل تڑپا دیا۔ کھچاوٹ کے ساتھ یہ لگاوٹ بھی تھی کہ میرا ہی دیا ہوا رومال سرفراز کیا گیا تھا۔ دل نہ مانا میں نے جھانک کر دیکھا تو پانی کے مٹکوں کے پاس کھڑی کچھ سوچ رہی تھیں۔ ایک دو منٹ چارپائی پر ٹکیں پھر کمرہ کی طرف چلیں۔ راستہ میں کمّو کی کوٹھڑی کے پاس ٹھٹکیں اور اس سے یونہی کچھ آمد سخن بات کی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ دل نہ مانا، پوچھا، نصیب دشمنان مزاج کیسا ہے۔ بولیں آپ کی بلا سے ـ اتنا کہہ گردن تیوہڑ اسیدھی ہولیں ـــــ

ٹمّو بولا، آج مزاج بگڑا ہوا ہے ـــــ دل نے ہاتھ پکڑ اٹھایا اور میں کمرہ میں اُن کے پاس جا بیٹھا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ میری چاپ سن لی تھی، وے تجاہلِ عارفانہ برتا جا رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے ماتھے پر ہاتھ رکھا وہ چونک سی پڑیں اور میری جانب سے کروٹ لے لی۔ میں نے کہا کیا بات ہے۔ کچھ خفا ہو، جواب ملا، مجھے آپ سے خفا ہونے کا کیا حق۔ میں نے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ یہ آج کیسی نئی نئی باتیں کر رہی ہو شمّو! میری طرف گردن ہلا کر فرمایا۔ میں تو نئی نئی باتیں نہیں کر رہی ہاں، وعدہ خلافوں کے نئے نئے منصوبہ ضرور سُن رہی ہوں ـــــ آخر کار معاملہ کھل گیا کہ وہ میرے شادی کرنے سے ناراض ہیں۔ وہ تو کہتیں میں مجبور، جو بڑے کراتے ہیں سو کرتی ہیں۔ لیکن آپ مرد ذات، مجھ پر کس کا دباؤ ہو سکتا ہے۔ کیوں نہیں انکار کر دیا۔ کیا اتنا صبر نہیں کہ جب ان کے بڑے مرکھپ جائیں تو وہ میرے ورثہ میں آئیں یا میں کسی طرح اس قابل ہو جاؤں کہ ان کے سارے تبرّ کا خاطر خواہ خرچ اٹھاؤں اور وہ میرا دامن پکڑ کر ہو بیٹھیں ـــــ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بہت بگڑی سنوریں۔ مجھے طعنہ بھی دیئے گئے، مردوں کو بے وفا بھی ٹھہرایا گیا۔ نوبت یہاں تک آئی کہ میرا رومال سر سے کھول کر میرے حوالے کرنے لگیں۔ کہا، لیجئے صاحب اپنی امانت، اب تک ہم نے رکھا، اب آپ جس کے ہوں گے یہ اسے مبارک ہو، اتنا کہہ رومال ہونٹوں سے لگا میرے سامنے رکھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے

آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے!

میں نے کرتہ کا دامن پکڑ لیا، نظریں جھکا کر میری طرف دیکھا اور کہا، تم سے

ایسی امید نہ تھی خیر تم بھی کیا کر سکتے ہو، مجبور ہو، یہ آخری فقرہ عجب طنز سے ادا کیا گیا میں نے زبردستی بٹھا لیا۔ بولیں چھوڑو بھی، جب میرا آپ پر زور نہیں تو آپ بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتے ـــــ اتنے دن کی دوستی کا یہ پھل ملا کہ حضور نے ہم کو خبر بھی نہ کی اور بالا ہی بالا شادی کے انتظامات ہو گئے۔ اللہ اللہ، ہم ایسے غیر تھے، کہ ہم سے یہ بات بھی نہ کی۔ ابھی تو خیر سے بیوی کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے جو ہم سے آنکھیں پھیر لیں۔ تم جیسوں سے کس بھروسہ پر دوستی کریں۔ خیر اللہ تمہیں خوش رکھے۔ چاند سی بنو بیاہ کر لاؤ۔ ہمارا کیا ہے۔ یہاں ہم رہے نہ رہے یہ باتیں ہو رہی تھیں جو شیخ یوسف آن وارد ہوئے۔ ہم شمو کے پاس سے کچھ اس طرح خجل اٹھے، جیسے ملازم آقا کی کرسی پر ہو بیٹھے۔ پھر مالک کو آتا دیکھکر چور سا بن کر چلا جائے۔

دل میں سوچا کہ یہ تو دن میں ہزار سے گھلے ملے اور ہم بیٹھے جلا کریں۔ ہماری شادی کرنے پر ایسی تربھر، اتنی خفا، اس درجہ ناراض ـــــ لیکن ان کا وکیل مارِ آستیں ہمارا اپنا دل پہلو میں بیٹھا تھا، فوراً بولا غریب کیا کرے مجبور ہے۔ پاسبانِ عقل یہ بات ماننے سے کچھ گریزاں تھا، لیکن اس عمر میں آخر الذکر کی چلتی نہیں۔

ان کے پاس تو زردار گاہک شیخ یوسف آن پہنچے تھے۔ ان حضرت کو اسی وجہ سے کچھ دیر کو ٹالا گیا تھا کہ مجھ سے بات ہو جائے ـــــ اب وہ بیگم اپنا عندیہ مجھ پر ظاہر کر چکی تھیں۔ عدالت فردِ قرار داد جرم لگا چکی تھی، ملزم کو غور کا موقعہ دینا لازمی تھا، عوطاً ہو اپنا اصلاح کار سے دبک ٹھیر الکو چھر سیا ـــــ نو گرفتار نے آزمودہ قفس و دیر زندانی کی جانب رجوع کیا۔ اس کی رائے تھی کہ ماں باپ کی خوشی کرنی چاہیئے۔

بولا میاں رنڈی کس کی ہوئی ہے جو تمہاری ہو گی۔ یہ عورتیں ایک دو تو تختہ مشق کی طرح لگائے رکھتی ہیں۔ تم شریف خاندان کے ہو۔ باپ کے اکلوتے، ان کا نام تم ہی سے چلے گا۔ ان کو تم سا کوئی نہیں۔ اِس کو تم سے بہتیرے۔ میں کہتا ہوں یاد رکھنا، جب وہ نہیں ہوں گے تو تم بھی انہیں رو ؤ گے۔ ایسے مفت کے خادم بے لوث دوست، حقیقی بہی خواہ، اپنے سے زیادہ چاہنے والے۔ مدت العمر میں ایک ہی دفعہ ملتے ہیں۔ رنڈی کی چاہت دریا کا چڑھاؤ، پھول کی رنگت ہے۔ دیکھتے دیکھتے ختم ان کیلئے عشق بازی ایک فن ہے۔ ہمارے تمہارے لئے جیتے جی کا روگ۔ گھر کے مزے گھر کے ساتھ ہیں۔ وہاں شربت ملتا ہے، یہاں شراب، یہ زہر آب ہے وہ آب حیات صحیح کہ یہ سر کو چڑھ جاتا ہے ہوا س خیرہ کر دیتا ہے انسان بے خود و مدہوش ہو جاتا ہے۔ لیکن خودی کو دے کر بے خودی لینی کس خدا نے بتائی ہے۔ اور میاں میرے جب یہ نشہ اترتا ہے اور کلال ہاتھ کھینچتا ہے اس وقت کی حالت کوئی ان تشنہ کاماں کوئے طوائف سے پوچھے، جن کے ہاتھ سے جام گر چکا ہو۔

ہم کو دیکھو کبھی ایسے دور دورہ تھے کہ بیگم کو چوبیس گھنٹہ ہمارے نام کی تسبیح تھی چنے کی دال پر۔ ہمارا نام لکھ لکھ کر کھایا جاتا تھا۔ اب دیکھو کس حال میں پڑے ہیں رنڈی کی ذات ہری چگ ہوتی ہے۔ سبز باغ دکھا کر متوالا بنا لیتی ہے۔ دیدہ و دل فرش راہ کرتی ہے پھر کچھ اس طرح نظروں سے گراتی ہے کہ دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ اپنے پر نہیں تو اپنے ماں باپ پر رحم کرو میری حالت دیکھو اور نصیحت پکڑو بیوی اور طوائف میں یہ فرق ہے کہ وہ نیک بخت تمہاری ہوتی ہے اور تم رنڈی کے۔

۷

غرض کہ وہ بھی عجیب دور تھا۔ نو عمری کا زمانہ دولہا بننے کا شوق۔ ماں باپ کا اصرار شادی کی طرف مائل کرے۔ رنڈی اپنے طریقوں سے حارج آئے۔ روکے منع کرتے کچھ اس طرح سے اظہارِ محبت کرے کہ باید و شاید۔

شیخ یوسف کو ایک روز ہماری وجہ سے دھتکار دیا۔ —— حکیم صاحب کے پاس کو ماسٹر جی آئے انہیں ٹال دیا —— سہیلیوں سے ہمیں ملایا، ہمجولیوں سے تعارف کرایا —— غرض کہ ہمارا طوطی بول رہا تھا۔ گاہ گاہ ظالم میٹھی میٹھی چٹکیاں بھی لے۔ طعنہ بھی دے۔ کہے اب تو آپ جا رہے ہیں۔ کیا یاد کریں گے کہ کسی کو ہم سے تعلقِ خاطر بھی تھا —— اس چلتر نے اسی دوران میں زہرِ عشق یاد کر لیا۔ ہمیں سنا سنا کر گائے گانے میں بھی ہم کو سامنے بٹھانے لگی۔ آنے جانے والوں پر بھی ایک حد تک یہ بات کھل گئی کہ ان کی طرف مائل ہے —— ہمارے پاس جو بھی روپیہ پیسہ ہوتا گانے میں نذر کرتے۔ چند بار اس نے اپنے پاس سے چھپا کر رقمیں دیں اور کہا، تم دیتے رہا کرو۔ کسی سے نیچا دیکھنا اچھا نہیں، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ —— ایک روز تماشبین گاہک بیٹھے تھے۔ گانا ہو رہا تھا کہ کنٹھے والا آیا۔ شیخ یوسف نے خرید کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ بیگم کو روپیہ دکھایا، جب یہ منظورِ نظر آئیں تو گلے میں ہار پہنانے

انھوں نے کچھ عذر کیا اور چلی آئیں وہ قدرے کبیدہ خاطر سا ہوا ـــــ عبیدہ جو نے مجھے اشارہ کیا کہ تم خریدو۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹالنا چاہا۔ ادھر سے اشاروں ہی اشارہ میں اصرار کیا۔ میں ٹال گیا۔ انجان بن بیٹھا۔ اس فتنہ پرواز نے ناچتے ناچتے شیخ صاحب کے آگے سے کنٹھا اٹھا میرے گلے کا ہار کیا ـــ ہم دل میں خوش تاہم ایک شریف کی تذلیل طبیعت پر گراں ـــــ سچ یہ ہے کہ اس شیخ غریب نے ہمارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ اپنی رقم خرچتا تھا اور نتھا اکیلی تک ٹک ٹک دیدم کی حدوں میں ـــــ اس نازیبا حرکت پر اس کے تیور پر بل آیا۔ اور مجھے تیکھی چتون سے دیکھا، بہر نوع، میں اپنی جگہ بری الذمہ تھا۔ یہ کڑے تیور بے محل معلوم ہوئے اور میں بھی خشمگیں سا ہو گیا۔ اسے اور تو کچھ بن نہ پڑا، تاؤ میں آن لگا روپیہ کی مار دینے۔ جانتا تھا کہ ہم زیادہ دیر میدان میں نہیں ٹک سکیں گے اور سچ یہ ہے کہ اس دن اپنی جیب میں کل پندرہ روپیہ تھے۔ اس نے ایک ایک دفعہ میں ہم کو دکھا دکھا کر پانچ پانچ دس دس سرکانے شروع کئے۔ ہم ایک دو ہلوں میں ہائے بول گئے، وہ سمجھ گئی، پان لینے کے بہانہ باہر گئی اور دو سو کے نوٹ کہیں سے لگا لائی، تھالی کے نیچے رکھ مجھے سرکا دیئے اب کیا تھا چشم چوٹ چلنے لگی، وہ بھی اتنے کے لئے تیار ہو کر نہیں آیا تھا کوئی سو کے قریب پھونک، جل بھُن گھڑیاں گھوٹتا ہوا سیدھا ہو لیا ـــــ

اس دن سے شیخ یوسف سے ایسی ٹھن گئی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ دشمنی اور عناد کا بیج زندگی کے کوٹھے پر ایسا پھیلتا ہے جیسے کوڑی پر چولائی۔ ہمارے توڑ پر وہ بودم بے دال سیدھا منڈلاتا رہا اور ہم بھی اپنی توفیق مطابق گلتے رہے۔

شکار دونوں تھے اور شکاری کے مدِ نظر کچھ اور۔ جس دانہ پر مرغِ نادان لٹو رہے تھے دستِ دانا نے وہ کسی اور ہی مقصد سے ڈالا تھا ـــــ مجھ پر ڈورے اس لئے ڈالے جا رہے تھے کہ شادی سے باز رہوں اور ہمیشہ کے لئے اس کے فتراک سے بندھا پڑا رہوں۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کارے کہ خدا کند فلک را چہ مجال ـــــ ماں باپ اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ جتنا دل اجازت دیتا ڈراتے دھمکاتے، اماں دھاروں روتیں، ہمیں سمجھاتیں بجھاتیں۔ ابا کبھی کڑے تیور ڈالتے کبھی پچکارتے چمکارتے۔ ادھر رنڈی کرنی میں کسر نہیں کر رہی تھی ـــــ کیدِ زن چلتا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ رن رنڈی کے حق میں جاتا نظر آ رہا تھا کہ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا، ہم اپنے خیالات میں غرق گلی میں چلے آ رہے تھے جو کسی نے آن پیچھے سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ہاتھوں کو ٹٹولا تو گٹوں نے پتیلیاں مانجھنے اور کفگیر پھرانے کا صاف پتہ دیا۔ میں نے کہا مسیتا ہے اس نے ہاتھ ہٹا لئے اور بولا، بے تو کیسے پہچانا۔ میں نے کہا پتیلی کے دھوون کی بو آ رہی تھی ـــــ مجھے سرکار نے سر سے پا تک بغور دیکھا، پھر ناک چڑھا کر کچھ اس طرح سونگھا جیسے شکاری کتا خرگوش کی بو لے۔ اور بولے ماشاءاللہ یار خان کے ہاتھو میں سے لکھنؤ والے نواب کی اکلوتی اولاد کو پتیلیوں کے دھوون کی بو آ رہی ہے اور چڈا کو اپنی خبر نہیں دور سے ایسا بھبکا آیا جیسے زلفی لگڑ والا چلا آ رہا ہو۔ میں نے کہا مطلب۔ فرمایا دی تو ہم سے نہ چل، تجھ جیسے لونڈے گھاٹیوں میں پڑے ہیں بڑے بیس مار خاں رنڈی باز بنے پھرتے ہیں۔ محرمی تماشبین۔ جیب میں نہیں کھوٹی

کوڑی جائیں گے طوائف کے ہاں۔ بیٹا چلمیں بھرتے ہو گئے اور تو کسی کام کے تم ہو نہیں۔ ٹل اتی بات ضرور ہے یہ کام کمّو جیسا ہی سکھا سکتا ہے۔ میسیتا بھٹیارے والا بچارہ ان گنوں کا کہاں۔ میں نے بگڑ کر کہا، کیا بکتا ہے.. میں نے آجتک حقہ نہیں بھرا۔ بولا بکرے کی ماں کب تو ڑی خیر منائے گی بڑے کتابوں میں لکھ مرے ہیں رنڈی کے گھر میں تم جیسے فقوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں تجھ جیسے چڑقنایہ کو وہ اب کیا منہ لگاتی ہو گی۔ اس چرسیہ کی کوٹھری میں پڑے دھواں پھلکتے ہو گے۔ میں نے کہا چل بے آجکل تو وہ دور دورے ہیں کہ کیا کسی نواب رئیس کی ہوں گے۔ اب بھی وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ حکم لگا دیا ہے گھنٹہ بھر میں آجانا کھانے پر راہ دیکھوں گی۔ میرے بغیر نوالہ نہیں توڑتی ——— اس مرتبہ اس نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے جھوٹے گواہ پنچ نتر ڈالے اور بولا دی کائی تو ہوا باندھتا ہے تو ہم کو نرا گاؤدی سمجھا ہے۔ ذرا صورت تو بنوا کر آ۔ اور سنئے یہ خوش چرا نیا شدان کے بغیر نوالہ نہیں توڑتی، چل چل ایسی باتوں میں کوئی اور آئے گا۔ ایسے تو سنیاں تم میں لال جڑے ہیں نا۔ یہ بھی دو یاروں کے دم کو دعا جو ان تو ڑی رسائی گرادی ہیں نہیں تو ٹاملک ٹوئیے ہی مارا کرتے اور وہی جو تو سچا ہی ہے تو چل یار خاں کو لیکر ہم بھی تو دیکھیں ہمارا نواب زادہ کیسے راج رہا ہے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں نے کہا ذرا وہاں چلنے کے قابل پہلے حلیہ تو بنوا۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ موری کا بھتنا معلوم ہو رہا ہے تجھ جیسے کو ساتھ لے جا کر مجھے اپنی بھی تھڑی تھڑی کرانی ہے۔

آخر یہ طے پایا کہ میسیتا نہا دھو، کپڑے بدل ہمکو چاوڑی کے نکڑ پر مل جائیگا۔ ہم ذرا کی ذرا نام گنانے صورت دکھانے گھر آتے، ماں کی آنکھیں ہماری

ہر حرکت اور ہمارے ہر فعل کو اس طرح دیکھتیں جیسے چکور ڈھلتے چڑھتے چاند کو دیکھے۔ اس کے بعد ان نظروں کو اور اس دیکھن کو آنکھیں ترس گئیں ـــ ہم دیوانوں کی طرح آتے بادلوں کی طرح چلے جاتے۔ دل پر وحشت تھی سر پر جنون۔ آنکھیں بند تھیں۔ عقل پر پردہ پڑے ہوئے۔ بوعلی سینا کا قول ہے کہ عشق ایک دماغی مرض ہے۔ غالبؔ بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے :-

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

آج جو میں گھر پہنچا تو اماں گلابی رنگ کے دوپٹہ پہ گوٹہ ٹانک رہی تھیں میں اکثر گھر میں کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اگر کھانا ہوتا گنجینہ کھول نکال کر تھوڑا بہت کھا لیتا رات کو آتا تو پڑ کر سوجاتا ـــ میرے آتے ہی ماں کی نگاہیں مجھ پر تھیں، جب گنجینہ کی طرف جاتے نہ دیکھا تو بولیں، کھانا نہیں کھاؤ گے۔ میں نے کہا میری دعوت ہے۔ بولیں ہم نے تو تمہارے مارے اب تک کھایا نہیں۔ اتنا کہہ کر اٹھیں، گنجینہ میں سے کھانا نکالا دسترخوان بچھایا میرے پاس آکر کہنے لگیں، آج تو دو نوالے ہمارے ساتھ کھا لے بیٹا۔ ہم نے آٹھ دن سے تیرے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ میں نے جواب دیا، خواہ مخواہ بھی کھا لوں، میری دعوت ہے، ایک دفعہ کہہ دیا۔ ہزار دفعہ کہہ دیا۔ اس پر نہایت افسردگی سے بولیں۔ تم کو نہیں معلوم تمہارے بغیر ہمارے حلق سے نہیں اترتا۔ تیرے باپ بھی دونوں وقت دسترخوان پر تجھے پوچھ کر دو چار نوالہ زہر مار کر اٹھ جاتے ہیں۔ میں بولا، تو پھر میں کیا کروں۔ یہ اچھی ضد ہے کہ میرے

بغیر کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اب میں نوکروں کی طرح دستر خوان پر حاضری دیا کروں ـــــــ جس وقت اولاد کوئی غلط بات، بری بات، ذلیل بات کرتی ہے اس وقت ماں کی نظر عجیب ہوتی ہے۔ جس میں شفقت، محبت، ترس، تاسف، مجبوری سب کچھ ہوتا ہے۔ آنکھ کہتی ہے بیٹا دیوانے ہوئے ہو۔ میں کچھ منہ سے نہیں کہہ سکتی، تم ابھی بگڑ جاؤ گے اپنے دل میں سوچو، کیا کہہ رہے ہو، ـــــــ بُرا دنیا نے ہم کو ہماری غلطیوں پر بار بار دیکھا، لیکن پھر وہ نظر دیکھنے میں نہ آئی!

القصہ ماں نے مجھے دستر خوان پر بٹھا لیا۔ یہ سب اصرار اس لئے تھا کہ اس سچی چاہنے والی نے میرے لئے ملائی اٹھا رکھی تھی، وہ جانتی تھیں کہ مجھے بھاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھانڈ ڈالی۔ طشتری میرے آگے رکھ دی ـــــــ ہم خود غرض کھا کر اٹھنے لگے۔ بولیں ذرا سی دیر میرے سامنے بیٹھا رہ، تیری صورت کو آنکھیں ترس گئیں۔ مجھے دل بھر کر دیکھ لینے دے۔ مجھ بدنصیب نے کہا، گھنٹہ بھر سے تو دیکھ رہی ہو، اور کتنی دیر دیکھو گی۔ بولیں، بس چلے تو دن رات دیکھوں۔ بیٹا، کیا کروں دل نہیں بھرتا، میاں ہم زیادہ دن نہیں جئیں گے۔ تم اطمینان رکھو، کچھ دن کی رہ گئی ہے گذار لینے دو ـــــــ مجھے برداشتہ خاطر دیکھ کر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور کہا اچھا جاؤ خدا حافظ!

ہم نے غنیمت سمجھا کہ چلو چھٹکارا ملا۔ ان کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم اٹھ چلے آئے۔ بسیتا کھڑا راہ دیکھ رہا تھا، بولا بڑی دیر لگا دی۔ ہم نے کہا ہاں

اماں نے ملائی کھلا نے بٹھا لیا تھا۔ اب بھی بڑی مشکل سے آیا ہوں۔

غرض کہ سرِ شام اسے لے ہم کوٹھے پر پہنچے، تماشبین جمع تھے۔ گانا ہو رہا تھا شمو کارچوبی جوڑا پہنے مرغِ زرّیں بنی بیٹھی تھی۔ حسن پرست، آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے سیم و زر نثار کر رہے تھے۔ ایک کے توڑ پر ایک گل رہا تھا سونا اگل رہا تھا ——— نگاہِ ناز کے امیدوار سب ہی تھے جس کی جانب دیکھ کر ایک شعر گا دیا بس سمجھئے وہ نہال ہو گیا۔ گلِ امید پا گیا۔ اس وقت شیخ یوسف کی کمان چڑھی ہوئی تھی۔ شمو بار بار ان سے نگاہیں ملاتی، التفاتِ خاص فرماتی، یہ تھے کہ ریشہ خطمی ہوئے جا رہے تھے۔ ہم چو من دیگرے نیست کہتی ہوئی نظریں ہر چہار جانب ڈالتی اور پھر اپنی جگہ بھاری ——— اس وقت ہم جو نہ تھے، تو ان کی بن آئی تھی۔ خیر سے ساری بزم پر چھائے وارث علی خاں بنے بیٹھے تھے ——— ایک جانب ماسٹر جی بھی متمکن، لیکن ذرا انگریزی ٹھاٹھ سے۔ یہ ولایت پلٹ تھے۔ ان کی ہر بات میں ایک ادا اور ہر ادا میں کوئی نہ کوئی ولائتی خصوصیت پائی جاتی تھی۔ وطنِ متروکہ کا ذکر ہمہ وقت زبان پر تھا ——— بس تو دم نہ چلا جاتا، لیکن مستیا نے دامن تھاما۔ انور کی چمک دور سے ہی دیکھ کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بولا، وی آلگ لگ رہی ہے ذری یار خاں کو چچائی گر لین دے۔ دی قسم خدا کی یہ تو دن مالا بنی بیٹھی ہے۔ دی حد ہو گئی۔ یہ وہ ہی جانی بوا کی چھوکری ہے جو کل نوڑی ناک پونچھتی پھرتی تھی۔ بس اس کی شان ہے، وہ گوبر میں سے جگنو نکال دے۔ اور کیوں نہ ہو پی بھی تو رہی ہے دھڑ لیں سونا

—— واللہ عالم یہ حضرت کب تک فلسفیانہ تبصرہ فرماتے وہ تو خیر سے پیسہ کا خیال نقدہ حرمتہ کا تخیل انہیں آسمان سے زمین پر لے آیا۔ اور مجھ سے بولے۔ دی یار کچھ پیسے بھی ہیں پاکٹ شریف ہیں، ہم تو خالی خولی ہیں۔ میں نے کہا تو فکر نہ کر، چل تو سہی۔ بولا نہیں یار یہاں رقم والے کا کام ہے۔ یہ ہے رنڈی کا کوٹھا۔ بائیس کوپ کا ٹکس تو بس ایک دفعہ لیا جاتا ہے اور یہاں چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ کمپنی کا کام ہے۔ تو جانے ہم پتلا نہیں موتتے، جلد توڑی اپنی جیب گرم نہیں ہوگی، ہم اندر قدم نہیں رکھیں گے۔ میں نے کہا میرے پاس پیسہ ہیں۔ بولا نہیں یار ویسے تو یاروں میں فرخ ہی کیا، تیری جیب سو میری جیب، گُل اپنی جیب اپنی ہی ہے ——

آخر میں نے دو روپیہ اس کے حوالہ کئے اور کہا جلدی دینے کی ضرورت نہیں، موقعہ محل سے کام کرنا۔

اب میسیتنا تے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنے رُخِ روشن کو آخری ٹچز دیں جیسے بھٹیارا آخر میں رکابی پر ذرا سا تار ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ان حضرت نے بھی دھوئی تلی کے تیل میں شرابور سر پر ہاتھ پھیر سارے منہ کو چکنا لیا واللہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پراٹھوں پکا توا۔ پھر ٹوپی آڑی رکھ سرخ پوتھ کی صدری کو جھٹکا دیے اللہ کا نام لے اندر داخل ہوئے۔ میں نے آگے ہونا چاہا لیکن جناب نے کہنی سے روکا اور خود بدولت مجھا نے ڈنر پھلائے

آگے ہوئے، اپنی رائے میں نواب صاحب رنڈی کے ہاں جا رہے تھے اور یہ ناچیز مصاحب کی حیثیت سے ہم رکاب تھا۔ ٹیکھی چتون، سیاہ رنگ، بھونراسی آنکھیں۔ موٹے موٹے ہونٹ اُن پر پان کی دھڑی۔ گڈ اقد، گدا نہ بدن، سر پر آڑی کار چوبی ٹوپی۔ ایسا معلوم ہو جیسے آبنوسی لٹھ پر طلائی مُوٹھ۔ نیلی بوسکی کی قمیص اس میں سے کالی کالی کوتاہ گردن آشکار جیسے نیل کنٹھ پر کوا سوار۔ پاجامہ خیر سے چوا چکنٹ ـــــ وہ ہوا یہ کہ ان حضرت نے سارے کپڑے تو چپکے چپکے پہن لئے، جب پاجامہ میں ازار بند ڈال رہے تھے تو اماں جان کو آہٹ ہو گئی۔ انہوں نے جو باورچی خانہ میں سے دیکھا تو صاحبزادہ صاحب دولہا بن رہے تھے۔ یہ حضرت میری کم نصیبی سے پاجامہ کا ازار بند نکال چکے تھے، وہ محترمہ دست پناہ لے کر نکلیں۔ انھوں نے راہ فرار اختیار کی، اس لئے ٹانگوں میں پاجامہ میلا ہی رہ گیا، اور وہ بھی بغیر ازار بند کے۔ یہ تھے آٹھوں گھاٹ کمیت فوراً پاجامہ کی ڈُبلی باندھ آن پہنچے۔

اب جو یہ بن مانس نما انسان کمرہ میں داخل ہوا تو رنڈی سمیت سب کی نظریں ان پر تھیں۔ جناب نے مزید حماقت یہ فرمائی کہ جوتی اتار بغل میں مار لی اور ایک ادائے خسروانہ سے سب درباریوں پر نگہ غلط انداز ڈالتے شمو کے پہلو بہ پہلو جا جمے ان کی رائے میں یہی صدر مقام تھا۔ وہ کسمساتی ہوئی قدرے

ایک طرف کو سرکی، یہ کب ماننے والے تھے۔ فوراً مسکوڑا مار آگے کو ہو گئے۔ فرش پر بیٹھنے اور سرکنے سرکانے میں ان کی دبلق ڈھیلی پڑگئی۔ استاد نے صاحبِ موصوف کو گز سے ٹھوکا دیا اور کہا میاں ذرا پرے کو سرکو۔ مسیتا مردود نے استاد جی کو کچھ ایسے تیور سے دیکھا کہ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ انہوں نے شاہانہ انداز سے فرمایا، بدتمیز۔ اب حضرت شمو کی طرف ملتفت ہوئے اور فرمایا، ہاں گائے جاؤ کوئی بات نہیں، ہم سننے ہی آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں تکلّف مت کرو۔ ـــــ نظر ین رنڈی پر ہیں، ہاتھ دبلق پر ـــــ شمو نے میری جانب ملکہ برہم کی طرح دیکھا اور غالب کی یہ غزل شروع کی۔

کوئی صورت نظر نہیں آتی　　　کوئی امید بر نہیں آتی

پہلا مصرعہ مسیتا کی جانب دیکھ کر گایا۔ گو اس موسیقار نے ہنسی ضبط کی و لے تبسم آ ہی گیا۔ اب کیا تھا یہ تو کھل گئے۔ میرا یہ عالم کہ گڑا جاؤں، اس کم بخت کا یہ حال کہ پھیلا جائے۔ جوں جوں خوشی سے اس کی ضخامت بڑھے، دبلق اور ڈھیلی پڑے عجب عذاب میں جان، نادان دوست آفت ہو گیا۔ اس بدتمیز کے ساتھ میں بھی نکو بن گیا۔ لوگ مسکرائیں اُس پر پانی مجھ پر پڑے۔

شمو گا رہی تھی، مجھے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ یاروں کو نقلِ محفل ہاتھ آیا تھا۔ اب وہ اس شعر پر آئی۔

آ گئے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

اس پر جناب ہوش بولے اب اللہ سامانِ تبسم فراہم کر ہی دیتا ہے شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ جناب ہوش رنڈیوں کے شاعر ہیں، کسی کی ماں مری تو مرثیہ موجود۔ کسی کے بھائی کی شادی رچی اور یہ سہرے پہ سہرے لے دوڑے۔ جب طوائف گاتے گاتے تھک جاتی ہے اور قدرے سستاتی ہے تو یہ اپنے کلام سے احباب کا دل بہلاتے ہیں۔ روزانہ رات کو کسی نہ کسی کے کوٹھے پر ٹنگے نظر آتے ہیں۔ اکثر سوداگروں کے نوعمر بچوں کو پھانس کر لاتے ہیں۔ پیغام سلام پہنچاتے ہیں۔ الغرض طوائفوں کے کام کے آدمی ہیں وہ بھی لگائے رکھتی ہیں۔ ہیئتِ کذائی عجیب وحشیانہ ہے۔ گریباں چاک۔ بال بکھرے ہوئے۔ کھویا کھویا سا انداز آواز طباق پھاڑ پائی ہے کم وبیش ایک میل ان کی بانگ بے ہنگام مار کرتی ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یہ شعر گاتے ہوئے شمو نے میری جانب دیکھا اور نہ کچھ دانت پیسے۔ —— اس دوران میں سب بیل دیتے رہے، ٹیکس ادا کرتے رہے لیکن میتا نے ادھر رُخ ہی نہ کیا۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا!   بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

یہ شعر گانے سے پہلے شمو نے میری جانب نظر کی پھر عجب انداز سے اپنی مونگ پھلی سی ناک چڑھا کر میتا کی طرف بگوشۂ چشم دیکھا۔ سب ہنس پڑے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا —— آن پھنسے کے سودے تھے خود کردہ را چہ علاج ہاں یہ ضرور ٹھان لی تھی کہ اب اس مردِ منحوس کو اپنے ساتھ

کبھی نہیں لاؤں گا۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی۔

مقطع کا دوسرا مصرعہ شمو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر گایا:۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی!

خدا خدا کر کے غزل ختم ہوئی۔ اب جناب ہوش پھر چڑھ گئے۔ بولے ایک شعر رہ گیا اس نے کہا وہ کیا، فرمایا:

ملک الموت آج آئے ہیں — دیکھیے موت کس کی ہے آتی

شیخ یوسف نے مبتلا کی جانب گوشۂ چشم سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لکھے برادرِ خورد ہیں تبلیسر سے نے کہا، پھر تو ان سے بھی خطرناک ہوئے آپ نے اللہ میاں کے چھوٹے بھائی کی داستان نہیں سُنی ـــــ بندہ نواز ایک صاحب کسی رئیس کے ہاں اکثر طلبِ زر کیلئے جاتے۔ دستِ سوال دراز فرماتے۔ آخرکار امیر عاجز آگیا، نوکروں کو ہدایت کر دی کہ آئندہ انہیں مت آنے دو۔ یہ دو چار مرتبہ بے نیل و مرام واپس گئے۔ ملازمین نے کہہ دیا کہ آپ پر ڈیوڑھی بند ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے پیٹ بُری بلا۔ آخرکار ان صاحب نے یہ تدبیر نکالی کہ ایک روز اپنے سارے جسم پر مختلف پرندوں کے پر چپکائے۔ اللہ ہو کی ٹوپی زیبِ سر کی اور اس حالت کذائی میں پہنچے۔ رات کا وقت تھا، نواب صاحب احباب کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں فرمارہے تھے۔ ایک کا نڑے صاحب نقلِ محفل بنے تھے! اہل بزم ان پر بولیاں ٹھولیاں اڑا رہے تھے پھبتیاں کس رہے تھے۔ کوئی کہتا ایک بازار بند ہے تو دوسرے فرماتے حضور نہایت منصف مزاج واقع ہوئے ہیں سب کو ایک نظر دیکھتے ہیں، حتیٰ کہ ماں اور بیوی میں بھی امتیاز نہیں۔ کوئی کہتا آیا ہے۔ قرآن میں کان من الکفرین محفل کا یہ رنگ تھا کہ ان فقیر صاحب نے دروازہ پر جا ملازمین کو نہایت کرخت آواز میں حکم دیا کہ نواب صاحب کو اطلاع کرو۔ اللہ میاں کے چھوٹے بھائی تشریف لائے ہیں۔ نوکروں کو بھی شگوفہ ہاتھ آیا

تشریف لائے ہیں۔ ملازمین کو بھی شگوفہ ہاتھ آیا۔ فوراً آن سنایا۔ حکم ہوا بھیج دو۔ سب چشم براہ تھے کہ یہ حضرت بلوائے آن وارد ہوئے۔ نواب نے دریافت کیا جناب کی تعریف۔ فرمایا ہم اللہ میاں کے برخوردار ہیں۔ سب نے کہا ماشاء اللہ سب نے اٹھ کر تعظیم دی۔ چند نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ کچھ چہل کے بعد یہ قرار پایا کہ جب تک آپ کوئی کرامت، معجزہ خرق عادت نہ دکھائیں ہم ایمان نہ لاسکیں گے۔ جواب ملا جو کہو۔ اس وقت وہ بیچارے کانے ہی مد نظر تھے۔ متفقہ طور پر سب نے درخواست کی کہ ان کی آنکھ درست کردیں۔ یہ بولے صاحبان میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ چھوٹا بھائی ہوں۔ بنانا سنوارنا تو بڑے بھائی صاحب کا کام ہے۔ باقی توڑ پھوڑ احقر نے اپنے ذمہ لی رکھی ہے۔ اگر حکم ہو تو دوسری بھی پھوڑ کر دکھا سکتا ہوں ——— سو بندہ نواز یہ ملک الموت کے چھوٹے بھائی ہیں۔

شمشاد پانوں کی تھالی لے کر کھڑی ہوئی۔ جناب ہوش بہ اصرار اُسے مسیتا کی طرف لے کر آئے۔ وہ ظالم بھی تکلف میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ہاتھ میں پان۔ ایک ہاتھ جناب ہوش کے قبضۂ قدرت میں۔ پاجامہ قدموں پر اور یہ مست کھڑے ہیں وہ تو یہ خیریت ہوئی کہ قمیص اچھی خاصی نیچے تھی ——— سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال۔ میں خون کے سے گھونٹ پیتا ہوا اٹھا۔ سیتا کو اس کم بخت کا حال عریاں بتایا۔ اب تک تو وہ ذرا گفتگو میں اپنے گرخنداری پن کو چھپائے تھا۔ پر اب حقیقت کھلی۔ اصلی بولی منہ سے نکلی۔ کہنے لگا دہی تو سے پہلے کہاں چلا تھا———

غضب کا ڈھیٹ تھا۔ استادوں کی جانب منہ کر پھر دبلق کس لی۔ ان غزیلو
نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بولا دی استاد شرماتے کیوں ہو۔ پھر ہماری
جانب ارشاد ہوا۔ دی اس کمبخت کو وخت بے وخت اُترنے کی عادت
ہے ——— ہاں گلے میں دبا اب پھر لو آپ ٹھاٹھ میں آ گئے اور
خانہ زاد پر سگرٹ کا حکم صادر ہوا۔ میں نے ڈبیا پیش کی اور چلنے کا اشارہ
لیکن یہ بھلا کب سر گنے دالا تھا۔ ظالم قبالہ لکھوا کر بیٹھا تھا۔ بیٹھک کا ٹھاٹھ
کہہ رہا تھا کہ مریم پہ ٹلیم نہیں۔ چٹکی میں سگرٹ دبا لگا وہ تو لمبے لمبے دم لگانے۔
اُگالدان قدرے دُور رکھا تھا اور ان کے منہ میں پیک بھری۔ اب مجھے
آنکھ سے اشارہ ہوتا ہے کہ اُٹھا کر لاؤ۔ میں نے کہا خود اُٹھا لو۔ پیک روک
کر یا عمامہ شریف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ اُٹھنے میں ذرا ڈر ہے۔
فر تو جان، مرتا کیا نہ کرتا۔ حضور کے روبرو اُگالدان پیش کیا۔ دہن مبارک
صاف کر نہایت انگریزی انداز سے فرمایا تھینک یو۔ اس دفعہ تو مجھے بھی ہنسی
آگئی۔ اب شمو کی جانب التفات فرمایا۔ بولے یہ ہمارا لنگوٹیا ہے اور تمہارے
عشق میں بس یوں سمجھو بھٹیارے کے چولھے کی طرح یوں ہر وقت سلگتا رہتا
ہے۔ اس پر شمشاد بولی یہ تو جناب گھر کی سی بات کہہ رہے ہیں۔ اس پر
مسیتا نے شمشاد کو آنکھ ماری۔ جس کے معنی تھے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

ہاں ذرا معاملہ چھپائے رکھنا۔ یہ باتیں سب کے سامنے کہنے کی
نہیں ہیں۔ بس ہم جانیں تم جانو۔ وہ ایک شریر، بھلا ماننے والی تھی۔ بولی

پھر تو خیر سے یہ مانس بھی بھکنی کی طرح لینے ہوں گے اور دل بھٹیارے کے دست پنے کی طرح چلتا ہوگا۔ اور کبھی کبھی تو ہنڈیا جلنے کی بھی بو آتی ہوگی۔ مستیا بیٹھا گھڑیاں گھومتا رہا۔ پھر مجھ سے بولا۔ دی تو سمجھا لے۔ نہیں تو اچھی نہیں ہوگی۔ تو جانتا ہے یار خاں بھی اتر سے پتر سے کھول کر دھر دیں گے۔

اس سے پہلے کہ میں شمشاد سے کچھ کہوں وہ پھر بولی آج کمرے میں پتیلیوں کے دھوؤں کی سی بو آ رہی ہے۔ کوئی کمبخت بھٹیارہ تو نہیں آن مرا۔

اب مستیا بگڑ گیا۔ بولا۔ آ گئی نا مالزادی اپنی اوقات پر۔ ہم ٹالی کرتے ہیں ہیں تو سر پر چڑھی جاتی ہے۔ ہیں ہم بھٹیارے۔ کسی کا اجارہ آتا ہے۔ جیم ہیں نادان ہے۔ رنڈی کے کوٹھے پر آئے ہیں۔ اری تو اپنی نانی کو بھول گئی۔ وہ تیل مالش کرتی جنگہ بے جنگہ بچہ جنواتی پھرتی ہے۔ اس کی خبر نہیں۔ یہاں بڑی رئیس زادی بن کر بیٹھی ہے۔ شمشاد تو ضبط کئے بیٹھی رہی۔ لیکن طبلیہ نے گردن میں ہاتھ ڈال ہی دیا۔ اور مستیا پا بدست دگرے دست بدست دگرے وہاں سے نکالے گئے۔ یہ مدافعت ضرور کرتے اور خاصہ ہنگامہ ہوتا لیکن وہ کم بخت دلبق پھر کھل پڑی تھی۔ تاہم چلتے چلتے یہ میراشیر اتنا الٹی میٹم ضرور دے گیا کہ تیری نانی کے برقعہ میں آگ نہ لگائی تو مجھے کلو بھٹیارے کا نہیں کسی چمار کا کہیو۔

اپنے پر یہ مثل سنا کرتے تھے کہ خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔ اصل ہو گئی۔ مستیا بس کی گانٹھ نے ایسا زہر بویا کہ شمشاد کی نظریں مجھ سے پھر گئیں ہم نظریں وہ بے زارہ۔ اس پر اس پتنگہ نے یہ اور غضب ڈھایا کہ ایک دن جانی۔

کے برقعہ میں تیزابہ لگا ہی دیا۔

ہوا یوں کہ یہ کھٹالا گو۔ بڑھیا وقت بے وقت آیا جایا کرتی تھی۔ ایک روز موقعہ پا ظالم نے گلی کے اندھیرے حصّہ میں چپکے چپکے آ برقعہ پر پچکاری سے تیل چھڑک دیا۔ سلائی دکھا دی۔ خدا بھلا کرے بائیس کوپ کا۔ اس نے سارے داؤں سکھا دئے ہیں۔ بیٹے نے منہ پر نقاب باندھ لی تھی اور اپنا کام ایسی چستی اور پھرتی سے کیا کہ بڑھیا بوبک کو اس وقت پتہ چلا جب برقعہ خوب آگ پکڑ چکا تھا۔ وہ تو یہ غنیمت ہوا کہ جسم کے کپڑوں میں نہیں لگی ورنہ جُھرم ہو کر رہ جاتی۔ بس ایک دو جگہ چر کے آئے۔ کچھ دن مرہم پٹی ہوتی رہی۔ بڑھیا ایک حرافہ تھی۔ وہ غُل مچائے کہ خدا کی پناہ۔ پولس تھانہ تک پہنچی۔ سارے محلہ کو جمع کیا۔ آخرکار یہ عقدہ کھلا کہ یہ حرکت بھٹیارے والے سیتا کی ہے۔ پتہ بھی یوں چلا کہ شمشاد نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بڑھیا نے اس کے باپ کے لتے لے ڈالے۔ کہا محلّہ کا رہنا بھلا دوں گی۔ میاں کو جھنجھنیاں پہنوا دوں گی۔ حکیم صاحب کے بھی اثر رسوخ سے کام لیا۔ محلہ میں جوان کے زیر اثر تھے انھیں حکم لگا دیا کہ ہر طرح جانی بوا کی مدد کریں ـــــ آخر بادقت تمام معاملہ رفع دفع ہوا۔ لیکن اس جھگڑے جھمیلے میں ہمارے بھی تمام عقدے اور تیور کھل گئے اب سخت پابندیاں لگ گئیں۔ آبا نے کہہ دیا کہ مجھے جیتی زندگی لڑکے کو اس طرح بن ٹھابیل بنا کر چھوڑنا کسی عنوان منظور نہیں۔ جو ہو سو ہو۔ یہ جیئے تو نیک شریف ہو کر جیئے۔ ورنہ خاندان کی عزّت خاک میں ملانے سے بہتر ہے کہ اسی کو سپرد خاک کر دوں ـــــ ادھر یہ حال اُدھر شمشاد

کھنچ گئی۔ ملنا جلنا ترک ہم ایک دو بار ہو تعہ نکال کر کوٹھے پر گئے بھی لیکن اس نے رُخ نہ دیا۔ اپنا سا منہ لے کر چلے آئے ۔ کے بھی تیور بدلے ہوئے تھے۔ اس سب پر طرّہ یہ ہوا کہ ابّا جان نے نادر شاہی حکم لگا دیا کہ اسی مہینے کے اندر ان میاں کو شادی کرنی پڑے گی۔ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ اب تو نہیں ٹلنی۔ والد کے تیور سخت تھے اور انھوں نے ارادہ پکّا کر لیا تھا۔ شادی کی ڈوری قدرے ڈھیلی پڑ گئی تھی ادھر سے ملنا بیں بھیجی گئیں۔ غرض کہ ہم بندھ گئے اور ایک معصوم صورت، معصوم فطرت مرنے بھرنے والی گھر کی پلی شریفوں کی اولاد ہمارے پلّے پڑ گئی۔

شمشاد گو ظاہرہ کھچی ہوئی تھی پر رہتی تھی ہماری ٹوہ میں۔ شادی کا سن کر تلملا ہی تو گئی۔ ٹلوایا صورت دیکھنے کو کھلوایا۔ پر ابّا نے ہم کو آٹھ روز پہلے ہی سے مایوں بٹھا دیا تھا۔ رسم کے مطابق گھر سے نکلنا ناممکن۔ امّاں ہر گھڑی۔ ہر پل نظروں میں رکھتیں۔ کنبہ والے گھیرے رہتے۔ ہم محبوس کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

بیوی خوب صورت بھی تھی خوب سیرۃ بھی۔ پر شراب کا بدل شربت ہو نہیں سکتا۔ شمشاد کے انداز و ادا اس غریب میں کہاں۔ شادی کے بعد ابّا نے بھی قدرے قدغن اُٹھا دیے —— ایک دوست کے ہاں مجرا تھا۔ بہت سی طوائفیں آئیں۔ شمشاد بھی بُلا لی گئی۔ ہم بھی مدعو۔ بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ہم وہاں جا پہنچے۔ بزم آراستہ تھی۔ ارباب نشاط جمی۔ دوست کا گھر اپنی محفل۔ ہم ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ دولھا نے

اپنے پاس بٹھایا۔ بے تکلف محفل تھی۔ ایک طوائف گانے بیٹھی تو باقی سب محفل میں احباب کا دل بہلانے شمشاد آج قیامت کا بناؤ کر کے آئی تھی۔ سفید سائٹن کا آڑا پاجامہ۔ اُس پر چھوٹے چھوٹے نیلے پھول۔ جیسے تالاب پر گُلِ نیلوفر بکھرے ہوئے۔ لوٹ جالی کا آسمانی کرتہ۔ اسمیں سے شکم سیمیں کی جھلک۔ جیسے ہلکے ہلکے بادلوں میں سے کہکشاں نمودار۔ سر پر سرمئی دوپٹہ۔ کچھ ایسا نظر فریب کہ دل تو دل آنکھوں کا کاجل لے اُڑے۔ نوشاہ کو قدرے میرے اور اُن کے معاملات معلوم تھے۔ باصرار بلایا اور میرے پاس بٹھایا۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ تیور خنجر دکھا رہے تھے۔ ظالم بیک وقت آبِ حیات بھی تھی، سمِ قاتل بھی۔ میں نے کہا مزاج تو اچھا ہے۔ جواب ملا آپ کی نوازش۔ ابروئی کشش کہہ رہی تھی محفل ہے کیا جواب دوں۔ دولہا بولے، اب تو ان کی شادی ہوگئی ہے۔ جواب میں ایک نگہِ خشم آلود میری جانب آئی۔ ایک زہر کا سا گھونٹ اپنے حلق کے نیچے اتارا۔ ایک تبسم پُر تصنّع سے دولہا کی جانب دیکھکر سر و گردن کی جنبش کے ساتھ فرمایا —— جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ بیک وقت چہرے پر ترشی۔ تلخی اور شیرینی کی آمیزش ایسی دل نواز تھی کہ قلب زخم خوردہ ان قدموں میں لوٹنے لگا۔ لیکن وہ دامن کشیدہ ہی رہیں۔ سائل پاؤں چھونے چاہتا تھا اور منعم بے نیاز اپنے انداز میں —— چھپکلی ٹھنگے پر اپنی کششِ چشم آزما رہی تھی۔ خود اپنے مقام پر تھی اور اسے قریب تر کھینچ کر لانا چاہ رہی تھی۔ شمع پروانہ کو اپنی گرم نگاہی سے کھینچ رہی تھی۔ میرا دل اس آتش رخسارہ شعلہ رو کے قدموں میں اس طرح لوٹ رہا تھا

جیسے بال و پر سوختہ پروانہ زیرِ شمع یا جیسے آقا کی نظریں پھری: یکھ گروفا شعار کتا لوٹے۔

رنڈی کی خصوصیت ہے کہ اپنی ہم پیشہ و ہم مشرب کو کسی کی جانب مائل دیکھ کر خود بھی اُدھر ڈھلتی ہے۔ ان سرِراہ سُلگنے والے دیوؤں میں قیامت کی آتشِ رقابت ہوتی ہے۔

شمشاد کے میرے مراسم پوشیدہ نہ تھے۔ اکثر چرچے زبانوں پر آتے۔ سہیلیاں آپس میں فقرہ کستیں۔ چہل بھی کرتیں۔ اکثر سرِ بزم ہمارے آنے پر نظریں شمشاد کی طرف گئیں۔ ان کی نگاہیں بھی جھکیں۔ کانوں نے ایسے مواقع پر یہ فقرہ بھی سنا "شمشاد کے آ گئے"! ایک آدھ جو زیادہ شوخ تھی وہ تو یہاں تک کہہ جاتی چھوکری تو نے بھی اچھا دانہ چُنا ہے ——

ایک روز کا واقعہ ہے کہ شمشاد کی سب سہیلیاں خوش خوش بیٹھی تھیں ادھر ہم ——— میرا بھی شباب تھا۔ چہرہ پر سُرخی۔ آنکھوں میں رس۔ سجل ہاتھ پیر۔ ایک والہانہ ادا۔ سب کی نظریں ہر پھر کر مجھ پر پڑتیں میں جھینپ سا جاتا۔ موتی سب میں شوخ تھی۔ بولی شمشاد سب سے تیز نکلی۔ ظالم گھر سے پتہ لگا کر لائی ہے۔ شمو نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ اس سے بچنا یہ اُڑ لگی ہے۔ پھر موتی —— بولی۔ ندیدی نظر لگائے جاتی ہے۔ اس نے جواب دیا، تو کالا دانہ واری صدقے کر دے۔ وہ چمٹ سے بولی تو ہی نہ صدقے میں اُتر جا۔ موتی نے کہا میری بلا اترے۔ نہ زبان یہ کہہ رہی تھی نظریں میرے پا تک میری بلائیں لے رہی تھیں۔ شمشاد نے اُٹھ کر

پیر تلے سے جھوٹ موٹ مٹی سے مجھ پر سے اُتار دی۔ ایک بولی اس وقت تو موتی پانی پانی ہو گئی۔ اس نے کہا تیرے منہ میں بھی پانی بھرا، کچھ اِدھر بھی پانی مرتا معلوم ہوتا ہے ــــ بہر نوع اس روز سے مسلسل موتی مجھ پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ لیکن ہم تو پہلے ہی سے رشتہ بہ پا تھے۔ آج وہ بھی محفل میں تھی میری اور شمشاد کی ڈور کچھ کٹتی سی دیکھی۔ لگی اپنا لاسہ ڈالنے۔ ہم نے بھی ذرا اُدھر رخ دیا شمشاد تاڑ گئی۔ یا تو کھنچ رہی تھی یا لگی میری طرف جھکنے۔ ابھی یہ کھیل ہو ہی رہا تھا۔ وہ شکاری ایک صید پر اپنے اپنے جال ڈالنے میں مصروف تھے۔ کہ محفلِ سماع شروع ہوئی۔ پہلے موتی پشواز پہن کر آئی پھر میری طرف بتا بتا کر یہ غزل گائی۔

اپنے تصورات میں اتنا ہوں کامیاب سا
ہے وہ نظر کے سامنے روئے حسین گلاب سا
جیسے ہو یاس میں امید دیکھ رہا ہوں خواب سا
آتا ہے مجھ کو وہ نظر ابر میں ماہتاب سا
میری خموشیوں میں نے جب انہیں کیا خطاب سا
ان کی نگاہِ نکتہ رس دیتی رہی جواب سا
میرے تخیلات میں گونج رہے ہیں زمزمے
چھیڑ رہا ہو جس طرح چھیڑا کوئی رباب سا

جس کی تجلیات سے خانۂ دل ہے رشک طور
لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کر کوئی حسین جناب سا
یہ تو بتا دے نامہ بر ان کی نظر نے کیا کہا
دل کو یقین ہے آئینگے خط میں تو ہی جواب سا
ان کی نگاہ ناز نے دل کو شہید کر دیا
وہ بھی ہیں کامیاب سے میں بھی ہوں کامیاب سا
موسم گل کی مستیاں برق ہیں آج دیدنی
جیسے کسی حسین کا چڑھتا ہوا شباب سا

میں نے یہ بے بہ بے مجھ پر تیر مارے۔ لیکن شکاری کا تو ہر شکاری کر رہا تھا شمشاد ڈھال بنی تھی کچھ اس طرح بچا رہی تھی جیسے قضا اپنے شکار کو بچائے۔ یہ دونوں آزمودہ شکار ایک معیار پر لڑ رہی تھیں اور وہ غریب گھائل بھی تھا اور زخمی بھی۔

اب شمشاد کی باری آئی۔ یہ مستِ شباب بستی لچیلی اٹھلاتی ہوئی آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سرسوں کے کھیت میں قرینہ قرینہ سے لالہ۔ گلاب۔ نرگس نسترن کھلے ہوں۔ شفاف ماتھے پر ایک لٹ پڑی تھی۔ جیسے گل یاسمن پر عارض یاسمن کا سایہ۔ انگڑائیاں چھلکی پڑتی تھیں۔ جوانی ساون کی طرح برس رہی تھی۔ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ چتون پر شوخی، ادائیں بلائیں لے رہی تھیں۔ جب وہ زمین کو ٹھکراتی گاؤ زمین ارتعاش میں آتی۔ گھنگھروؤں کی آواز گردشِ ستارگاں بن کر دستاں تک جاتی آگے بڑھتی تو دلوں میں آتی پیچھے ہٹتی تڑپا جاتی۔ باریک

پشواز میں سے رانیں اس طرح تڑپ رہی تھیں جیسے شعلۂ ماہتاب ابر چیر کر نکلنا چاہے. بھوؤں کی جنبش کانوں کو چوکڑی بھلائے. ہر عضو بدن کی جنبش ساغرِ دل چھلکائے. ہر ادا رباعیاتِ خیام کا خمار لئے ہوئے.

یہ شعلۂ جوالہ رقص میں تھی. ہم پروانہ وار جاں نثار کرنے کو تیار. محفل پر ایک کیف طاری تھا. ہم پر سر در و دیوار نہیں. زمین و آسمان جھوم رہے تھے. یہ نازک سی تیتری ہمارا محورِ حیات تھی. اور ہم سب اس کے گرد گرداں.

شمشاد نے میری طرف نگاہیں جما کر غالب کی یہ غزل شروع کی.

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں وہ اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخُو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے وہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب!
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے مجھ سے

وہ ملکۂ حسن غلام جمال کی جانب ملتفت تھی۔ حلقۂ بگوش کی کیا بساط ——— وہ شعلہ رو پروانہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کیسے رکتا۔ وہ میکدۂ شباب تشنہ لب جرعہ کش کو دعوت خم دے رہی تھی۔ پیاسا تاب نہ لایا۔ مجھے خمار سا ہو گیا۔ دل لڑکھڑایا۔ اور اسی کے قدموں میں جا پڑا ——— یہ نخچیر پھر فتراک سے بندھا تھا۔

دوسرے روز سے ہم ماں باپ کی مرضی کے خلاف بیوی کی خاموش افسردگی کے باوجود شمشاد کے ہاں آنے جانے لگے ——— بچہ اگر غلط راہ پر جائے تو ماں باپ کے دل کو آگاہی ہو جاتی ہے۔ قدرت نے اولاد کے سلسلہ میں ان کو یہ ایسا قیاس دیا ہے جو خطا نہیں کرتا۔ ایک نہیں ہزاروں واقعہ ہیں کہ پردیس میں بچہ بیمار ہوا اور گھر پر ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دل آپ ہی آپ گھبراتا ہے۔ بار بار زبان پر آتا ہے۔ اللہ میرے بچے کی خیر رکھے۔ پردیس میں پڑا ہے۔

گو بیوی سے ان باتوں کا کبھی ذکر نہ آیا۔ لیکن مرد کا چہرہ ان جانے

والیوں کو بتا دیتا ہے کہ آج سیاں نہ جلانے والی جگہوں میں گرے تھے۔

گھر کی فضا افسردہ رہنے لگی۔ میری ماں رنجیدہ خاطر بھی تھیں اور بہو سے شرمندہ بھی۔ اس کی ہر طرح ناز برداری کرتیں۔ پر بیٹے کا کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ میری بیوی منہ سے اُف نہ کرتی۔ لیکن عورت کے جذبات عورت خوب سمجھتی ہے۔ اس کا تبسم غائبانہ اور مسرت حقیقی سے محروم ہنسی مردوں کا پتہ دیتی تھی ——— دل آخر دل ہی تو ہے کب تک یہ سب کچھ جھیلتا۔ آخر کار انھیں قلب کے دورے پڑنے لگے۔ میں بھی آتے جاتے پوچھ لیتا۔ ان کی نظریں سب کچھ کہتیں اور پھر کچھ نہ کہتیں۔ بیوی نے ایک دو مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی کہ اماں جان آپ کو اکثر پوچھتی رہتی ہیں۔ گذشتہ شب بھی کئی بار دریافت کیا کہ ابھی آئے یا نہیں ——— مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے دل میں ایک چیونٹی نے کاٹا۔ لیکن خلش مژگان کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہ تھی۔

شمشاد اس زمانہ میں مجھ سے اس طرح کھیل رہی تھی جیسے ماہر مچھلی مار مچھلی سے۔ کبھی گرم کرتی، کبھی کھنچ جاتی۔ گاہ گاہ میٹھی میٹھی چٹکیاں بھی لیتی۔

داستان یہاں تک پہنچی تھی۔ رات خاصی بھیگ گئی تھی۔ لوانے کہا اب تم جاؤ بیگم راہ دیکھ رہی ہوگی۔

میں گھر آیا۔ دروازہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بیوی نے کنڈی کھولدی میں نے کہا تم یہیں کھڑی تھیں۔ بولی، جی نہیں۔ ابھی آئی تھی۔ میں نے کہا کیر

کنڈی کھٹکھٹانے سے پہلے تم کیسے سمجھ گئیں کہ میں آیا ہوں۔ اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ میرے آگے سلیقہ سے کھانا چنا۔ پانی کا کٹورہ بھر کر رکھا۔ میں نے کہا بیگم یہ تو بتاؤ کہ تم کیسے سمجھ گئیں کہ میں آرہا ہوں۔ بولی کہ میں نے چار پائی ڈیوڑھی کے قریب بچھا رکھی تھی۔ میں نے کہا پھر بھی میرے دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے تم نے کنڈی کھول دی۔۔ اس نے مسکرا کر دیکھا آنکھیں نیچی کر لیں اور بولی میں حضور کے پاؤں کی چاپ پہچانتی ہوں۔۔۔۔ اللہ اللہ قدرت ہم کو ایسی بیویاں دیتی ہے اور ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ میری نظریں اسکی بلائیں لے رہی تھیں اور وہ نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی۔ میں نے جھکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اک نگۂ الفت و تشکر مجھ پر ڈالی۔ اور پھر شرما گئی

کھانے کے بعد میں ہاتھ دھو کر ڈیوڑھی کے پاس جو چارپائی اپنے لئے ڈالی تھی اس پر جا بیٹھا۔ وہ آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔ میں نے کہا بیگم تم سردی میں میرے واسطے یہاں پڑو تو میں بھی یہاں بیٹھ کر گزار سکتا ہوں۔ اگر تمہاری محبت میں ایسی زور ہے تو میری محبت بھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ شرارہ رکھتی ہے ـــــ آخر بعد منت و سماجت مجھے وہاں سے اٹھا کر لے گئی۔ میں نے کہا اس نازک سے سینہ کو ہوا لگ جائے گی تو میں کیا کروں گا۔ بولی خدا اس سر کو سلامت رکھے میرا بال بیکا نہیں ہو سکتا مری تو دنیا اس سے ہے۔

آخر کار وہاں چارپائی پڑنے کا عقدہ یہ کھلا کہ پڑوس میں چھمو یہ بات آپس میں کہہ رہی تھیں کہ ان کے میاں روز رات گئے آتے ہیں۔ میری

بیوی کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔ یہ ارادہ کر لیا کہ دروازہ پر دستک دینے سے پہلے کنڈی کھول دیا کروں گی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی —— بیوی نے پوچھا بوا یہاں کب آجائیں گی۔ میں نے کہا ابھی راضی نہیں ہوئی ہیں۔ کہتی ہیں میں اس قابل نہیں گھر پر میری جیسیوں کا پرچھاواں پڑنا بھی اچھا نہیں۔ بیوی خاموش ہو گئی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کچھ سوچ رہی ہے۔ عورت کی دکھتی رگوں کو عورت ہی پہچان سکتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تدبیر کرے گی۔

دوسرے روز میں ذرا سویرے گیا۔ اس خیال سے کہ سویرے واپس آجاؤں گا تاکہ میری بیوی کو بولیوں ٹھولیوں سے بچنے کے لئے ڈیوڑھی کے پاس نہ سونا پڑے۔

جب شاہ بڑے پہنچا تو بزم گرم تھی —— دو دکش دھواں دھار اُڑا رہے تھے۔ آج کل سبزہ کے شوقین جاڑے کی وجہ سے ذرا کم آرہے تھے یہاں آتش خوروں کا زور تھا۔ میں ایک کونے میں جا بیٹھا۔ بوا ابھی وہیں آگئیں۔ انھوں نے اب اپنا ایک اسسٹنٹ بنا لیا تھا۔ سارے چرس زدوں کو اس کے حوالہ کر چلی آئیں۔ پوچھا آج سویرے سے کیسے آگئے۔ میں نے رات کا واقعہ بیان کیا۔ بولیں میاں بڑے خوش نصیب ہو ایسی بیوی مقدر ہی سے ملتی ہے۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم نے داستان شروع کی —— میں نے کہا ہاں تو بوا پتنگ ڈھیل کھینچ کا پینچ لڑا رہی تھی۔ ہمارے کھڈے ٹوٹ چکے تھے۔ بوا نے کہا حکیم صاحب

کا بہت دن سے کچھ نہیں سنا۔ اتنے عرصہ وہ کیا کرتے رہے —— میں نے کہا بیچارہ کانوں تک غرق تھے اور ادھر شمشادان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی تھی۔ یاں لاسہ پر لگا رکھا تھا پر رجحان طبع بالکل نہیں۔ ماسٹر صاحب آتے رہتے تھے۔ پیام سلام لاتے لے جاتے۔ گاہ گاہ یہ بھی تشریف لے جاتیں۔ بناوٹی محبت جتاتیں چلی آتیں۔ پاسبان ہمراہ ہوتا نظروں ہی نظروں میں کچھ ایجاب و قبول ہو جاتے۔ اور یہ رنڈی کی چھوکری نئی دلہن کی طرح شرما لجیا کر رہ جاتی۔ بڑے میاں لعاب بہدانہ بن جاتے کشتہ طلا دیتے۔ مگر ذرا کم مقدار میں ہاتھ روک کر۔ عادت سے مجبور تھے پیسہ ذرا مشکل سے نکلتا تھا۔ جو دیتے مل مل کر دیتے۔ دل کے ہاتھوں لاچار تھے۔ ورنہ یہ بھلا کہاں دیوال۔

ماسٹر صاحب گاہ گاہ دوسرے رقیب حکیم صاحب کا جلاب دے دے کر اگلواتے رہتے تھے۔ فرماتے کم بخت برابر ڈورے ڈال رہا ہے۔ میں نے پتہ کٹوا تو دیا تھا لیکن آپ جانیں۔ یہ لوگ پیسہ کے لوبھی ہوتے ہیں اور وہ ہے خرچیلا۔ کل ہی شمشاد کے لئے ہیرے کے بندے بھیجے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ یہ پیغام تھا کہ لونگ کے لئے ایک ہزار کا ہیرا لے رکھا ہے۔ جب بھی ان کے پہننے کے دن آئیں گے پیش کی جائے گی۔ بڑھیا کے لئے دوا المسک خانہ ساز بھیجی تھی۔ چار روز ہوئے یاقوتی آئی تھی۔ حکیم غریب کے دل پر یہ باتیں الماس کی کنی کی طرح لگتیں۔ غرضکہ یہ فصاد کا مل اکثر رگ کھول کر کچھ نہ کچھ خون نچوڑ ہی لیتا —— تو آپ کو یاد ہوگا ایک

روز شمو کے گھر پر اس کی سہیلیاں اپنے اپنے کارنامے سنا رہی تھیں،
اور یہ خوش تھی۔ ایک دن حکیم صاحب سے بڑی ادا سے فرمایا۔ آپ
کا دل چاہے۔ لونڈی کو یاد فرمالیں اور جو کسی اور کا دل چاہے تو وہ
غریب بے زبان کیا کرے۔

حال نے نامہ و پیام کے ذریعہ یہی موضوع چھیڑا۔ جاڑوں کے دن
بہاروں کا زمانہ۔ بجلی ابر کا سینہ چیر دے۔ ہلکی پھوار کچھ اس طرح آئی
جیسے معشوق صحن چمن میں آہستہ خرامی سے آئے۔ سائبانوں پر تیز بارش
کی آواز سیپیوں کے قہقہے یاد دلائے۔ جاڑے کی طویل راتیں ہمارے
حکیم صاحب کے سر پر زلف دراز کی طرح چھا گئیں۔ ادھر خطوں نے
آگ لگائی۔ ادھر کشتوں نے بھڑکایا۔ ایک روز صبح ہی حکیم صاحب
نے ماسٹر جی کو بلوایا۔ ان کے آتے ہی ذکر حبیب چھڑ گیا۔ ماسٹر
ایک ٹھرتا خوب نمک مرچ چھڑکا۔ بولا۔ اب تو ظالم بجلیاں گراتی
ہے۔ شباب پھٹا پڑ رہا ہے۔ جوانی امڈی چلی آتی ہے۔ جسم ایسا
گدرایا ہے۔ جیسے لکھنؤ کا سفیدہ بناری پر آئے۔ حکیم صاحب
کے منہ میں کچھ ایسا بے طرح پانی بھر آیا کہ رال ڈاڑھی تک بہ
گئی۔ بولے ہمیں تو مکھڑا دیکھے مدتیں گزر گئیں۔ ماسٹر صاحب
نے کہا کہ کل ہی حضور کا ذکر خیر فرما رہی تھیں۔ ظالم ہمارے حکیم صاحب،
کچھ اس محبت سے کہتی ہے کہ مجھے رشک آجاتا ہے۔ کل تو میں نے

آخر کہہ ہی دیا کہ یہ نام تو بڑی مٹھاس سے لیا جاتا ہے۔ بس ایک ٹھنڈا سا سانس لیا اور نظریں نیچی کرلیں۔ اس نقرہ پر نہ صرف حکیم صاحب شرمائے بلکہ ان کی ڈاڑھی شریف کا ہر بال ایک لطیف حجاب کا آئینہ دار بنا تھا فوراً خضاب طلب کیا گیا۔ ماسٹر صاحب کو حکم صادر ہوا کہ بلا لاؤ کچھ پروا نہیں۔ ماسٹر بولا۔ سرکار پچاس کا خرچہ ہے ارشاد ہوا، دواخانہ سے لے لو، کہنا کل جو ہم نے دو سو روپئے بھے ان میں سے دے دیں۔ ماسٹر کو تو سہارا چاہئے تھا۔ اُٹھ، منیجر غریب کے سر پر جا سوار ہوئے۔ اس نے کہا یہ رقم تو ما دالحم کی ہے۔ ابھی سارا سامان خریدنا ہے۔ میں میاں سے خود بات کرلوں، حکیم صاحب نے خضاب لگاتے ہوئے اس کی عرضداشت سنی، ایک تفکر جکیا نہ فرمایا۔ پھر ارشاد ہوا۔ چڑے اور مُرغ کم کر دو ــــــ ان کو اپنی چڑیا پھانسنی ہے مریض تو بہر صورت الو بن ہی جائے گا ــــــ الغرض ماسٹر اپنی مٹھی گرم کرکے سیدھے کوٹھے پر جا براجے اور نادر شاہی حکم داغ دیا کہ یاد فرمایا ہے۔ تیس روپیہ ان کی نذر کیئے، بیس یاروں کے۔ ابھی دس بجے تھے جو یہ چڑی مار معصیت در بغل مرغِ فردوسی کو ڈولی میں بٹھائے پہنچا ــــــ سواری مطب کے سامنے سے ہوتی کمرہ میں پہنچی۔ حکیم صاحب قبلہ کی نگہِ پردہ در سے کوئی ڈولی بچتی نہ تھی۔ فوراً "تاڑ گئے" ــــــ دالان مریضوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ کنج تنہائی کے خواہاں۔ جلدی جلدی دو چار موٹی اسامیوں کو دیکھا، کسی کو طلا ر خورد لکھا کسی کو کلاں، ایک کو معجونِ خاص دی تو دوسرے کو حب ذہب۔ خاصا سوتا ٹبوریا تی مریض

صاجزادہ کے حوالہ کر درد سر کا بہانہ فرما اُٹھ کھڑے ہوئے ایک ادب نواز نسخہ نویس نے پرچہ پر چپکے سے یہ شعر سب میں گھما دیا۔

صندلی رنگوں سے ملا نا دل ملا — درد سر کی کس کے ماتھے جائیگی

یہ پرچہ صاجزادہ کی نظر سے بھی گذرا — حکیم صاحب پر بڑھاپے میں شباب چھایا ہے۔ ایک زنڈی کی چھوکری پر دل آیا ہے۔ انہیں ان چہ می گوئیوں سے کیا واسطہ محبت اندھی ہوتی ہے اور چاہنے والے نابینا۔ مریضوں کا اللہ شافی ہے یہ پہلے اپنے درد دل کی دعا کر لیں۔ پھر دیدہ خواہد شد۔

یہ بیگم کمرہ میں آ حکیم صاحب کی خاص کرسی پر ہو بیٹھیں۔ ماسٹر نے یہ اور اضافہ کی کہ حکیم صاحب کی لکھنوی ٹوپی لا، اس مہ پارہ کے سر پر رکھدی — اب جو ہمارے گھائل حکیم صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو بانکا قاتل عجب تیکھی ادا سے بیٹھا تھا۔ دل بسمل لوٹ ہی تو گیا۔ آواز میں غصہ، تیور پہ رعب، ہونٹوں پر ہنسی۔ بولے یہ میری ٹوپی کس کی اجازت سے اوڑھ لی گئی اور میری کرسی پر کیوں بیٹھیں۔ اس کے بعد تعزیراً رخسار پر ہلکے سے ایک طمانچہ رسید کیا۔ شمو نے اُس شاخ نورس کا سا بل کھایا جس کے ساتھ ہوا گستاخیاں کر رہی ہو اور ٹوپی اتار میز پر رکھ دی۔ بولی لیجئے صاحب اپنی ٹوپی، ہمیں کیا خبر تھی کہ لونڈی کو اتنا بھی حق نہیں۔ معاف کیجئے، غلطی ہوئی۔ آئندہ کو کان پکڑے۔ یہ کہتی ہوئی سرکس کی انڑ کھائی شیرنی کی طرح اُٹھ دوڑ کر سوفہ پر جا بیٹھی — حکیم صاحب کا حال نہ پوچھئے۔ اسبغول کی پوٹلی در آب ترشدہ معلوم ہوتے تھے۔

کرسی پر اُٹھ اس معجون مقوی کے پاس جا بیٹھے ۔ بیگم نے انہیں اس طرح دیکھا جیسے نفیس مزاج مریض کڑوی منزج کے کٹورہ پر نظر ڈالے ۔ حاذق علی خاں بولے، خفا ہوگئیں ۔ اس نے کہا جی نہیں حضور مجھ غریب کو یہ جرأت کہاں ۔ ہاں آج معلوم ہوگیا کہ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم ۔ ہم کو تو بہت زعم تھا ۔ پر آج عقدہ کھل گیا ۔ سچ ہے ، بڑے آدمی بڑے ہی ہوتے ہیں ۔ گستاخی کی "ہاتھ جوڑ" کر معافی چاہتی ہوں ۔ اس فقرہ کے ساتھ ساتھ حنائی ہاتھ جوڑے ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے لالہ خونیں کی دو پتیاں چپ ہوگئیں ۔ حکیم صاحب نے نہایت شفقت سے ہاتھ پکڑ کر کہا کیا کہہ رہی ہو شمو ۔ خدا شاہد ہے میں تو مذاق کر رہا تھا ۔ تم کو ، اور حق نہیں ، بس کچھ کہہ نہیں سکتا ۔ اس فقرہ پر ماسٹر صاحب تبسم بر لب سرک آئے ۔

اب حکیم صاحب محترم نے منانے کے بہت سے نسخے استعمال کیے ۔ تب کہیں طبع برہم قابو میں آئی ــــ بولے ، تمہارے لیے تڑپ رہا تھا ۔ صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا ۔ آج آخر کسی عنوان دل نہ مانا ماسٹر صاحب سے کہا ، برائے خدا انہیں لاؤ ۔ اللہ ان کا بھلا کرے ۔ انہیں ترس آیا اور سرکار کو پیغام پہنچایا ۔ رُخ روشن لا دکھایا شمو نے محبت اور شکایت کی نظر سے بہ انداز بلبل نیر خندہ کہا ۔ حضور کا جب دل چاہے یاد فرما سکتے ہیں ۔ کنیز کو بلا سکتے ہیں اور بندی کا کبھی صورت دیکھنے کو دل چاہے تو ۔

پروانہ ہنگ رفت کہ در پیش شمع سوخت
آگہ نہ شد کہ سوختنِ غائبانہ چیست

حکیم صاحب تو ایک ہی پھوار میں گل بنفشہ کی طرح کھل گئے بولے کیا کروں، پروانہ پر بریدہ ہوں۔ اپنی شمع رخسار تک پہنچنا ناممکن ہے۔ شمو نے تیور چڑھا کر بغیر نظر ملائے زمین سے تخاطب کرتے ہوئے کہا، محبت میں کوئی بات ناممکن نہیں۔ حکیم صاحب کے دل کا کنول کھلا جا رہا تھا۔ بولے بیگم تم جب آنا چاہو، بلا تکلف ماسٹر صاحب کے ہاتھ اشارہ کروا دیا کرو۔ میں فوراً بلوایا کروں گا۔ اس کے جواب میں اس طرفہ فن کار نے عجب انداز سے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ حضور خیر سے بھرے رئیس۔ آپ کے لئے تو روپیہ کوئی چیز نہیں۔ پر اس لونڈی کی آنکھیں جھکتی ہیں۔ جب بھی آتی ہوں آپ کا کچھ نہ کچھ خرچ ہو جاتا ہے۔ جانتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے جناب کے لئے کوئی بڑی بات نہیں، لیکن کیا کروں میرے واسطے تو مرن ہے۔ —— کل ہی کی بات ہے، نگوڑے سارے دن میں اکیلی بیٹھی رہی۔ ایسا اچھا موقع تھا —— یہ لفظ منہ سے تو کہہ گئی پر فوراً شرما کر رہ گئی غرض کہ تمام دن حکیم صاحب اس گلشنِ حسن سے کھیلتے رہے۔

دو روز بعد صبح سے گھٹا چھائی، حکیم صاحب کو شمو کی یاد آئی۔ اودے اودے بادلوں میں بجلی کی چمک مستی آلود ہونٹوں کے خندہ دنداں نما کا لطف دے۔ کڑک بگڑے ہوئے تیور یاد دلائے ——

—— حکیم صاحب غریب تصورِ جاناں کیے، دل مسوسے، ارمان دبائے، آرزوؤں کا گلا گھونٹے بیٹھے تھے کہ ماسٹر صاحب آن وارد ہوئے بولے، دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ مبارک ہو حکیم صاحب! حضور نے اُس دن کونسی معجون حُب چٹادی، وہ تو باولی ہو رہی ہے ہر گھڑی، ہر لمحہ، ہر پل آپ کا نام وردِ زبان ہے۔ صبح و شام جناب کو یاد کرنے سے کام ہے۔ قسم ہے بس۔ تمہارے نام کی جپ ہے خدا کے نام کے بعد۔ کل ہی خوشامدیں کر کر کے کہا ہے کہ حکیم صاحب کو یہاں لاؤ۔ ایک نامۂ محبت بھی دیا ہے۔ حکیم صاحب بولے جھوٹ —— بُرا اس پر مجھے ایک کہانی یاد آگئی۔ ایک گورے چٹے حکیم صاحب بچیاں پڑھایا کرتے تھے۔ سب تو کالی پیلی نکٹی چپٹی تھیں ایک اچھی تھی۔ اس پر ملاجی کی نظر تھی۔ دلے ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک روز اس لڑکی نے موقع پا اکیلے میں کہا۔ مُلاجی لڑکیاں بڑی بیہودہ ہیں کل کہہ رہی تھیں چنو مولوی صاحب پر عاشق ہے اور منو کو بھی کہہ رہی تھیں، اور لیجیے کنجڑے کی لونڈیا چھجو کو بھی کہہ رہی تھیں۔ ہاں میں بھولی چھالی سقہ والی کو بھی کہہ رہی تھیں مُلاجی نے پوچھا کیا۔ بولی مجھے شرم آتی ہے۔ انھوں نے پُچکار کر کہا اپنے مُلاجی سے کیا شرم۔ آنکھیں نیچی کر کے کہہ دے۔ بولی مجھے بھی کہہ رہی تھیں۔ اس پر مُلاجی بمع داڑھی متبسم ہوئے، لڑکی کے رخسار پر ایک ہلکا سا چانٹا مارا اور کہا چل جھوٹی —— ہواسی

انداز سے جناب حکیم صاحب نے پیام مسرت سُنا اور کہا جھوٹ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ ماسٹر ایک کائیاں بولا جھوٹ ہے تو جھوٹ ہی سہی۔ جانے دیجئے اپنا کیا ہے آخر بڑی نا نکر اور اصرار اور انکار کے بعد ماسٹر صاحب نے عطر میں بسا ہوا ایک پرچہ نکال کر دیا۔ لکھا تھا وعدہ یاد ہے۔ صورت دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ آپ کی لونڈی۔

اب حکیم صاحب کہاں تھے پان ڈاڑھی کے طواف کرنے لگا۔ باچھیں کانوں تک جا رہی تھیں سارے جسم کا خون چہرہ پر کھنچ آیا تھا۔ انہیں جنت مل گئی۔ ایک رنڈی کی چھوکری نے یاد کیا اور کیا چاہیئے۔ خدائی ہاتھ آئی۔

اب سوال یہ تھا کہ جائیں کیوں کر۔ رات کا وقت تماشبینوں کے آنے جانے کا ہے یہ گھر شب میں آباد ہوتے ہیں یہ بازار بعد شام چلتا ہے اور جوکھڑی بند کرائیں، زینہ کی کنڈی لگوائیں تو خرچ کا سوال ہے دن دہاڑے سر بازار سیڑھیوں پر قدم رکھنا ان کی شان کے خلاف شہر کا بچہ بچہ انہیں جانے، کون ہے جو نہیں پہچانے۔ حکیم صاحب عجب چہ کنم میں تھے۔ محبوبہ دلنواز نے محبت سے یاد کیا تھا۔ دل کہے سر کے بل جا۔ عقل کہے ہوش میں آ۔ آخر ماسٹر صاحب آڑے آئے —— کچھ دیر چہرہ پر غور و فکر کے آثار طاری کر کے بولے سرکار قربان جاؤں اُستاد کے حضور کے اقبال سے ایسی سوجھی ہے کہ جواب نہیں۔ اول کشمیری دماغ پھر ولایت کا سلجھا ہوا

واہ واہ کیا کہنے۔ قسم ہے حکیم صاحب، انگلستان کی ہوا جلا دیتی ہے۔ کیسا بھی کودن ہو۔ وہاں جا کر چاق و چوبند ہو جاتا ہے قبلہ بس کیا عرض کروں۔ سمندر کنارہ کا ایک جھونکا لگا اور ساتوں طبق روشن ہوئے اور پھر آپ جانیں روحانی دماغی لالٹینیں تو ہر طرف گھومتی ہی رہتی ہیں۔ وہاں کی ہوا میں عقل و شعور ہے بڑے کہہ گئے ہیں۔ دانایانِ فرنگ۔ ایک دن کا واقعہ ہے حکیم صاحب بولے یہ ایک کا دن کا واقعہ شب زدا پر اُٹھا رکھئے پہلے تدبیر بتایئے۔ اس پر جناب ماسٹر صاحب مقدمہ جیتے ہوئے بیرسٹر کی ادا سے مسکرا کر بولے۔ ہاں تدبیر، اجی تدبیر کو کیا پوچھتے ہیں آپ تو تولہ با دن رتی کی ہے بس سنتے ہی تڑپ جائے گا پھڑک جائے گا۔ یہ کوڑی کبھی چٹ پڑی ہی نہیں ان قدموں کی قسم بڑی دور کی کوڑی لاتا ہوں۔ لاکھوں کا کام کوڑیوں میں بناتا ہوں۔ کوڑیا لے کر افعی سے لڑاتا ہوں۔ کوڑی کے چار سودے بناتا ہوں اور پھر کوڑی بچا لاتا ہوں بس یوں سمجھئے پھوٹی کوڑی کے کوڑے کرا لاتا ہوں —— حکیم صاحب جھلا کر بولے، یہ ضلع جگت کب تک بولئے گا۔ معاملہ کی بات کیجئے —— ماسٹر نے حکیم صاحب کی جانب خاص ادا سے دیکھا اور کہا ہاں صاحب، دل عاشق بے تاب ہے، ماہی بے آب ہے سنئے صاحب جو کہیں کور کسر نکال دیں تو خادم سر دینے کو تیار —— یہاں سے سرکار غریب خانہ پر تشریف لے چلیں، وہاں برتخہ تیار ہے۔ —— پر ڈال دوں گا

یں سوار ہو جائیں، غلام دم کے ساتھ پردہ پکڑے پکڑے چلے گا۔ ڈولی ان کے زینہ سے ملحق لگوائی جائے گی۔ حضور برقعے یں ملفوف سربمہر لفافے کی شکل زینہ یں داخل ہوں گے، اوپر محبوبہ دلنواز چشم براہ رہیں گی، پھر کیا ہے تخلیہ کی ملاقاتیں نیاز و ناز کی باتیں۔ حسن و محبت کی گھاتیں۔ اطمینان قلب۔ سکونِ جاں۔ جاں نثار دروازہ پر حاضر۔ بہار عشق کی داستانیں۔ نیرنگِ محبت کے افسانہ۔ شباب و حسن گلوگیر سرو و قمری ہم آغوش —— حکیم صاحب کا توسن قلب سکندری کھا گیا اور ان حضرت نے اپنی لگام ماسٹر کے حوالہ کر دی۔ اب دیکھئے کیا ہو

ادھر تو حکیم صاحب دل کے ہاتھوں مرد سے عورت بن رہے تھے۔ اب ذرا ادھر کی بھی سنئے انور نے اپنی کئی سہیلیوں کو بلا کر جمع کر لیا۔ تاکہ اس مرد زن پیرہن کو دکھا کر اپنی مردانگی کا سکہ جمائے اور ہم چشموں کو دکھائے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

یہ دیوانۂ عشق دو کے کندھے پر سوار ہو کوئے جاناں کو روانہ ہوتے وہ فتنۂ قیامت بھی تیار بیٹھی تھی —— وقت کی بات جب حکیم صاحب سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے عین اسی وقت دو نوخیز عشوہ گر بمع ایک محافظ پہلوان اتر رہی تھیں —— راہ میں مٹ بھیڑ ہوئی اول تو حکیم صاحب بلی کی بلی برقع میں الگ مشتبہ نظر آئے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ کم بخت داڑھی کے چند بال نقاب کے باہر نکل آئے چھوکریاں دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ایک کی چیخ نکل گئی۔ بوکھلاہٹ میں حکیم صاحب کی

نافرمان ڈاڑھی ساری کی ساری برآمد ہوگئی۔ یہ پلٹ کر بھاگے۔ پیر رپٹا اوپر سے طوائف زادی کا پیر پھسلا، پہلوان جھپٹا، دوسری بھی لڑکی، غرض کہ یہ تینوں گدر گدر پٹڑی پر تھے۔ ڈاڑھی والا برقع میں، لڑکیاں بے پردہ اُوپر سے محافظ پہلوان حکیم صاحب کے سینہ پر سوار عجب منظر تھا۔ سارے راہ گیر جمع ہوگئے ــــــ ماسٹر صاحب یارِ غار الگ کھڑے ٹُکُر ٹُکُر دیدم دم نہ کشیدم کے اغدکاف میں جَلّ تو جلال تو، صاحبِ کمال تو آئی بلا کو ٹال تو تسبیح پھیر رہے۔

آخر کار یہ حضرت مسکراتے ہوئے یارِ طوفاں بردہ حوادث شکار کی جانب بڑھے۔ بھیڑ کو ہٹایا۔ پہلوان کی ٹھوڑی میں ہاتھ دے کر سمجھایا۔ بولے، پتہ بھی ہے، یہ ہیں کون۔ اتنے میں اور بھی اکثر تماشائی حکیم صاحب کو پہچان گئے۔ پہلوان چھوڑے نہیں۔ وہ حق نمک ادا کر رہا تھا۔ آخر بعد خرابیٔ بصرہ بصد ذلت و خواری اس بے عزتی سے نجات ملی۔ حکیم صاحب برقعہ پھینک شرمندہ و شرمسار سوئے خانہ روانہ۔ دلی کے لونڈے پیچھے لگ لئے۔ ہر چہار طرف سے آوازیں لگا رہے۔ بھروپیہ ہے بے۔ پڑگئی اور یہ کیسی مرے اللہ نبی۔ آخر ایک خالی تانگہ پر بیٹھ بھاگے ــــــ شمو اور اس کی ساری سہیلیاں۔ برآمدہ میں سے یہ تماشہ دیکھتی رہیں۔ کوچہ و بازار میں مہینوں اس کے چرچے رہے۔ شمو درجہ اوّل کی طوائفوں میں آگئی ــــــ میری ذلت تیری شہرت ہی سہی۔

اس حادثہ کے بعد کچھ دن کو حکیم صاحب کے تو جل ٹھنڈے ہو گئے ——— ادھر شمو کی چھتری پر ریاست ہوشیار پور کے چند رئیس پھنس گئے۔ حال ہی میں انہیں اختیارات ملے تھے۔ اپنی کھال میں نہ رہ سکے۔ لگے بال و پر نکالنے ——— مصاحبین کے ہمراہ دلی آئے۔ ساری طوائفوں اور طوائف زادیوں کو نوازا شمو کی بھی طلبی ہوئی۔ اس گلزار عیش و نشاط کے غنچہ نا شگفتہ کو دیکھ لگے چونچ ہلانے ——— سونے کی چڑیا پھنسی تھی، ان لوگوں نے بھی خوب دانہ ڈالا۔ اُلّو سیدھا کیا۔ یہ مرغ زریں زرو جواہر اگلتا رہا ہم بھی رنگ دیکھتے رہے۔ آخر انھوں نے سوال ڈالا۔ شمو کی کنبہ والیاں سر جوڑ مشاورہ کرنے بیٹھیں بعض کا خیال تھا ابھی اور کھینچو۔ بعض کہتے تھے ڈور ٹوٹ نہ جائے۔ غرض کہ اس لقمہ تر کو جلیبی کے چکر میں لانا قرار پایا۔ ہم سوختہ آشیاں تلملائے پھرتے تھے۔ ایک دن موقع پا شمو سے حال دل زار بیان کیا۔ اس نے اظہار مجبوری و لاچاری کیا۔ بعض باتوں سے یہ بھی ترشح ہوتی تھی کہ تم کون سے میرے نام پر بیٹھے رہے جو میں اپنی زندگی تمہارے واسطے خراب کروں۔ مرتے پہ مرتے ہیں۔ راہ چلتے پر نہیں مرتے۔ دبی زبان سے یہ بھی کان میں ڈال دیا ایک لاکھ دے رہے ہیں۔ فرمائش الگ دو ہزار روپیہ مہینہ میوہ خوری کو۔ میں اتنا تو کر سکتی ہوں کہ اگر تم کہیں سے دس پندرہ

ہزار بھی ٹبور لاؤ تو اُڑ جاؤں۔ اس کے بغیر تو بندی کی چلنی نہیں اور پھر آج نہیں تو کل۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ رنڈی کی لونڈیا کب تک دامن بچائے گی۔

ہمارے شب و روز انگاروں پر گذرتے جس طرح آتش خوردہ آگ کو دیکھتا ہے۔ ایسے ہی ہماری نظر سونے پر پڑنے لگی —— کبھی صراف کی دکان کو تاکتے، کبھی جوہری کی۔ بیوی کے زیور پر بھی نگاہیں پڑنے لگیں —— آخر کار وہ روز بد آگیا جب ہماری امیدوں کا خون ہونا تھا —— ہم تمام دن دیوانوں کی طرح تلاش زر کرتے کوچہ بازار میں پھرتے رہے لیکن روپیہ کہیں پڑا ملتا ہے شام کو ڈھ لینے کو پاس گئے —— معلوم ہوا لڑکی نے کوٹھی پر جانے سے انکار کر دیا۔ کہدیا کہ میں اپنے کوٹھے سے قدم باہر نہیں دھروں گی۔ نواب صاحب رات کو یہیں تشریف لائیں گے —— ہم پھر سر بصحرا نکل گئے۔ دماغ کا ہیجان جسم کی حرکت سے شاید کچھ سکون پاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دیوانے کبھی نچل سے نہیں بیٹھتے۔ ہم پر بھی ایک جنون ساطاری تھا۔ شہر بھر میں پھرتے پھرے، کوئی رات کے گیارہ کا عمل ہوگا۔ میں صرافہ میں گذر رہا تھا کہ ایک شخص کو کواڑ کی چول اتارتے دیکھا ہم سر پر جا کھڑے ہوئے، چور کے پیر کہاں۔ وہ بھاگنے ہی کو تھا جو ہم نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا ہم بولے، ہم بھی ساجھی ہیں۔ وہ راضی ہوگیا ہم ذرا فاصلہ پر پہرہ دینے لگے وہ اپنے کام میں مصروف

ہوا کہ چوکیدار آن پہنچا۔ چور کے سر پر لٹھ مارا ایک ہائے کی آواز آئی۔ میں سرپٹ بھاگا۔ مصیبت میں قدم فطرتاً گھر کی طرف جاتے ہیں۔ میں بلا ارادہ ادھر چلا۔ چاوڑی میں سے گذرا۔ کوٹھے کے نیچے قدم رکے۔ جانا بے سود نظر آیا۔ معصیت طلب دماغ نے بیوی کے گہنے کا صندوقچہ یاد دلایا۔ ہم تیزگامی سے گھر کی طرف چلے۔ دروازہ کھلا تھا اماں کے کمرہ میں بتی جل رہی تھی۔ بیوی ان کے پاس بیٹھی تھی اس کے یہ کہنے کی آواز آئی۔ ابا گلاب لینے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے میں دروازہ کھلا چھوڑ آئی ہوں، اماں نے پوچھا، یوسف ابھی نہیں آیا اس پر بیوی نے کہا، آتے ہوں گے ـــــ میں دبے پاؤں کمرہ میں گیا۔ بیوی کے زیور کا صندوقچہ بغل میں مارا ـــــ پیچھے سے آواز آئی۔ اماں کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ آپ کو کئی دفعہ پوچھ چکی ہیں میں مڑا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے چہرہ پر درندہ کی سی کیفیت۔ وہ غریب لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹی میں کمرہ میں سے نکل سیدھا ہو لیا اماں کی ہلکی سی آواز کان میں آئی۔ مجھے بلا رہی تھیں ـــــ انسان گناہوں میں پھنس کر اندھا بھی ہو جاتا ہے بہرہ بھی اس وقت وہ آواز میرے قدم نہ روک سکی، آج کانوں میں گونجتی ہے ـــــ یہاں سے سیدھا کوٹھے پر پہنچا۔ سانس چڑھا ہوا تھا۔ اعصاب خراب ـــــ سیدھا کمرہ میں گھسنے لگا شمس الدین طبلیہ نے دھکا دیا۔ میں چکرا کر گرا، وہاں سے اٹھ کمو کی کوٹھری میں

آیا۔ صندوقچہ اُس کے سامنے رکھ کہا، شمو میری ہے دماغ بے کار ہو چکا تھا۔ چر سیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی حمایت کو اُٹھایا ـــــ کمرہ میں شمو کی ایک چیخ سُنائی دی۔ میں ادھر دوڑنے کو تھا۔ ممو نے روکا اور کہا، اب بے کار ہے۔ سر میں بجلی سی چمکی۔ رباب دل ایک صدا دے کر چٹخا۔ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ دیوار پر سر مارا ممو نے چلم دی، پھر مجھے نہیں خبر کیا ہوا ـــــ پُرانے مریض نے نئے کا علاج کر دیا ؎

۹

شاہ بڑے کا معاملہ۔ گنڈوں کی بستی۔ بدمستوں کی دنیا۔ رندانِ خراباتی کا اڈا ——— بوا وحیدن کا ذاتی وقار اور رکھ رکھاؤ تھا کہ کوئی اونچ نیچ ہونے نہ پاتی۔ ہر شخص لحاظ کرتا۔ ہر فرد ان کے آگے احتیاط ——— جو کوئی حد سے آگے بڑھا تو ایک طرف بوا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دوسری طرف فدرح خوردوں نے تیور بدلے۔ بات ہونٹوں کی ہونٹوں ہیں رہ جاتی تھی۔

پھر بھی ایسا فضا، ایسے ماحول اور ایسے گرد و پیش میں ایک عورت کا تن تنہا رہنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا ——— روز کے آنے جانے والے تو ان کی عادت سے واقف تھے۔ عزت کرتے، احترام مدنظر رکھتے، لیکن یہ تھا ایک عام مقام، نہ کوئی در نہ دربان، جس کا جس

وقت دل چاہے آئے، جب تک چاہے بیٹھے، شغل کرے چلا جائے چلمیں موجود، کونڈی سوٹا حاضر آگ روشن ـــ ان حالات میں ناخوشگوار حالات اور واقعات کا پیش نہ آنا تعجب تھا۔ پیش آنا تعجب نہیں۔ راہ گیر، چرسیہ ادھر اُدھر کے خنڈ دباز، بھنگڑ ایسے ویسے وقت بے وقت یہاں آجاتے اور بُوا کے ساتھ گستاخانہ پیش آتے۔ ایک روز ایسا ہی واقعہ ہُوا۔

میں اپنا قصہ پُورا سنانے کے بعد متمنی تھا کہ بوا کی داستان سنوں۔ اسی اُمید پر ساری رام کہانی سنائی تھی۔ لیکن وُہ تہ بہ لب رہیں۔ بس ذرا ذرا سی جھلکیاں، جو میری داستان کے دوران میں چہرہ کے اُتار چڑھاؤ سے نظر آ گیئں۔ ان سے آگے کوئی بھید نہ کھلا کچھ راز معلوم نہ ہوا۔

بہر نوع یہی تھا کہ میں اکثر جاتا کہ شاید کوئی بات انکی زبان سے نکل جائے شاید کچھ کہنے پر آمادہ ہو جائیں ممکن ہے کسی وقت کوئی ٹھیس لگے اور سوتیں بہ نکلیں ـــ ایک روز دوپہر کو جو گیا تو دور سے ایک نشہارے کے پکارنے کی آواز سنائی دی بدقماش مغلظات بک رہا تھا۔ میں قدم بڑھا کر جلدی جلدی پہنچا ـــ وہاں یہ تماشا دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص کریہہ منظر، میلے کچیلے کپڑے پہنے پھٹے حال برے احوال بوا وحیدن پر برس رہا ہے اور وہ بیٹھی دھاروں رو رہی ہیں۔ اگر کوئی گنڈا بدمعاش ہوتا تو بوا وحیدہ پر اسطرح چھا نہ سکتا تھا ـــ حالات نے میرے قدم روکے اور میں ایک طرف آڑ میں ٹھٹک گیا ـــ گفتگو سے کچھ ایسی ترشح ہو رہی تھی کہ جیسے بُوا وحیدن کی کوئی گوٹ پھنسی ہو اور گنڈے بدمعاش کا پانسہ دربڑھا ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ لجاجت سے کام

لے رہی تھیں اور وہ کمینہ شیر ہوا جاتا تھا — میں ساری دیر دیکھتا رہا تھوڑی
دیر بعد بوا نے ایک پوٹلی میں سے کچھ رقم نکال کر اسے دی جو مرزدہ نے
حقارت سے پھینک دی۔ زیادہ کا طلبگار معلوم ہوتا تھا۔ ایک ۔ گو دیں
گفتگو میں اس نے کہا۔ تیرے پاس میرے کی انگوٹھی بھی تو ہے دو کیوں
نہیں نکالتی۔ کیا قبر میں ساتھ لے کر جائے گی ان الفاظ پر بوا اسے مقابل
پر اس شیر کی سی نگاہ ڈالی جو دست و پا بریدہ پڑا قاتل کو دیکھ اٹھے!
کیا کروں مجبور ہوں ورنہ میں بھی کچھ کر سکتا تھا۔ کبھی آنکھ اٹھانے والے
کی آنکھ نکال لی جایا کرتی تھی۔ لیکن اقتدار نے لاچار کر دیا۔ خیر ایسا بھی
ہوتا ہے زمانے میں ——— بہر نوع نو وارد کو زیادہ رقم پر اصرار
تھا اور بوا کا کہنا کہ اس سے زیادہ میرے پاس ہے نہیں۔ وہ انہیں کچھ دبی
زبان سے دھمکیاں بھی دیتا تھا اور بوا لجاجت خوشامد کر رہی تھیں میرے
عجیب جذبات تھے۔ دل چاہتا کہ اس بد زبان کا منہ نوچ لوں لیکن
مصلحت دم بخود کئے ہوئے تھی۔ عقل کہتی کہ خدا معلوم اس کے ہاتھ میں
بوا کی ایسی کونسی دکھتی رگ ہے جو سب کچھ سن رہی ہیں۔ اور اُف نہیں
کرتیں ورنہ یہ کسی سے نیچا دیکھنے والی ہیں کب۔ آدھی بات نہیں سہتیں
کلوخ انداز را پاداش سنگ است کی قائل ہیں۔ جب ہی تو آج بھی
شاہ بڑے جیسے اونچے مقام پر کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ ورنہ یہاں کے
منہ زور تو بہ ہی بھلی۔ اچھے اچھوں کے دم بھر میں پرخچے اڑا کر دھر دیں۔
کچھ دیر بعد وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ میرے دماغ نے اس واقعہ

یہی صلاح دی کہ اس کے پیچھے پیچھے جانا چاہیئے ــــ دیکھوں تو ہی یہ ہے کون. کہاں رہتا ہے. کیا کرتا ہے ــــ اس تخیل کے تحت میں ذرا دُور دُور اس کے پیچھے ہو لیا. وہ مسجد گھٹے سے ہوتا ہوا چاوڑی آیا اور ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ گیا ــــ میں کچھ فاصلہ پر کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں. ایک دل ہے کہ اوپر چل کر اندازہ کرکہ یہ شخص یہاں مستقل رہتا ہے یا یونہی آتا جاتا ہے. پھر خیال آئے کہ دن دہاڑے سر بازار اس عمر میں رنڈی کے کوٹھے پر جانا کسی طرح زیب نہیں دیتا. ایسا ہی ہے تو رات کو دیکھا جائے گا. یہ سوچ کر میں آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ مصلحت اور دوست داری نے قدم تھام لئے اور کہا دبوا ہوا ہے بوا کا سارا راز اس شخص کے پاس ہے تجھے مقدر سے کنجی مل گئی ہے. اور تو کھوئے دیتا ہے. جو اس کا مستقل ٹھکانا نہ ہوا تو پھر کہاں ڈھونڈھتی پھرے گا. ان اوباش آوارہ روزی بدقماشوں کا کیا ٹھیک آج کہیں ہیں کل کہیں. نام تک تجھے معلوم نہیں. اس کے علاوہ گر کچھ بھید کھل گیا تو شاید بُوا کی مدد کی جا سکے. خدا کو اس ہی میں کچھ بہتری منظور رہے. سائیں کے سوکھیل. تو کیا کبھی رنڈی کے ہاں تو گیا نہیں. ہزار بار گناہ کے لئے گیا ہے. آج نیکی کے نام پر چل. اس خیال نے قدم آگے کو بڑھا دئے ہیں نے بھی سوچا کہ ہا کے پکارے ان ہی کوٹھوں پر ڈھکے کی چوٹ شب و روز آرجا رہتی. ایک بار اور یہی سہی.

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اللہ کا نام لے گرد و پیش سے آنکھیں موند کر سیڑھیوں پر چڑھ ہی گیا
سامنے دالان میں ایک طوائف کی چھوکری بیٹھی تھی۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی
عمر نے میرے قدم پکڑ لیے اور پوچھی کہ ظالم تجھے کہاں لیے جا رہا ہے ایک
ایک سفید بال عارضہ گذار تھا کہ ہماری لاج رکھ لیکن یہاں تک کر
واپس جانا ناممکن تھا۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

طوائف زادی نے مجھے کھڑے ہو کر سلام کیا اور تکیہ کی جانب
صدر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر تھالی میں قرینہ سے پان پیش کیا۔ اس
دنیا میں مدعا پوچھا نہیں جاتا خود سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور تواضع شروع کر دی
جاتی ہے۔ میں نے پان لینے کے بعد تھالی میں دو روپے رکھے ان کنا
بائی جی مجرا کرانا چاہتے تھے۔ اس پر وہ بولی۔ میں اپنی امی کو بلاتی ہوں
آپ ان سے بات کرلیں اتنا کہتے ہوئے اس نے شدّو کہہ کر آواز دی
اور وہی خنزیر صورت شخص آیا۔ اب معلوم ہو گیا کہ شدّو کہلاتا ہے اور اس
گھر میں ملازم۔

شدّو نے ان کی امی جان کو بھیجا —— ادھیڑ عمر گٹھے ہوئے جسم
کی عورت تھی۔ سانولا رنگ لیکن کٹیلا نقشہ۔ دیکھنے میں اب تک دلبری باقی
تھی۔ کنگھی چوٹی سے درست۔ ملگجی پھنسا ہوا آڑا پائجامہ۔ اس میں دانوں
کے وسط تک سرخ ریشمیں ازار بند۔ باریک ململ کا کرتہ۔ آدھے سر پر دوپٹہ
سیدھی مانگ تشریف لائیں۔ سلام کرتے ہوئے مجھ پر ایک مکمل جائزہ دینے
والی نائکانہ نگاہ ڈالی۔ پھر کہا کیا حکم ہے۔ میں نے وہی مجرے کا ذکر چھیڑا

بولیں معاف کیجئے گا۔ ہم انجان جگہوں پر بچی کو بھیجتے نہیں۔ آپ جانیں ایسا ہی زمانہ جا رہا ہے۔ جناب اپنے اوپر نہ لے جائیں۔ خدانخواستہ میں آپ کی بابت نہیں کہہ رہی۔ پر کیا کروں ہمارا یہی دستور ہے۔ ابھی ابھی ادار میں کئی ایسے واقعہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے نگوڑا دل ڈرتا ہے۔ مجھ سے اتنا کہنے کے بعد لڑکی سے بولی آپ کو پان پیش کیا۔ ان الفاظ کے ساتھ ساتھ ال بیگم کی نگاہ تھالی پر گئی۔ یہ اس دنیا کا مقیاس ہے۔ تھالی میں دو چہرے شاہی پڑے تھے۔ بڑھیا نے فوراً رنگ گفتگو بدلا اور کہا آپ شریف آدمی ہیں۔ ہمارا کام ہی حکم ماننا ہے۔ پر کیا عرض کروں۔ دنیا میں سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ابھی دو دن کی بات ہے ا منعد کی لڑکی کو مجرے کے بہانے سے لے گئے۔ چھوکری کا آج کی گھڑی تک پتہ نہیں چلا۔ کچھ ایسا تل پٹ کر دیا کہ کھوج ہی نہیں ملتا۔ نہیں معلوم کہ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ ماں بدنصیب کا بُرا حال ہے۔ پلو پھیلا پھیلا کر کوس رہی ہے۔ غریب کی ساری عمر کی کمائی لُٹ گئی۔ آپ کہاں مجرا کرائیں گے۔

اب ہم مشکل میں آ گئے۔ ہم کو تو ان کا انکار غنیمت تھا۔ اقرار میں گھر گئے۔ مجرا تو محض تقریب بہر ملاقات تھا۔ اب آن بننے کے سودے تھے۔ گریز کیسے کریں۔ تاہم اس دنیا میں میری زندگی کا بھی بڑا حصہ گذرا تھا۔ دماغ پر تھوڑا زور دیا اور مسکرا کر کہا حضور! اب تو آپ کی شرط پوری کرنے کے بعد ہی ہم ان کو مجرے میں

لے جائیں گے۔ آج ہم اور آپ اکیلے ہیں۔ اب اس جوان پٹھان کو پڑھانا
ہمارا کام ہے۔ اتنا کہتے ہوئے انہوں نے لڑکی سے پان کی فرمائش کی۔ اس نے
جلدی سے کھڑے ہو کر تھال پیش کی۔ میں نے ایک پان سے درد۔ اور
رکھ دیے۔ اب دونوں ماں بیٹیاں یک زبان بولیں۔ یہ تکلیف کیوں
فرما رہے ہیں آپ جس کا صاحب جواب دیا گیا ہے اس اٹھنے کو تو بڑھیا
لے دوڑا اور کہا کہ ذرا کی ۔ اور تشریف رکھئے۔ میں کچھ سودا انہیں حاضر کردیا
گود میں لے لٹکا لیا۔ لیکن ان کا اصرار تھا اور مجھے بیٹھنا پڑا ——— مستر شندہ
کی پھر طلبی ہوئی اور میرے لئے آئس کریم سوڈے کا ایک گلاس آیا۔

میں یہ سب باتیں ابھی الل ٹپ پھینک رہا تھا۔ اندھیرے میں راہ
ٹٹول رہا تھا کوئی لائحہ عمل سامنے نہ تھا۔ کوئی طریقہ کار طے نہ کر سکا تھا۔ بہ
نوع اتنا ضرور تھا کہ اس گھر میں لا لنگر اٹکائے رکھنا چاہتا تھا۔ آگے جو ہو سو ہو
ہو دنیا برامید قائم است

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں چلا آیا یہاں سے
سیدھا ہوا سے ملنے شاہ پڑے گیا۔ میرا خیال لگا ہوا تھا دل میں بڑھیا
ماں کی اس بدمعاش کے سامنے عاجزی وانکساری میرے سینہ میں انی کی
طرح چبھ رہی تھی۔ کھٹک رہی تھی۔ بار بار ان کی رحم طلب نگاہیں آنکھوں میں
پھر جاتیں اور میں بے چین ہو جاتا۔

جامع مسجد کے نیچے سے تانگہ لیا۔ تاکہ جلد از جلد ان تک جا پہنچوں
ایک ایک پل بھاری ہو رہی تھی ایک ایک لمحہ دو بھر۔ خدا خدا کر کے شاہ پڑے

پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تُو چلم بھر رہی ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا اس وقت کوئی تھا نہیں پھر یہ چلم کس کے واسطے بھری جا رہی تھی ——— ہوا کی آنکھوں میں کچھ خودکشی کرنے والے کی سی چمک تھی۔ چلم پر انگلیاں کچھ اس طرح جمی تھیں جیسے کوئی مایوس حیات اور ناکام زندگی ختم کرنے کی نیت سے اپنے حلقوں پر ہاتھ رکھے ——— جونہی مجھے سامنے کھڑا دیکھا چلم ہاتھ سے رکھ دی اور قدرے شرمندہ سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ میں نے بھی کوئی تذکرہ نہ چھیڑا۔ تھوڑی دیر دونوں جانب سکوت و خاموشی کا عالم رہا۔ پھر میں نے کہا ہوا آپ کی بھاوج بس میرے سر ہو رہی تھی کہ انھیں یہاں لے آؤ میں ملوں گی قدم چھوؤں گی ——— یہ الفاظ سن کر وہ مسکرائیں۔ ہونٹ دہانِ زخم کی مانند کھلے لیکن جواب کچھ نہ دیا۔ میں نے کہا آج تو وہ مصر تھی کہ جو وہ نہیں آئیں تو مجھے لے چلو۔ برقعہ اوڑھ کر ساتھ آنے پر آمادہ تھی۔ میں بمشکل چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ جس ہستی نے میرے شوہر کو اس بلا سے نجات دلائی جس نے میرا سہاگ مجھے واپس دیا۔ میں جب تک اس کے قدموں پر سر نہ رکھ لونگی دل نہیں مل سکتا۔

میں کہتا رہا وہ خموش بیٹھی سنتی رہیں۔ کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میں نے کہا ہوا فرمائیے میں اس سے کیا کہوں۔ ایک غائبانہ انداز میں بے اختیار ان کے منہ سے یہ شعر نکل گیا ؎

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

پہلا مصرعہ تو اضطراری طور پر کہہ گئی تھیں۔ دوسرا بھی ایک بے باکانہ اور والہانہ انداز میں ہونٹوں سے ڈھلک جانے دیا —— میرا خیال ایک دن سے ایک دن پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کسی نہ کسی اونچے خاندان کی ہیں۔ گردشِ روزگار۔ چرخ فتنہ کار اور حوادثِ حیات کا سکار ہو کر یہاں تک پہنچ گئی ہیں۔ اتنا عرصہ اسی امید میں گذرا تھا کہ شاید ان کی مہا کہانی سننے میں آجائے۔ لیکن ادھر مُہرِ راز ہونٹوں پر ثبت تھی اور میں خود استفسار کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

بوا یہ شعر پڑھنے کے بعد کچھ مرجھا کر بیٹھیں۔ میں نے بھی بات آگے بڑھانی اور اصرار کرنا چنداں مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد چلنے کو ہوا۔ لیکن ایک بات دل میں کھٹکنے والی تھی خدشہ لگا ہوا تھا —— آج بوا کو چلم بھرتے دیکھا تھا۔ اب میں کسی عنوان ان کو اس دھوئیں کی ناگن میں گھرا ہوا دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ ان کے طفیل ان تاریک زنجیروں سے مجھے نجات ملی تھی۔ اب انھیں بچانا میرا فرض تھا۔

اُٹھتے اُٹھتے میں نے کہا بوا اجازت ہے۔ بولیں یہ آج اجازت کیوں طلب کی جا رہی ہے میں نے کہا بوا معاف کیجیے گا۔ یہ بات تو پھر اسی طرح پر شروع کریں گے —— اگر حکم ہو تو ابھی ورنہ جب آپ فرمائیں لیکن یہ وعدہ نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ بوا نے غضبناک نگاہوں سے ہم کو دیکھا اور عجیب انداز سے گردن جھکا لی بولیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہم کو ایک دوسرے کے تحفظ کے لیے پیدا کیا ہے

اگر آج تم نہ آجاتے تو شاید میں آج وعدہ پر قائم نہ رہ سکتی ۔ خیر اس بار خدا نے بچایا ہے آئندہ ہم کو خود بھی اپنی مدد کرنی ہوگی ۔ تم جاؤ اور بے فکر جاؤ ۔ اللہ مالک ہے ——— میں نے جو بوا کو اس وقت ذرا بولنے کے موڈ میں پایا تو غنیمت جان پھر وہی ذکر چھیڑا ۔ کہ بیوی کو کیا جواب دوں ۔ بولیں ان سے کہنا بیٹی اللہ تم کو شاد آباد رکھے ۔ تمہارا سہاگ برقرار رہے ۔ تمہاری مانگ بھری رہے ۔ بوا اب اس قابل نہیں کہ شریف بہو بیٹیوں پر اس کی پرچھائیں بھی پڑے ۔ اللہ تمہارے سرتاج کو سلامت رکھے تمہیں بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں ۔ میں ابھی جس جگہ کے قابل رہ گئی ہوں وہیں پڑی ہوں بہت گذر گئی تھوڑی رہ گئی ہے ۔ وہاں آکر بھی تمہارے لئے دعا کروں گی ۔ یہاں بھی کرتی رہتی ہوں ۔ وہ سب کی سننے والا ہے ۔ گناہگاروں سیاہ کاروں کی بھی سن لیا کرتا ہے ۔ باقی تم سے مجھے یہ کہنا ہے کہ خبردار جو بیگم کو یہاں لائے ہو گے ۔ کچھ ۔ پاگل ہوئے ہو ۔ یہ جگہ کہیں اس قابل ہے توبہ توبہ دل میں ایسا خیال بھی نہ آنے دینا ۔ وہ شریف بچی ہے ۔ اگر تم نہیں کہہ دوگے تو وہ پھر اصرار نہیں کر سکتی ۔

بیوی سے میں کوئی بات پوشیدہ نہ رکھتا تھا ۔ اتنے عرصے اور اتنی باتیں چھپا کر اس کے اب پوشیدگی کے کوڑے میں گنجائش نہ رہی تھی ۔ گھر آتے ہی سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ وہ بولی کہ اگر اس سلسلہ میں ایک کڑی بھی مل جائے تو پھر ساری باتیں خود بخود کھلتی چلی جائیں گی ۔ تم اب شدو کا پیچھا نہ چھوڑنا ۔ یہ لوگ پیسے کے ہوتے ہیں ۔ اللہ نے اب ہم کو اس کا لاکھ شکر ہے ضرورتوں سے

زیادہ دے دکھا ہے جس طرح بھی بن پڑے شدو دے یاد اللہ بڑھا کر اس کے بھیدوں میں گھسو۔ جہاں تک ہو سکے اس کے تمام راز معلوم کرو۔ کوئی نہ کوئی بات بوا کی اس کے ہاتھ میں ہے۔ کسی طرح اس کا پتہ چلنا چاہیئے۔ بغیر سارے معاملات معلوم ہوئے ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ آگے بڑھ نہیں سکتے۔ اگر کچھ بھی سراغ لگ جائے تو وہ مل جائے تو شاید بوا کی بھی کوئی مدد کی جا سکے۔ اس کے بعد بیوی نے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ اے پاک پروردگار اس اللہ کی بندی نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے۔ ہم کو بھی اپنے حبیب کے صدقہ سے موقع دے کہ اس کی مدد کر سکیں ——

میں نے کہا جو مجھے رنڈی کی چھوکری نے پھانس لیا تو —— ہے بڑی تیز طرار۔ بس چھلاوا ہے۔ آج ہی مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری جانب ایک عجیب نگاہ ڈالی اور کہا جس خدا نے ہزاروں بلاؤں سے چھڑا کر تم کو مجھے واپس دیا ہے میرا اس پر بھروسہ ہے بوا کے لئے مجھے سب کچھ منظور ہے۔ ان کے طفیل مجھے یہ دن نصیب ہوا ہے میری تو جان بھی کام آ جائے تو دریغ نہ کروں۔ —— میں چونکہ اسے ہر پہلو سے گھسنا چاہ رہا تھا۔ بولا اس قصہ میں پیسہ خاصا خرچ ہوگا۔ جواب ملا آخری رقم بھی دے دوں گی۔ اور اب تو اللہ نے اپنے حبیب کی خیرات ہمیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں نے ڈیڑھ سو روپے مہینہ میں گیا ہی گھر چلایا ہے۔ اس وقت تو اللہ کی عنایت سے بھر ستی پانچ سو آ رہی ہیں۔

بات یہ تھی کہ میری جائداد بے غوری بڑی تھی کچھ شکستہ تھی کچھ

منہدم۔ بعض پر کرائے دار قبضہ کئے بیٹھے تھے کہیں کہیں افتادہ کھنڈر پڑی
تھے۔ مجھے اپنے سر و پا کا ہوش نہ تھا۔ ادھر کون توجہ کرتا۔ جو کبھی خیال بھی
آتا تو باسی کڑھی کے اُبال کی طرح ادھر آیا اُدھر گیا۔ اب جو مالک نے
مجھے اس عذاب سے نجات دلائی دماغی حالت درست ہوئی تو اس طرف
دھیان دیا پہلے کچھ مرمت سرمت کرائی۔ کرایہ داروں سے باقاعدہ
سرخط لکھوائے۔ مہینہ کے مہینہ واجب وصول کرنا شروع کیا۔ اب
اصل سوال یہ تھا کہ ساری جائداد روپیہ چاہتی تھی۔ برسوں سے یوں ہی
پڑی خراب خستہ ہو رہی تھی۔ میری اور بیوی کی اس معاملہ میں بات
ہوئی۔ آخر کو ہم دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ سود کے قصہ میں تو پڑنا نہیں
ایک افتادہ زمین فروخت کر کے وہ رقم باقی جائداد پر لگائی۔ بقیہ پر رکھ دی
جائے ——— نیک بخت بیوی نے اپنا سارا زیور لا سامنے رکھ دیا
——— یہ وہی صندوقچہ تھا جو میں رات کو چرانے گھر میں گھسا تھا
لیکن لے جا نہ سکا۔ قدرت نے اس دن کے لئے بچایا تھا۔ وہ سارے
پرانے مناظر نگاہوں میں پھر گئے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ دل نے کہا بزرگوں
نے سچ کہا ہے کہ جو چیز گھر میں رہے تو برسوں رکھی رہو سمجھا ہی دیکھ لو ایک
بار باہر نکلی پھر نہیں آئی۔ یہاں حفاظت کرنے والیاں بیٹھی ہیں۔ وہاں
لوٹنے والیاں۔ یہ ماں باپ کی بیٹیاں ہیں وہ ماں زادیاں۔
بہر نوع یہ زیور تو میں نے لیا نہیں زمین سے جو رقم حاصل ہوئی
تھی وہ بڑی حد تک کافی ہو گئی۔ کچھ کرایہ خاطر خواہ آنے لگا۔ اللہ نے

آہستہ آہستہ میری ساری جائداد نئی کرادی۔ اک منزلہ مکانات دو منزلہ اور سہ منزلہ کرادیے۔ دو دکانوں پر کوٹھے بنوائے۔ غرضیکہ خدا کے فضل و کرم سے کل ڈیڑھ سو کی جگہ پانچ سو روپے ماہوار آنے لگے۔ کچھ دہلی میں جائدادوں کے کرایہ بھی بڑھ رہے تھے۔ ہمارا دستور تھا کہ آدھا خرچ کرتے آدھا پس انداز۔ یہ رقم بھی جائداد ہی پر لگانے کی نیت تھی۔

مدعا یہ کہ اب ہم نے حسن بانو کے ہاں گاہ گاہ آرجا شروع کردی گو زیادہ نہیں روز روز نہیں جاتے تھے۔ تاہم جب بھی جاتے رقم اچھی خاصی دے کر آتے تھے۔ اس طریقہ کار سے عزت بنی رہتی ہے۔ اور ساتھ بھی۔ نیز خرچ کم ہوتا ہے۔ اگر انسان روزانہ جائے اور چار روپیہ دیکر آئے تو مہینہ کے ایک سو بیس ہو گئے لیکن پیسہ جب بھی دئے حقیر صرف چار روپلی اس کے برخلاف اگر ایک مہینہ میں صرف دو بار جائے اور ہر دفعہ بھر مٹھی نہیں دے کر آئے تو رقم نظروں میں بچے گی اور خرچ بھی آدھا ہوگا۔ کہ آنے کو طوائف کثرت مشاغل اور قلت فرصت کے علاوہ اپنی کشش کی کمی پر محمول کیا کرتی ہے۔ اور پھر ایسے تحفے رسد از زیادہ ڈورے دیے جاتے ہیں۔ کم التفات ہوتا ہے۔

بالخصوص ہم نے اس ڈھب سے کام شروع کیا۔ صاحب رنگ جما لیا۔ شدہ شدہ تو دوسرے تیسرے ہی پھیرے سے پیچھے آن کر سلام کرنے لگا ہم ایک دو روپیہ اس کو بھی تھما دیتے ...... طوائفوں کے نوکروں کو یہ للک نہ ہوتی ہے تھا جنہیں ان کی معرفت آنے جانے والے رقیبوں

اور حریفوں کی ٹوہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی نوعمر ولی پھبنک رنڈیوں کی چھوکریاں انہی کے توسل سے دل پسندوں سے پیام سلام کراتی ہیں ——— کمرہ پر تو ہمہ وقت نائکہ لگا ہوں رہیں رکھتی ہے۔ چوکنّا رہتی ہے۔ لڑکی کی ہر نظر بھانپتی ہے۔ کان ادھر لگے رہتے ہیں۔ جہاں کسی چھیلا کی جانب نوچی کو حقیقتاً مائل دیکھا اور بڑھیا کے تیور بدلے تناس پھریں اُس کے آنے جانے کی روادار نہیں رہتی۔ لاکھ روپیہ بھی دے تو اس کے نزدیک خاک ہیں۔ پھر صاحب چھوکریاں بھی اپنی سی کرتی ہیں لاگی ناہیں چھوٹے راجہ چاہے جیا جائے ——— انہی نوکروں کے ہاتھ پیام سلام ہوتے ہیں۔ وقت مقرر کئے جاتے ہیں۔ وعدے بھی ہوتے ہیں۔ پھر اُن کا ایفا بھی ہوتا ہے بڑھیا کی آنکھوں میں مرچیں جھونکی جاتی ہیں۔ نوکروں کی باچھیں کھلی جاتی ہیں ——— ایک صاحب کا واقعہ ہم کو بھی یاد ہے۔ آوارگی کے دور میں ہمارے یار غار تھے ——— دہلی میں ایک بڑی کھاپٹ نائکہ تھی اور اس کی ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی اہلِ شہر جانتے ہوں گے۔ ماں کا نام سراج بتلی تھا بیٹی کا نام دولت بتلی۔ یہ پنجاب کی ڈومنیوں کا خاندان تھا۔ ساری دہلی میں لونڈیا کی دھوم تھی اور سچ یہ ہے کہ تھی بھی جامہ کی تسرل صورت۔ ظالم کی آنکھ میں وہی تھی غضب کی دکھن پائی تھی۔ جسے ایک بار آنکھ بھر کر دیکھ لیا بس وہ سدا سودا گردہا ہی ہوگیا۔ ناگن سی چوٹی کولوں تک پڑی رہتی۔ متور کی گردن گدورے کے رخسار

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مراد دل کے دن

گدانہ رانیں، چھپتے ہوئے کولہے۔ بھری بھری پنڈلیاں۔ بھرا ہوا سینہ۔ بلکھتی ہوئی کمر۔ غرضکہ کیا تھا جو اس کے پاس نہ تھا۔

اس دنیائے محبت و نفرت میں ہر عورت کسی نہ کسی مرد سے محبت کرنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مجسمہ ناز اس فطری نہاد کا اظہار کیے بغیر رہ نہیں سکتی ——— بس دولت پتلی کی بھی نیت ایک چھیل چھبیلے پر آہی گئی

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے
ہم تمہارے تم ہمارے ہو گئے

بڑھیا ایک جانب فوراً تاڑ گئی کہ لڑکی کی نگاہیں اس طرف بے ڈھب پڑ رہی ہیں۔ اور صاحب حقیقت یہ ہے کہ لڑکا بھی قیامت کا نظر فریب تھا۔ کا چھیلا۔ ورزشی بدن۔ ابھرے ہوئے شانے سرخ و سپید رنگ بڑی بڑی غلافی آنکھیں ستواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ پھر نشست و برخاست کا انداز۔ گفتگو کا طرز الفاظ کا انتخاب۔ سب لاجواب۔ ہرن کی کہ چیتے کی چال۔ عقاب کے پھیلے ہوئے بازو کی مانند خم دار کنارہ جیسے ہونٹ۔ غرضکہ ہزاروں میں ایک لاکھوں میں فرد تھا۔

بڑھیا نے ستنا نے سی اپنے مال کی چوکسی کرنی شروع کر دی

چھوکری کو ہر گھڑی نگاہوں میں رکھے ——— اس جوان کا نام اصغر تھا۔ ادھر وہ آیا ادھر نائکہ کی تیوری پر بل پڑا۔ اپنا چھالیا کا کترا سنبھال وہیں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ان دولت پتلی کے پاس آن بیٹھی ——— لونڈیا بھی آخر اس ہی کی جائی تھی۔ ماں کے انداز پاگئی۔ نظر میں کھب گئی۔ بڑھیا کا اطمینان گرانے منظور نظر سے نظریں پھیرنے لگی۔ بے اعتنائی کے انداز برتنے لگی۔ دل پر پتھر رکھ کر سب کچھ کیا۔ لیکن کام بنا نہیں۔ اس گرگ باراں دیدہ کا شبہ گیا نہیں ——— آنکھ جھپکتی ہی نہیں یاری کی۔ نسبت کی۔ بھنک الگ معلوم ہو جاتی ہے ——— لڑکی نے اپنی سی کی۔ اصغر نے اپنی سی۔ آخر الذکر نے گھر کے نوکروں کو ملایا۔ ادھر دولت پتلی نے بھی ان کو اپنے بھرے پر چڑھایا۔ خط رقعہ چلنے لگے۔ نامہ و پیام ہونے لگے۔ تحریروں میں اظہار محبت ہوا۔ دل کی لگی بجھائی گئی۔ اصغر نے ملازموں کا منہ سونے چاندی سے بھر دیا۔ ہر خط پر دس دس پانچ پانچ دیتا ——— خود بھی حضرت روزانہ شام کو جاتے دیدار کر آتے ——— رنڈی کا کوٹھا عام مقام کسی کے آنے جانے کی ممانعت ہو نہیں سکتی جیب میں پیسہ ہو دل میں امنگ۔ پھر آ۔ جا رہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہاں حصول مدعا ہو نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے۔ اور گھر والوں کی ہر نئی دشنام پر تھی ——— بڑھیا دل ہی دل میں کھولتی۔ پر کچھ کر نہ سکتی

قانع بہ تخیلی نہ شود شائق دیدار
پروانہ بہ مہتاب تسلّی نہ تواں کرد

دونوں طرف آگ بھڑکتی گئی۔ محبت بڑھتی گئی ـــــــ آتشیں رخسار نے دلوں میں شعلے بھڑکا دیئے۔ مجبور نگاہوں کے پیاموں نے اور ہواری ـــــــ اصغر نے سوال بھی ڈالا۔ پر بڑھیا ٹال گئی۔ پیچھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔ جانبین وصل کے طالب۔ بیچ میں بڑھیا حائل۔ آپس میں وعدے استوار ہوئے۔ لیکن بڑھیا ناگن سی ہر دم جمی رہے۔ ایک پل کو ٹلے نہیں۔ کہیں جائے نہیں آئے نہیں ـــــــ دونوں کے جذبات گھٹتے رہے۔ دلوں میں غبار پکتے رہے آخر لونڈیا ان شدید پابندیوں سے اکتا گئی اور دل میں ٹھان لی کہ اگر موقع مل جائے تو خود فرار ہو جائے۔ اصغر بھی تیار بیٹھا تھا۔ سارے پروگرام مرتب کرلئے گئے تھے ـــــــ اس دوران میں برادری میں سے ایک دو نہیں بیسیوں بلاوے آئے۔ لیکن ڈھیا کم بخت گھر سے ٹلی نہیں۔ کبھی تو صاف ٹال گئی۔ اور جو کہیں مجبوراً جو ہر ان کی حیثیت سے جانا بھی پڑا تو لڑکی کو ساتھ لے گئی ـــ آخر کار ان دونوں نے فیروزی ملازم کو گانٹھا۔ کچھ رقم پہلے چٹائی باقی کا وعدہ کیا ـــــــ یہ سب جانتے تھے کہ نائکہ پلّو سے پلّو باندھے پھرتی ہے۔ پڑی بے آئی جوڑ کر سوتی ہے اب فیروزی کا کام صرف اتنا تھا کہ کوئی دردل لگ جائے۔ لڑکی غدا کی ذرا نگاہوں سے اوجھل ہو جائے پھر تو یار دلبر کر دیں گے اس چالاک نے اپنے لواسے کی بسم اللہ کر ڈالی۔ کنور راج تیلی

دم دولت پتلی شریک ہوئی۔ رات کے ۱۰ بجے جلسہ ختم ہوا۔ تانگوں کی باڑ تا بڑ پڑ رہی تھی جلدی میں بڑھیا کو ایک میں بٹھا دیا لونڈیا کو دوسرے میں۔ کنور راج نے کہا بھی دولت کدھر گئی۔ نیر دی بولا اگلے تانگہ میں جا بھی چکی۔ بڑھیا مجبوراً تانگہ سے اترتی پھر دوڑی کہ برا بھلا کہتی بڑبڑاتی جولی سوار ہو گئی۔ تانگہ والے سے جلدی چلنے کو کہا — اب کیا ہوتا تھا پہلا تانگہ کہیں سے کہیں جا چکا تھا۔ احباب پہلے سے لگے ہوئے تھے تانگہ میں سے موٹر میں کیا۔ کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب کیا کیجیے دیکھیے بھئی بڑھیا ہاتھ ملتی رہ گئی بہت سر پیٹے لیکن بے سود عدالت کچہری بھی کی۔ پر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ مجسمہ ہی کا نام عبیر ہے۔

غرضیکہ مدعا یہ کہ طوائفوں کے نوکروں سے اکثر کام نکلتے ہیں اور وہ بھی اپنے کارآمد ہونے سے واقف ہوتے ہیں۔ پھر ہر موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں — ہم نے بھی شدو کو گانٹھ لیا جس بانو کی باتیں کیں۔ کچھ اندرونی حالات دریافت کیے — عجب لطف تھا ذکر بلبل کے تھے اور مد نظر تھا زاغ۔ مطمع نظر شدو تھا اور منظور بہ نظر حسن بانو کو قرار دیا جا رہا تھا۔ بندوق چھتیا رہے تھے ہرن پر اور نیت سور کی باندھ رکھی تھی — ایسا بھی ہوتا ہے مانا نہیں

پیسہ بُری بلا ہے کسی نے سچ کہا ہے۔ زر برسر فولاد نہی نرم شود ہم نے اچھی بڑی بڑی رقمیں صرف کائیں۔ وہ تو گرویدہ ہو گیا۔ لگا گھر کے

کا دے کاٹنے۔

ادھر تو یہ رنگ چل رہا تھا اُدھر ایک روز جو میں دوپہر کو شاہ بڑے پہنچا نوشہ دوپہر وہاں موجود تھا۔ اور بوا سے اس کی باتیں ہو رہی تھیں میں دور ہی سے اُلٹے قدموں لوٹا ——— لیکن دل میں تجسس تھا۔ دماغ میں ٹوہ۔ تھوڑی دور آکر ٹھٹکا۔ یہ موقع ہاتھ سے نکلا جاتا تھا۔ زیادہ احتیاط مضر نظر آئی۔ سوچا ان میں جو باتیں ہو رہی ہیں اگر معلوم ہو جائیں تو آگے راہ ملنے کا امکان ہو سکتا ہے ——— خدا کارساز ہے نیت بخیر منزل آسان۔ سامنے سے ایک گنوار کا نوعمر لڑکا جاتا نظر آیا میں نے جیب میں سے ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ دھرا اور کہا کہ شاہ بڑے پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ وہاں چھپ کر جا بیٹھ اور پھر ہمیں ان کی ساری باتیں بتا جا سچ ہے۔

اے زر تو خدا نئی ولیکن بخدا
ستارِ عیوب و قاضی الحاجاتی

چہرہ شاہی لیتے ہی وہ تو لگا ہمارے اشاروں پر چلنے میں نے یہ اور ہدایت کر دی کہ جہاں تک ہو سکے نظروں سے اوجھل رہیو۔ دبائے پاؤں چھپ کر جائیو اور ساری باتیں سن کر آئیو نیز یہ بھی کہہ دیا کہ جب مرد چلا جائے تب اس ہی جگہ آجائیے میں مل جاؤں گا۔ ایک اور روپیہ دینے کا بھی وعدہ کر لیا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے شہدو کو ادھر سے جاتے دیکھا۔ پھر

ہمارا سی۔ آئی۔ ڈی۔ آیا ــــــ معلوم ہوا کہ کسی لڑکی کا معاملہ درمیان ہے جو اس موذی شدّو کے قبضہ میں ہے اور بڑھیا اس لڑکی کو بہن کہتی ہے۔ وہ ایک نظر دیکھنا چاہتی ہے۔ شدّو شرطیں لگاتا ہے۔ آج تصویر دکھانے لایا تھا۔ بڑھیا بڑی دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو ــــــ بڑھیا کا یہ بھی کہنا ہے کہ شمشاد تو نے میرے ساتھ دغا کی ہے خدا اسے پائے گا ــــــ میں اس نام پر چونکا اور کہا کیا بڑھیا اس مرد کو شمشاد کہہ رہی تھی۔ لڑکے نے جواب دیا کہ ہاں کئی بار اسی نام سے پکارا تھا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اس نابکار کا اصلی نام شمشاد ہے۔ شدّو نہیں کچھ وجوہ کے تحت یہ تبدیلی کی گئی ہو گی یا شمشاد کا بگڑ کر شدّو ہو گیا ہو گا ــــــ بہر نوع ایک قدم اور آگے بڑھے۔ لیکن منزل ابھی بہت دور نظر آ رہی تھی۔ تاہم میں نے کمر کس رکھی تھی۔ ہمت باندھ رکھی تھی اور مجھ سے زیادہ میری گھر والی تلی ہوئی تھی۔

یہ باتیں معلوم ہونے سے پہلے تو مجھے صرف جذبہ تجسس نے ابھار رکھا تھا۔ لیکن اب تو ہم میاں بیوی کو ہمدردی بار جہ اتم ہو گئی تھی نیز بوا کی کچھ مدد کرنے کی امید نے بے تاب سا کر دیا۔ یہ دل چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کا بھید معلوم کریں اور دلی آرزو پوری ــــــ

جس دن سے میں نے بوا کو شمشاد یا شدّو سے باتیں کرتے سنا تھا ذہن میں یہ چیز پیدا ہو گئی تھی کہ اس آفت رسیدہ فلک زدہ کی کچھ نہ کچھ

امداد ممکن ہے۔ آرزو پوری کی جاسکتی ہے۔

اس سے پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا کو جھلس کر بواسنے یہ آتش و سم کی دنیا بسائی ہے۔ چلم اٹھائی ہے۔ لیکن اب سمجھا کہ اس تودۂ خاک میں ابھی امید کی چنگاری باقی ہے۔

میں روزانہ ذرا ذرا سی بات بیوی سے کہتا تھا اور وہ بھی کرید کرید کر پوچھتی تھی۔ جب میں نے آج کا واقعہ اسے سنایا تو وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی بات اور بھی پیچ در پیچ ہوتی جارہی ہے۔ گل چھٹیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھر بھی اب اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ بوا کی کوئی لڑکی ہے جو اس شخص کے قبضہ میں ہے۔ بوا اسے دیکھنا چاہتی ہیں اور یہ دکھاتا نہیں تو ستاتا ہے۔ ڈراتا دھمکاتا ہے۔ ان طریقوں سے جو کچھ بھی ان سے اینٹھ سکتا ہے اینٹھتا ہے۔ اور یہ ماتا کی ماری منڈلاتی رہتی ہیں۔

میں نے بیوی سے کہا کہیں حسن بانو ہی تو وہ لڑکی نہیں۔ وہ بولی تم یہ بتاؤ کہ ناک نقشہ بوا سے ملتا ہوا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جہاں تک میرا خیال ہے ہرگز ہرگز نہیں ملتا۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ماں بیٹی ایک جیسی ہوں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ ایک جیسی ہونا تو ضروری نہیں اور ہوتی بھی نہیں۔ اب ہماری صغریٰ ہی کو دیکھ لو پھر بھی اولاد کے منہ پر ماں باپ کے چہرہ کی ایک جھلک ہوتی ہے کبھی نہ کسی پہلو سے دیکھتے ہوئے اچانک شبہ سا پڑتا ہے۔ تم اب کے جاؤ

گو یہ بات ذرا غور سے دیکھ تا۔

ہم لوگ چونکہ پانچویں حسن بانو کے ہاں جاتے ہی رہتے تھے۔ اس بار جو گئے تو خد و خال بغور دیکھے ——— بوا کی بھی آنکھیں بڑی بڑی تھیں حسن بانو کی بھی ——— دونوں گوری چٹی تھیں حسن بانو تو بیوہ و شہاب تھی۔ تاہم بوا کی جلد بھی بتا رہی تھی کہ کبھی اس میں سے بھی رنگ گلاب جھلکتا تھا ——— ستواں ناک۔ کشادہ پیشانی ہر دو میں پائی جاتی تھی۔ اس سب کے باوجود ایک چیز کی حسن بانو کے چہرے میں کمی تھی اور وہ تھا خاندانی وقار۔ ایک امتیازی شان۔ گھر یلو ادا۔ شریف خون کے تیور۔ اس سب کے علاوہ حسن بانو کے چہرہ کو دیکھتے ہوئے کسی عنوان بھی بوا کا ذہن مستحضر نہیں کرتا تھا ——— میں نے سوچا ماحول کا اثر ہے۔ پھر خیال آیا کہ بوا اس سے بدتر ماحول میں ہیں عقل بولی اس کی پرورش اس ہی ماحول میں ہوئی ہے۔ بوا بخت ہونے کے بعد شاہ بڑے پر آئیں۔

بہرکیف میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور اس ہی کشمکش و پیچ میں رہا۔ بیوی نے دریافت کیا تو اس سے بھی میں نے یہی کہا کہ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا ——— میری گھر والی کی رائے تھی کہ حسن بانو بوا کی لڑکی نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو ستہ دا اسے اس طرح کھلے ہوئے منظر عام پر نہ رکھتا۔ نیز اس کی اپنی حیثیت وہاں ملازم کی سی نہیں ہو سکتی تھی ——— چونکہ قرائن بتاتے ہیں کہ بوا کی لڑکی پر اس کا

قبضہ ہے۔ پھر اس گھر میں وہ مالک کی شکل میں ہوتا ملازم کی صورت میں نہیں۔ اس کے علاوہ تم کہتے ہو کہ حسن بانو کی اچھی خاصی آمدنی ہے۔ اس حالت میں شدّو کا بوا کے پاس جا کر روپیہ حاصل کرنا بے معنی چیز ہے۔ لبِ لباب اس ساری گفتگو کا یہی نکلا کہ کوشش جاری رکھی جائے ڈٹے لگاتے رہیں۔ اپنی کوشش میں کمی نہ ہو آگے اللہ مالک ہے۔

حسن بانو کے ہاں آج کل ایک نواب صاحب آرہے تھے۔ اور ہزاروں روپیہ لٹا رہے تھے ——— لوٹ رہے تھے۔ حال ہی میں ان کے محترم بڑے نواب صاحب نے انتقال فرمایا تھا۔ تمام جاگیر جائداد ان کے ہاتھ آئی تھی۔ دل کھول کر دل کے ارمان نکالے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے شروہ چٹ۔ لیموں نچوڑ۔ نوالہ عاجز خوشامدیوں نے گھیر رکھا تھا۔ لڑکے کو روز نئی چاٹ پر لگاتے تھے۔ اس ڈھب سے دیمک کی طرح ساری دولت چاٹ رہے تھے ——— ان زمانہ ساز دل خانہ برانداز دل نے مے و معشوق کی حد سے گزر کر اب نئے نواب کو سفید پری کی ہلکٹ پر لگایا تھا ——— ان کاردانوں کا کہنا تھا کہ شراب ایک حد تک پی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد انسان نہ پینے کا اہل رہے نہ پلانے کا۔ اس رام رنگی کے دور میں ہاتھ زیادہ نہیں رنگے جا سکتے ——— معشوق کی بھی حدیں ہیں اور عشق ہوس کار کی بھی سرحدیں بے حد و اندازہ جہاں لوٹ مچائی جا سکتی ہے وہ سفید پری یعنی کوکین ہے ——— ایک دن میں آدمی دس ہزار کی بھی کھا سکتی ہے۔

بیس ہزار کی بھی۔ نیز آٹھ آنے کی پڑیا کے دس روپے دیئے جا سکتے ہیں جس وقت طالب کو ٹونس ہو اس وقت اگر لاکھ روپیہ تولہ ملے تو بھی لینا ہے۔ پھر چوری چھپے کے معاملے۔ ہر قدم پر جائیں چھپے کا موقعہ ——— مدعا یہ کہ ان فتنہ کاروں نے اس بے چارہ کو اس لت پر لگا رکھا تھا اور روزانہ جشن بالو کے کمرے پر یہ رنگ رہتا ——— چونکہ وہاں یہ مجرمانہ حرکات ہوتی تھیں، اس وجہ سے میں نے قدرے آر جار کم کر دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسی جگہ بیٹھنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ کر تو ڑ و نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ پھر بھی ایسا تھا کہ آٹھویں دسویں پھیری لگا لیتا۔ وہ بھی ذرا اول وقت چونکہ یہ لوگ اپنے اشغال رات چڑھے شروع فرماتے تھے۔

ایک روز جو میں بعد مغرب جھٹ پٹا ہونے پر پہنچا تو دیکھا کہ گھر ماتم کدہ بنا ہے۔ ہو کا عالم۔ نہ استاد۔ نہ شاہد۔ نہ طوائف۔ نہ نائکہ ——— قبرستان کے حوالہ دار بوڑھے گیدڑ کی طرح کتن بیٹھا کھنکار رہا ہے ——— یہ شخص سدا ایک کونہ میں بیٹھا رہتا تھا اور ہم نے کبھی اس کی جانب غور بھی نہیں کیا تھا ——— اس سے جو دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ یہ سب لوگ کہاں گئے۔ کمرہ کیوں بند پڑا ہے۔ خیریت تو ہے ——— ان تمام سوالات کے جواب میں کتن نے ہم کو سر سے پا تک دیکھا۔ پورا پورا جائزہ لیا۔ کھنکارا پر کچھ بولا نہیں۔ میں نے پھر سوالوں کی بوچھاڑ کی لیکن بے سود۔ اُدھر سے کوئی ترشح نہ ہوئی۔ ہر بار مجھے اُلو کے سے دیدوں سے

دیکھتا کھاتا اور خموش ہو جاتا ـــــ اس قسم کے افراد رنڈیوں کے ہاں اکثر ملتے ہیں۔ جو نٹ ناٹ دیدم دم نہ کشیدم کے معتقد ہوتے ہیں۔ ان کنوؤں میں سے کوئی چیز برآمد نہیں کی جا سکتی۔ اگر کھلتے ہیں تو بس اسی وقت جب رنڈی اپنے خاص طریقے سے کھل صم صم کہے ورنہ اہلِ عالم اور ان کے درمیان سکوت کی دیواریں حائل ہیں ـــــ ان میں سے ہر ایک ایک مستقل افسانہ ہوتا ہے۔ مکمل داستان ـــــ واللہ اعلم ایسی کتنی داستانیں ہیں جو آج تک زیبِ قرطاس نہیں ہوئیں اور بادِ مرگ نے ان کا ورق الٹ دیا۔ قبر نے صحیفہ بند کر دیا۔ یہ شخص بھی اسی قسم کی ایک کتاب خاموش تھا۔

جب یہ حضرت بالکل کچھ نہ بولے تو میں نے سوچا نیچے چل کر کسی کارندے سے دریافت کروں۔ کچھ تو پتہ چلے، بھید کھلے ـــــ مجھے حسن بانو کا تو اتنا خیال تھا بھی نہیں۔ اصل میں رشید کی فکر تھی۔ چونکہ حقیقتاً تو منظورِ نظر وہی تھا ـــــ ابھی میں اسی فکر و تردد میں تھا نیچے کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ کہ تانگوں میں یہ سارا قافلہ سراسیمہ و پریشان حال آتا نظر آیا۔ لیکن ان کے ساتھ بھی رشید کہیں دکھائی نہ دیا۔ بہر صورت ان لوگوں کو دیکھ کر میری ڈھارس بندھی اور نظریں بچا کر کوٹھے پر چڑھ گیا ـــــ ـــــ ہر شخص پریشان خاطر اور متوحش سا دکھائی دیا۔ میں بڑھیا پاس جا کر بیٹھا اور کہا خیر تو ہے۔ وہ بولی کیا کہوں مرزا صاحب ناگہانی آن پڑی ہے۔ وہ جو نگوڑا یوسف آتا تھا نہ ـــــ اب وہ قبلہ نواب صاحب محترم

سے صرف لنگوڑا یوسف رہ گئے تھے ——— یہ کوٹھوں کی دنیا ہے۔ طوائفوں کا عالم۔ جہانِ رنگ و بو۔ یہ گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ یہاں کی نیرنگیاں فلکِ تلون مزاج سے کم نہیں۔ انہی آنکھوں نے جن اصحاب کی آمد پر سروقامت کھڑی ہوتے دیکھی تھی انہی ہانیوں کو جلیں بھرتے دیکھ لیا ——— جن پر رنڈی داری صدقہ جاتی تھی انہیں دھتکاریں کھاتے سن لیا ——— جن ہاتھوں نے یہاں لاکھوں لٹائے تھے وہی سنگِ در سے لگے دستِ طلب دراز کرتے دیکھے گئے۔

بہرصورت یہ تو جملۂ معترضہ تھا، آمدم برسرِ مطلب۔ بڑی بی نے ہم کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ ہوا یہ کہ نواب صاحب یا لنگوڑا یوسف اب جو چاہے سو کہیئے۔ ان کے گھر آتا جاتا رہا۔ کوکین کا چسکا تو پڑ ہی چکا تھا۔ اکثر دبیشتر شدّو خرید کر لاتا تھا۔ ایک روز رات کے بارہ بجے لینا ہوا پکڑا گیا۔ پولس نے ان کے کوٹھے پر بھی چھاپہ مارا۔ وہاں سے بھی اچھی خاصی برآمد ہوئی ——— حوالات کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ سب تو ضمانت پر نکل آئے۔ شدّو ابھی وہیں پڑا ہوا ہے۔

میں نے اظہارِ ہمدردی کیا ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے قابل کوئی کام ہو تو فرما دیجیئے گا۔ تھوڑی دیر اور لٹکا رہا۔ دلاسہ دیا۔ پھر تو وہ بے بتہ چلا۔ وہاں سے سرکا۔

اب مجھے فکر تھی شدّو سے ملنے کی۔ سو کچھ تو رقم خرچ کی۔ کیل سے

مشورہ کیا اور خواست گذاری۔ اور رشدو سے ملاقات کی ——— وہ سخت برہم تھا۔ دولت اور دولت کی ماں کو مغلظات سنا رہا تھا اور درحقیقت اسے حق بھی تھا۔ ان لوگوں نے زیادتی کی تھی غضب خدا کا خود تو ضمانت پر نکل بھاگیں اور اس کی بات بھی نہ پوچھی۔ حالانکہ یہ غریب انہی کی وجہ سے ماخوذ ہوا تھا۔

میں نے تسلی تشفی دی اور کہا تم فکر نہ کرو۔ اول تو میں ایسا ڈول ڈالوں گا کہ وہی لوگ تمہاری بھی ضمانت داخل کریں۔ نہیں تو میں خود دوں گا۔ اُس نے کہا اللہ تمہارا بھلا کرے۔ بُرے وقت میں شریف ہی ساتھ دیا کرتے ہیں۔ ان کمینوں سے مجھے کوئی توقع نہیں ——— میں نے کہا یہ کام مجھ پر چھوڑو اللہ نے چاہا تو بڑھیا ضمانت دے اور تمہاری خوشامد کرے۔ سو الگ تم دیکھتے رہو۔ ان لوگوں کی اس ذلیل حرکت پر مجھے بھی غصہ چڑھا ہوا ہے۔ وکیل سے مشورہ کر آیا ہوں۔ وہ میرا اپنا آدمی ہے۔ جائداد کے سارے مقدمات وغیرہ وہ ہی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مجھے ضمانت داخل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہی اپنی گوں کو دیں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ ساتھ میں نے ایک دس کا نوٹ نکال کر رشدو کو دیا اور کہا یہ اپنے پاس رہنے دو۔ کچھ چاہیے ہوگا تو منگوا لینا۔ میں پھر آؤں گا تم بے فکر رہو۔

اُس نے جب مجھے ہمدرد پایا تو بولا۔ ایک بات مجھے آپ سے اور کہنی ہے۔ پردہ رہے آپ ہی تک۔ باہر نہ نکلنے پائے۔ میں نے اطمینان دلایا اور کہا بات جان کے ساتھ جائے گی۔ تم بے فکری سے کہہ دو۔ یوں سمجھو جیسے

باؤلی میں پتھر ڈال رہے ہو۔ آواز تک اوپر نہیں آئے گی۔

کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔ مرزا صاحب میری ایک لڑکی ہے۔ ابھی تک اُسے دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھا۔ آپ جانیں ہیں ایسے ہی لوگوں میں گھرا ہوا ہوں۔ انسان کی نیت ڈانوا ڈول ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ایمان بگڑ سکتا ہے ——— لڑکی کی آب موتی کی سی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اتری سو اتری۔ پھر اپنا گذر بسر بھی ننگا ترنتی ہی سے ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کا بھٹک جانا ناممکن نہیں جس بانو کی اماں نے ہزاروں بار کہا کہ ایک نظر بچی کو دکھا تو دوں۔ پر میں سدا ٹالے بالے دیتا رہا۔ جانتا کہ جو اس ڈلا کی آنکھ ایک دفعہ بھی پڑ گئی تو یہ حرافہ چھوڑنے والی ہے نہیں۔ کسی نہ کسی ڈھب سے کوٹھے پر لا ہی بٹھائے گی۔ اسی لئے اسے موقعہ نہ دیا۔ اس کی ماں نے آخری وقت میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا تھا کہ اس کا پلو کسی شریف سے باندھ دینا سو یہی کوشش ہے! اللہ پوری کرے ——— اب میں یہاں بند ہوں۔ دل بچی میں پڑا ہوا ہے۔ خدا معلوم اس معصوم پر کیا گذر رہی ہوگی۔ مجھے اوپر خدا کا آسرا ہے۔ نیچے تمہارا۔ یہ ثواب کا کام کرو تو بڑا کام کرو۔ جب تک میں یہاں ہوں ذرا اس کی خبر گیری کر لو۔

——— میں نے جواب دیا سر آنکھوں سے کہا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ جیسی تمہاری بیٹی ویسی میری بیٹی۔ اس معاملہ میں میرے تمہارے بیچ خدا ہے۔ اس کے بعد شدو نے مجھے گھر کا پتہ بتایا۔ کنجی وہی اور کہا میں سدا باہر سے قفل ڈال آتا ہوں۔ تم کھول لینا اور ہاں میں بتانا بھول گیا۔

بچی کا نام یہاں آرہا ہے۔

اب مجھے شدّو کے پاس ایک ایک پل بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ مدعا مل گیا تھا۔ دل چاہتا ہے پر لگا کر اُڑ جاؤں۔ اور وہاں پہنچ جاؤں لیکن اس طرح فوراً آنا مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لئے کچھ دیر اور پھر درویش بجانِ درویش بجز دا کرانہ بیٹھا رہا۔ اور پھر ایک بار شدّو کا اطمینان کرا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ جو پتہ بتایا تھا وہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ تاہم مجھے منٹوں کی منزل گھنٹوں کی معلوم ہو رہی۔ دل میں ہزار طرح سے وسواس آرہے تھے خیالات جگہ پا رہے تھے —— ترکمان دروازہ میں فصیلوں کے قریب ایک اُجاڑ سے مقام پر بوسیدہ اور شکستہ مکان تھا۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے قفل کھولا۔ اندر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ عقل نے روکا اور کہا سودائی ہوا ہے۔ گھر میں لڑکی اکیلی ہے۔ ایک غیر مرد کو یوں درانہ آتے ہوئے دیکھ کر دہل جائے گی۔ مناسب ہے کہ پہلے دستک دے تاکہ وہ آگاہ ہو جائے۔ قفل کھلنے کی آواز ضرور سنی ہو گی۔ کنڈی کی آہٹ اُسے ہوئی ہو گی لیکن یہ خیال ہو گا کہ شدّو آ رہا ہے۔ نگاہیں اس کی متوقع ہونگیں۔ تجھ کو دیکھ کر تہلکے میں آجائے گی

بہر نوع اس تخیل کے تحت میں نے دستک دی۔ اندر سے صدائے برنخاست۔ سوچا یہ تو ممکن نہیں کہ دستک نہ سنی ہو اور پھر خصوصیت سے

ایسی حالت میں جب کہ آواز پر کان لگے ہوئے ہونے چاہئیں. میں نے ایک بار پھر کنڈی بجائی. جب کوئی آواز نہیں آئی تو کھنکارتا پاؤں کی آہٹ کرتا اندر داخل ہوا تاکہ بچی کا یہ اطمینان ہو جائے کہ کوئی چور چکار چھپ کر نہیں آ رہا.

پہلی نگاہ گھر کے چاروں کونوں پر گئی. وہاں کوئی نظر نہ آیا. انگنائی میں کھڑے ہو کر میں نے ایک دو بار جہاں آرا جہاں آرا کہہ کر آواز دی لیکن کسی نے جواب نہ دیا ـــــ گھر بھی کچھ ایسا لمبا چوڑا نہ تھا. صدر میں ایک دالان. اُس کے دونوں جانب کوٹھریاں. بائیں میں باورچی خانہ غسل خانہ اور بس.

میں پہلے ایک کوٹھڑی کی طرف گیا. وہاں کوئی آثارِ حیات نہ پائے. اب دوسری طرف بڑھا تو اندر سے آواز آئی. آپ کون صاحب ہیں میری جان میں جان آئی اور بچی کا اطمینان کرانے فوراً بیٹی کہہ کر جواب دیا اور کہا مجھے شدّو نے بھیجا ہے. وہ خود نہیں آسکا. تمہاری طرف اس کا خیال لگا ہوا تھا. مجھے کنجی دے دی تھی اور کہا تھا ذرا خیر خبر لے آؤں اور جو کچھ آپ کو درکار ہو بازار سے لا دوں ـــــ ان باتوں کا اندر سے کوئی جواب نہیں آیا. میں تھوڑی دیر وہاں ٹکا. پھر یہ کہہ کر باہر آیا کہ میں پان دان کا انتظام کرنے جا رہا ہوں. ابھی آتا ہوں. آپ اطمینان رکھیں ـــــ سقہ سے پانی بھروایا. بازار سے گوشت ترکاری وغیرہ لایا. احتیاطاً حلوائی کے ہاں سے بھی کچھ تھوڑا بہت کھانے کو لے گیا.

اس کے بعد تھوڑی دیر وہاں ٹکا پھر اتنا کہہ کر میں آج شام کو یا کل سویرے پھر آؤں گا اُٹھ آیا ——— یہاں سے سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی کو ساری داستان سنائی ——— میں نے کہا صورت تو دیکھی نہیں جو کہہ سکتا کہ بوا سے ملتی ہے یا نہیں۔ ہاں آواز سنی ہے۔ سو اتنا جانتا ہوں کہ بوا کی آواز کو جرس کھا گیا ہے۔ جب کان بچی کی آواز سن رہے تھے تو دماغ ایسا محسوس کرتا تھا کہ کوئی ریکارڈ جو گھسا ہوا سنا تھا آج وہ صحیح اور اچھی حالت میں سن رہا ہوں۔

اب مشاورۃ طلب امر یہ تھا کہ پہلے تو لڑکی کی صورت دیکھی جائے۔ پھر اگر وہ کچھ حال سنا دے تو واقعات کی کڑیاں جوڑ کر کہیں سلسلہ ملایا جائے اور تصدیق کریں کہ جہاں آرا بوا ہی کی گم گشتہ ہے یا کوئی اور لڑکی اور یہ سب جلدی ہونا چاہیئے۔ چونکہ شدّو کے باہر نکلتے ہی دشواریاں پیدا ہو جانے کا پورا اندیشہ تھا۔

اب دقت یہ تھی کہ بُوا کو میں نے دیکھا تھا اور جہاں آرا مجھ سے پوشیدہ آخرالذکر کو بیوی دیکھ سکتی تھی۔ لیکن بُوا کو اس نے نہیں دیکھا تھا ——— آخرکار یہ قرار پایا کہ وہ برقعہ اوڑھ کر پرے پرے جائے اور بوا کا معائنہ کرے۔ میں کچھ فاصلہ سے اسے نگاہوں میں رکھوں گا ———

میری اہلیہ پردہ گوشہ کی رہنے والی۔ گھر سے قدم کبھی پہلے باہر نکالا تھا پیدل کا جانا اور پھر جانا بھی شاہ ٹرے۔ تاہم ارادہ کر لیا تھا۔ خوش نصیبی نے دست گیری کی۔ بوہی تیار ہو گئی۔ زرا کی ذرا اس تجویز کو سنکر

چہرہ پر زردی سی کھنڈی تھی۔ لیکن چتون بتا رہی تھی کہ ارادہ پکا ہے قدم پھرنے والے نہیں۔

اب وقت کھونے کا وقت نہ تھا۔ میں فوراً تانگہ لے آیا۔ پردہ باندھ بیگم کو بٹھا روانہ ہوگیا ——— اس کے بعد دقت یہ تھی کہ اتنے پردہ سنٹرے نکلنے کے بعد شاہ بُڑے پر اترنا یعنی چہ ——— میں نے اس کی یہ تدبیر نکالی کہ تانگہ لال قلعہ کے سامنے والی سنہری مسجد پر روکا۔ بیوی کو قریب کے مزار پر لے جا بٹھایا۔ تانگہ کا کرایہ ادا کر اُسے چلتا کر دیا۔ چونکہ اس مزار پر اکثر عورتیں چراغ جلانے منتیں ماننے آتی رہتی تھیں بنا بریں تانگہ والے کو قطعاً کوئی شبہ نہیں ہوا ——— کچھ دیر وہاں ٹکنے کے بعد اب ہم دونوں نے شاہ بُڑے کی راہ لی۔ بیوی کو اتہ پتہ خوب سمجھا دیا۔ پھر دو قدم آگے جا کر انگلی سے اشارہ کر کے مقام دکھا دیا۔ وہ برقعہ اوڑھے قدم قدم اُدھر چلی۔ میں دُور سے نظروں میں رکھا ——— اس نے پرے پرے شاہ بُڑے کے دو چکر کاٹے وہاں سوفتہ وتھا۔ بالکل سُونا بازار ——— اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ نیک بخت تو اندر گھُسی چلی جا رہی ہے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہوگیا دل نہ مانا وسواس آنے لگے۔ عقل نے قدم پکڑے۔ لیکن میں رُک نہ سکا اور میں بھی کچھ دیر ادھر اُدھر پھر جا پہنچا ——— دیکھا تو بیگم کی بُوا سے باتیں ہو رہی ہیں اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں۔

میرا اس وقت آنا بُوا کو ناگوار گذرا۔ تیور بتا رہے تھے۔ اُٹھ کر

آئیں تو سہی۔ لیکن صرف اتنا کہنے کہ اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ میری پرانی جانب کار ہیں۔ مدتوں میں آئی ہیں۔ کل آجانا۔ میں نے جب راکر پوچھا بھی کہ آخر ہیں کون تو جواب ملا تم کو کیا مطلب۔

ہم اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹے۔ ادھر اُدھر کا دے کاٹتے رہے آخر کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد بیگم سُرخ رو چونڈا ہندوستان کے مشہور ترین جنڈو خانہ سے برقعہ پٹر کاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ ہم اول تو دور دُور رہے۔ پھر بُوا کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ساتھ ہو لئے۔

میں نے کہا ماشاء اللہ تم نے تو پہلے ہی دن ایسا رنگ جمایا کہ ہماری رنگت ہی پھیکی پڑ گئی۔ ایسی کونسی پڑکی ڈال دی۔ کیا جادو کر دیا۔ وہ مسکرا کر بولیں دیکھا عورت اس کو کہتے ہیں۔ میں منٹوں میں وہ بھید نکال لائی جو تم مہینوں میں نہ کرید سکتے۔ اب گھر پہنچ کر سب کچھ سناؤں گی۔

دریا گنج سے تانگہ لے ہم واپس آئے۔ مجھے تو بے چینی لگی ہوئی تھی فوراً پوچھا کیا باتیں ہوئیں بتاؤ تو سہی۔ جواب ملا پہلے مٹھائی کھلواؤ۔ میں بولا تمہارے منہ میں گھی شکر۔ جتنی مٹھائی کہو گی کھلواؤں گا۔ تم پہلے بتاؤ تو سہی میرے پیٹ میں درد ہوا جا رہا ہے —— آخر کو معلوم ہوا کہ بیوی جب باہر سے بوا کا چہرہ پوری طرح نہ دیکھ سکی اور اندر اکیلا پایا تو دل کڑا کر اللہ کا نام لے بوا کے قریب جا پہنچی۔ انھوں نے گردن اُٹھا کر دیکھا اور کہا کیا چاہیئے۔ یہ جانے کو تو ہمت کر کے چلی گئی تھی لیکن گفتگو کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔ دماغ اس غیر متوقع سوال کا جواب تلاش

کہ رہی تھا کہ اللہ کے قربان جائیے اُس نے زبان سے بے ساختہ کہلوا دیا کہ ہم کو ایک کھوئے ہوئے کی تلاش ہے ـــــ گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے۔ اس بار بوا کی نگاہ ہمدردی سے چھلکتی ہوئی اٹھی اور پوچھا تمہارا کون کھو گیا ـــــ بیوی نے ایک مصنوعی آہ بھر کر کہا۔ کیا بتاؤں میری بچی آج چار دن سے لاپتہ ہے۔ سینہ میں چھاج لگے ہیں۔ شہر کا چپہ چپہ ڈھونڈ مارا پر بے نتیجہ۔ دل نگوڑا کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ ایک اللہ کے بندے نے یہاں کا پتہ دیا۔ سر پہ برقعہ ڈالی پوچھتی پوچھتی ادھر آ گئی۔ میں سمجھی تھی یہاں مرد ہوں گے۔ جب تم کو دیکھا تو ڈھارس بندھی۔ میں نے سوچا اندر چلی چلوں۔ کچھ اپنا دکھ درد کہوں گی۔ کچھ اُن کا سنوں گی۔ شاید پاک پروردگار کوئی شکل نکال دے۔ نہیں تو دو گھڑی غم ہی غلط ہو گا۔ پر وہ تو دم کے ساتھ ہے۔ ہر گھڑی یاد آتی ہے۔

بیوی کا کہنا تھا کہ بوا بار بار کنکھیوں سے مجھے دیکھتی تھیں پر آنکھ نہ ملاتیں ـــــ میں بھی سراپا درد بن ہو بیٹھی۔ آخر بوا نے خود ہی پوچھا تمہاری بچی کتنی بڑی تھی۔ کیسے کھوئی گئی۔ بیوی نے جواب دیا۔ بہن کیا بتاؤں۔ خیر سے آٹھویں میں لگی تھی۔ میرے اعمال کی شامت گلی میں ایک شدو شہدہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار اس کمبخت کے ساتھ بازار بھیج دیتی تھی۔ مجھے بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ وہ میرے ساتھ دغا کرے گا۔ جمعرات کے دن بچی نے ضد کی کہ جامع مسجد جاؤں گی۔ میں نے ٹالا بھی وہ

نہ مانی ہیں نے کہا شمشاد چچا کو آواز دے لے۔ ان کے ساتھ چلی جایئے

—— اس نام پر بوا چونکیں اور داستان زیادہ غور سے سننے

لگیں —— بیوی کہے گئی۔ بولی۔ بس اس منحوس گھڑی کے بعد

سے بچی کی صورت کو ترس گئی ہوں۔ میری تو پھوٹی آنکھ کا وہ ہی

ایک دیدہ تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ اب دنیا اندھیر ہے چوبیس

گھنٹہ جوتیاں چٹخاتی چاروں طرف پھرتی ہوں جب تھک جاتی ہوں ٹھیا

پر جا پڑتی ہوں۔ نہ خدائے مارے شمشاد کا کہیں پتہ ملتا ہے نہ میری چھچھیا کا۔

خدا جانے کہاں ہو گی کہاں نہیں ہو گی۔ کیا کہوں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بوا نے پوچھا ان کے ابا کہاں ہیں۔ اس سوال پر بوی لجائی۔

اس کا کہنا تھا کہ دل ہی دل بس بہت کچھ چھائیں پھوئیں کر کے جان

سے دور۔ دشمنوں کے کان بہرے وغیرہ کہنے کے بعد دبی زبان سے کہا

کہا چار سال ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے —— میں نے کہا کیوں

صاحب یوں ہمیں ختم کیا جا رہا ہے۔ اچھی بات ہے۔ یہ فال زبان نکال

رہی ہو۔ خیر ہمارا بھی اللہ مددگار ہے۔ جسے وہ رکھے اسے کون چکھے۔

اس وقت مہرالنساء کی نظریں میری جانب کچھ اس طرح اٹھ رہی

تھیں۔ جیسے دست دعا اٹھے —— دیکھیں کہہ رہی تھی کہ یہ

تم کیا کہہ رہے ہو۔ دل پر پتھر رکھ کر یہ الفاظ زبان سے نکالے

گئے تھے خدا تم کو سلامت رکھے۔ میری تو دنیا تمہارے دم سے ہے

تم میرے سر تاج ہو۔ تمہاری گود میں آئی تھی تمہارے کندھوں پر جانا چاہتی ہوں

قصہ مختصر یہ دونوں ایک ہی قسم کی غم زدہ ایک مصنوعی ایک اصلی باہم شریک غم ہوگئیں۔ بوا نے باتوں باتوں میں شمشاد کا حلیہ دریافت کرنا چاہا۔ جسے بیوی یہ کہکر ٹال گئی کہ میں تو پردہ کے پیچھے سے بات کرتی تھی۔ مہترانی سے دریافت کر کے بتاؤں گی۔ بوا بولیں کیا شدّو بھی وہ ہی کہلاتا تھا۔ بیوی نے جواب دیا کہ اصل نام شمشاد تھا۔ ویسے لوگ باگ شدّو شدّو بھی کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ ساری داستانیں سن کر بوا بھی ذرا سا قبولیں۔ قلعہ راز کا آہنی دروازہ قدرے قلیل کھلا۔ بس اتنا ہی کہا کہ بہن میرے بھی سینہ پر بھی داغ ہے تم پھر بھی آنا۔ مل بیٹھ کر دکھڑے روئیں گی پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ بہن یہ جگہ شریف عورتوں کے قابل ہے نہیں۔ تم نہ آؤ تو بہتر ہے۔ بیوی نے جواب دیا کیا کروں دل کے ہاتھوں دیوانی ہو رہی ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میری بچی کسی طرح مل جائے۔ ہر گھڑی کوئی بیٹھا کلیجہ مسوسے ڈال رہا ہے۔ اپنے کو سنبھالے پھری ہوں تمہارے پاس میرا ذرا دل بہلا۔ اب اگر تم نہیں آؤ گی تو مجھ ہی کو آنا پڑے گا۔ ہزار دفعہ آؤں گی۔ میرا تو اندر والا مانے گا نہیں۔ جب تماری منہ کی کوئی کہا کرے گا کوئی۔ یہ ماما سب ہی کو نے جھکائے گی۔

میری بیوی کا کہنا تھا کہ یہ باتیں سنکر بوا کچھ پسیجیں اور بولیں اچھا اب تم نہ آنا۔ میں ہی آؤں گی۔ اپنا پتہ بتا دو۔ بیوی نے انھیں گھر کا پتہ بتلا دیا اور ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میرا کچھ ٹھیک نہیں۔ دن رات

سر لپھرا پھرتی رہتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آئیں بھی اور میں نہ ملوں۔ اس لئے کوئی وقت اگر طے کر لیں تو بہتر ہے۔ دوسرے دن دوپہر کا وقت مقرر پایا۔

یہ باتیں کر میں اور بیوی شدّو کے گھر جہاں آرا پاس پہنچے، عورت کو دیکھ اس کی بھی ڈھارس بندھی کچھ دیر دونوں کی باتیں ہوتی رہیں بیگم کو وہاں چھوڑ شدّو کی خیر خبر لینے جیل خانہ پہنچا۔ اسے دلاسہ دیا کچھ روپے اور دے آیا۔ کہا کوشش کر رہا ہوں اللہ مالک ہے وہ بھی جہاں آرا کی طرف سے متردد تھا۔ میں نے اطمینان دلایا اور کہا بے فکر رہو میں روزانہ جاتا ہوں۔ کھانے پینے کا سامان دے آتا ہوں۔ پوچھا قفل لگا آتے ہو۔ میں نے کنجی دکھا دی اور کہا ابھی وہیں سے آرہا ہوں ——— وہ بھی ایک جہاں دیدہ تھا بڑے ڈھب سے پوچھا کہ میں نے لڑکی کو دیکھا تو نہیں۔ بولا دو دن کی پریشانی میں بچی زرد پڑ گئی ہوگی۔ میں نے کہا معلوم نہیں۔ اس نے مجھ سے پردہ کیا سامنے آئی نہیں۔ یہ الفاظ سن کر شدّو کے چہرہ پر قدرے اطمینان کے آثار تھے اور سچ بھی یہی تھا بس آواز سننے کا گناہ گار ضرور تھا۔ صورت نہیں دیکھی تھی۔

واپسی میں بیوی کو ساتھ لیتا ہوا پہنچا ——— اس نے کہا لڑکی بوا کی تصویر ہے۔ وہی آنکھ وہی ناک نقشہ۔ رتی رائی کا فرق نہیں۔ پھر بولی میں نے بچی سے بات کر لی ہے۔ وہ رات کو اپنے کپڑے لتے باندھ رکھے گی۔ صبح کو ہم تم جا کر لے آئیں گے وہ بھی وہاں پر خوش نہیں ہے ایک تو

اکیلے پڑے پڑے گھبرا گئی ہے۔ دوسرے شدو کی طرف سے مستبہ بھی ہے۔ نہیں جانتی کہ اس کی کیا نیت ہے پر بچی ہے خائف۔

رات جوں توں کر کے کاٹی۔ صبح ہی ہم دونوں جہاں آرا پاس جا پہنچے۔ لڑکی نے رات بھر میں کچھ سوچا تھا۔ میری بیوی سے کہنے لگی میں اللہ کے اور آپ کے بھروسہ چل رہی ہوں ـــ عورت کی ذہنیت اور اس کے جذبات عورت ہی خوب سمجھتی ہے میری بیوی گھر سے چلتے ہوئے ایک بچی کو ساتھ لائی تھی۔ میں نے منع بھی کیا پر وہ بولی تم نہیں جانتے اس کی ضرورت ہے۔ اب جونہی جہاں آرا نے یہ الفاظ کہے بیوی نے اپنی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا اس کی قسم ہے تمہیں سدا بیٹی سمجھوں گی جو تمہارے ساتھ دغا کروں تو میری اولاد کے آگے آئے ـــ جہاں آرا شدو کے پاس بھی اپنے کو کچھ زیادہ مامون محسوس نہ کرتی تھی۔ اتنا اطمینان پا بسم اللہ کہ ساتھ ہولی۔

آج ہی دوپہر کو بوا نے آنے کا وعدہ کیا تھا ـــ بیوی نے جو جہاں آرا سے باتیں کیں تو ہم لوگوں کو سولہ آنے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہی بوا کی بیٹی ہے ـــ اب سوال یہ تھا کہ اس یوسف گم گشتہ کو یعقوب سے کیوں کر ملایا جائے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں شادی مرگ نہ ہو جائے ـــ بچھڑی ہوئی ماں بیٹیاں برسوں بعد ملیں گی، ایک دوسری کو دیکھ کر ہوش و حواس نہ کھو دیں۔ جان نہ دے دیں۔ فرط مسرت دل کی حرکت بند کر دے۔ اللہ بری گھڑی سے بچاؤ

شدت غم بھی بری اور بے حد و اندازہ اچانک خوشی بھی خطرناک ہے۔

آخر کار یہ طے پایا کہ جہاں آرا فوراً ہی ماں کے سامنے نہ لائی جائے بلکہ کوٹھری میں رہے۔ پہلے غور سے دیکھ کر پہچانے کہ وہی اس کی اماں ہیں یا نہیں۔ اگر حافظہ تسلیم کرے تو پھر آگے ملاقات کی مناسب تدبیر کی جائے۔ پہلے باتوں سے اُمید بندھائی جائے پھر محبوب دکھایا جائے۔

ابھی بارہ بجے ہی تھے جو دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں پہلے ہی سے دوسرے کمرہ میں بیٹھا تھا ــــ بیوی مہمان کو ڈیوڑھی سے ساتھ لائی۔ دالان میں بٹھایا ــــ بوا گھریلو ہر چیز پر عجیب نظر ڈال رہی تھیں۔ آنکھوں میں حافظہ سمٹ آیا تھا۔ داغ دورِ گذشتہ پیش کر رہا تھا۔ ہر شے ان کا اپنا ماضی یاد دلا رہی تھی۔ ذہن اپنا گھر مستحضر کر رہا تھا۔ آنکھوں کے پردۂ سیمیں پر فلم ہو بہو گزر رہے تھے ــــ وہ ایک طرف کو ہو بیٹھیں۔ بیوی نے صدر میں بیٹھنے پر اصرار کیا۔ لیکن وہ نہ مانیں ــــ یہ پہلے سے احتیاط کی گئی تھی کہ گھر زیادہ خوش حالی ظاہر نہ ہو۔ ہاں خوش سلیقگی ضرور برسے ــــ پان پانی کی تواضع کے بعد دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں اور بیوی نے اپنی فرضی گم شدہ لڑکی کا ذکر شروع کیا۔ ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ بدنصیب نے تیرے ہی نہیں اور کتنے بے چراغ کیے ہیں۔ کتنوں کے لال چرائے ہیں اسی تلاش میں ایک اور بچی بھی اللہ نے ملا دی چند آفتاب چند

مہتاب ہے۔ اللہ جانے کس کی آنکھوں کا تارا ہوگی۔ کوئی چودہ پندرہ کی عمر ہے۔ مکھڑے سے شرافت برستی ہے۔ ابھی شدناشدنی نے اس کو بھی چرایا تھا۔ خدا کی مار پڑے اس بے ایمان پر۔ بچی اپنے کو گورگانی خاندان کی بتاتی ہے اور نام جہاں آرا۔ میں نے تو اپنی بیٹی بنالیا ہے — لفظ گورگانی خاندان پر بوا کی آنکھوں میں ایک چمک آئی۔ لیکن جہاں پھر غائب ہوگئی۔ تاہم چہرہ قدرے تردد اور اضطراب دکھا رہا تھا۔

یہ باتیں کرنے کے بعد بیوی خموش ہوگئی۔ بوا بھی کچھ نہ بولیں۔ لیکن مامتا بری بلا ہوتی ہے۔ آخر کچھ بے تعلق سا انداز بنا کر کہا ذرا میں تو اس بچی کو دیکھوں — بیوی نے جہاں آرا بیٹی کہہ کر آواز دی — لڑکی باہر آئی — ایسے مناظر چشم فلک نے کم دیکھے ہوں گے۔ ماں بیٹی دو برقی لہروں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہوگئیں۔

کرم خداوندی کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ حوروں کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ قضا و قدر بہ آواز بلند ندا دے رہے کہ ہم جدا کرتے ہیں تو ملا بھی دیتے ہیں۔

قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ الفاظ جذبات کو ادا نہیں کرسکتے۔ ماحول پر ملکوتی تبسم موتی برسا رہا تھا۔ فردوسی سکوت طاری جو گاہ گاہ گرد بیان کی۔ سبحان ربی الاعلیٰ کی آواز سے ٹوٹتا۔

بیٹی سے ملنے کے بعد بوا میری بیوی سے گلے ملیں۔ ماں کے آنسو اس کے قدموں پہ گر گر کر شکریہ ادا کر رہے تھے۔ زبان خموش تھی۔

میری بیوی نے اصرار کیا اور بوا اپنی گٹھڑی بغچی شاہ ٹرے سے لے آئیں۔ ابھی تک گھر میں میرا اور بوا کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور ہم لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ کس طرح ان پر یہ راز افشا کریں کہ مہرالنساء میری ہی بیوی ہے اور یہ سب کچھ ہم دونوں کی سازش سے ہوا۔

آخر کار اسی نے تدبیر نکالی، بوا نے جب اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی کہ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے آپ کو نہیں۔ بوا نے کہا وہ کس بات کا۔ اس پر مہر نے ساری داستان کہہ سنائی۔ بولی میرے گھر پر چرس کے منحوس بادل چھائے تھے۔ آپ کے طفیل وہ چھٹ گئے آج سے یہ عادت چھٹ گئی۔ میری اجڑی ہوئی دنیا پھر سے آباد ہو گئی۔ میرا تو رواں رواں آپ کا شکر گزار ہے اور رہے گا۔ اس گفتگو کے بعد مہر نے مجھ کو آواز دی۔ ہم دوسرے کمرہ میں سے برآمد ہوئے۔ بوا کو سلام کیا وہ بولیں میں نہیں جانتی تھی کہ اس سازش میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاتھ تو خادم کا بھی بیشک تھا، لیکن دماغ تو انہی بیگم کا کام کر رہا تھا۔ اپن تو حکم کے بندہ تھے۔ رات کو ہم سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ بوا کو ساری داستان بالتفصیل سنائی شدہ کا بھی ذکر کیا۔ بوا نے بتایا کہ جہاں آرا کا اصل نام روشن آرا ہے جہاں آرا

شنڈو نے بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب ہم سب کی یہ صلاح ٹھہری کہ کچھ عرصہ کسی اور شہر چلے جائیں۔ یہاں کی فضا سے دل گھبرا گیا تھا۔ نیز شنڈو کی طرف سے بھی دُگدا لگی تھی۔ علاوہ بریں میری بیوی بھی گھر میں بند پڑے پڑے مُرجھا گئی تھی۔ اس سب سے زیادہ بُوا اور روشن کے واسطے الغرض یہی معلوم ہُوا کہ ماحول میں مکمل تبدیلی کر دی جائے۔

دو دن میں سامانِ سفر تیار ہو گیا اور سارا قافلہ بمبئی سدھارا۔ وہاں ہوٹل کا رہنا سہنا، نہ کھانے کی فکر نہ گھر داری کی۔ دن بھر سیر کرنی، رات کو بارہ ایک بجے تک باتیں بنانی ——— بچے تو اس شہر کی گہما گہمی اور عمارتیں دیکھ کر دیوانہ ہو گئے۔ جہاں آرا جس کو اب روشن آرا کہیں گے۔ ماں سے مل جانے، تبدیلی آب و ہوا نیز ماحول اور فضا کے بدل جانے سے غنچہ کی مانند کھل گئی۔

ہمارے دلوں میں بُوا کی داستان سُننے کی تلملی ادھیڑ بن لگی تھی، لیکن منہ سے ایک لفظ استفسار بھی نہیں نکالتے تھے کہ مبادا وجہ گراں خاطر ہی ہو۔ دل میں خیال کریں کہ تو اب یہ میرے کچے چٹھے سُننے چاہتے ہیں، ان کے پاس آن پڑی ہوں تو اب مطالبات پیش کئے جا رہے ہیں ——— بہر نوع خدا مسبب الاسباب ہے۔ ایک روز شام کو ہم سب سینما جا بیٹھے مسلم سوشل پکچر تھی پہلے ہی سین میں نظر آیا کہ تین بچے جن میں دو لڑکے اور ایک لڑکی بیٹھے گڑیاں کھیل رہے ہیں ——— کھیل یہ ہے کہ دو گڈے ایک گڑیا پر لڑ رہے ہیں۔ گڈے لڑکوں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ اپنے اپنے کو منہ دے کر لڑا رہے ہیں۔ اور گڑیا کو لڑکی سنبھالے بیٹھی ہے ننھی ننھی سی تلواریں فضا میں

کوندرہی ہیں۔ بچی گڑیا کی طرف سے ایک ایک کو باری باری دادِ شجاعت دے رہی ہے۔

سین بدلا اور تلواریں کوندتی نظر آئیں۔ اندھیری رات ہے اور دو ماہ رو جوان تیغ بدست ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اور ایک شعلہ رخسار سیاہ چغہ میں ملفوف کھڑی دیکھ رہی ہے۔ پرانی قسم کے لباس ہیں۔ غدر کے قرب وجوار کا ماحول ——— تلوار کی ہر جھنکار کے ساتھ سیاہ پوش مہ لقا تھرا اٹھتی ہے ——— بنگاہ غایت دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں جوانوں میں سے ایک کے ساتھ اسے تعلقِ خاطر ہے۔ چونکہ جب وہ زد میں آتا ہے تو اس کے چہرے پر تردد، تشویش اور پریشانی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ وار کرتا ہے تو رخِ روشن، روشن تر ہو جاتا ہے آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ چہرہ پر تبسم ندی کھیلنے لگتی ہے۔

دیکھتے دیکھتے من بھاتا زد میں آگیا۔ زخم لگا اور کاری لگا۔ حسینہ بلبلا اٹھی چغہ کے نیچے سے پستول نکالی اور مقابل کو ختم کر دیا۔

مجروح نے ہاتھ کے اشارہ سے روکنا چاہا، لیکن لبلبی دب چکی تھی۔ گولی نکل چکی تھی۔ شکار نے دم توڑ دیا۔ یہ محبوب کے سینہ پر جھکی۔ وہ کمزور آواز میں بولا۔ پروین تم نے غلطی کی۔ یہ حرکت آدابِ جنگ کے خلاف ہے۔ دنیا مجھے کیا کہے گی۔ حسینہ نے بات کا صرف نگاہوں سے جواب دیا۔ جو کہہ رہی تھیں معافی کی خواستگار ہوں۔ پر کیا کروں، دل کے ہاتھوں مجبور تھی ——— یہ سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اپنے زخمی محبوب کو اٹھا رہی تھی کہ سین بدلا۔

ایک عالیشان محل سامنے تھا۔ اس میں مشرقی وضع سے آراستہ کمرہ ایک معمر خاتون بوڑھے شوہر سے باتیں کرتی نظر آئی۔ دونوں کے چہروں سے انتہائی ملال ظاہر ہو رہا تھا۔

بوڑھا مرد: دنیا کیا کہے گی۔ دارا بخت نے غضب کیا۔ میرا لڑکا اور اصول جنگ کے خلاف مقابل پر وار کرے؟

عورت: خدا جانے وہ کہاں ہوگا اور کس حال میں۔

بوڑھا: جب تلوار چل رہی تھی تو پستول کیوں چلائی۔ مجھے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔

عورت: کسی طرح معلوم تو کریں کہ وہ ہے کہاں۔

بوڑھا: میں نے تمام اسلحہ خانہ کا جائزہ لیا، کوئی پستول کم نہیں ہے پھر حیدر مرزا کو گولی لگی تو کیسے؟

عورت: آپ دارا بخت کا پتہ تو کرائیں، ہرکیک دوڑائیں۔

بوڑھا: تم کو دارا بخت کی پڑی ہے۔ مجھے خاندانی عزت کا خیال ہے۔

عورت: حیدر مرزا نے یہ جرأت کیسے کی۔

بوڑھا: اس کی کمینہ خصالی تھی۔ میرے سامنے مردود کا نام نہ لو۔ ہمارے نوجوانوں کے اخلاق گرتے جا رہے ہیں۔ نتیجہ اچھا نظر نہیں آتا۔

اب منظر بدلا۔ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ میں محفل رقص و سرود آراستہ ہے —— گز سارنگی کے تاروں سے کھیل رہا ہے۔ مضراب ستار پر زخمہ زنی کر رہی ہے۔ طبلہ کی گونج گنبد گردوں تک جاتی ہے۔ گھنگروؤں کی

جھنکار سوتے سپنے جگا رہی ہے ـــــ ایک نوعمر جوان صدرِ محفل گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہے۔ مطربہ یہ غزل گا رہی ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے!
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

محفل گرم ہے شراب چل رہی ہے۔ مے خوار بہک رہے ہیں۔ ساغر سے بھی شراب چھلک رہی ہے۔ آنکھوں سے بھی پھولوں اور عطریات کی مہک نشہ کھلا رہی ہے کہ اتنے میں ایک ملازم سراسیمہ داخل ہوا۔ صاحب خانہ نوجوان کو مؤدبانہ آداب بجا لایا۔ اس نے پوچھا کیا بات ہے۔ ملازم نے دست بستہ عرض کی کہ تخلیہ میں عرض کر سکتا ہوں۔ بڑے نواب صاحب آپ کے والدِ محترم کا ایک پیغام لایا ہوں۔

سین بدلا۔ ملازم کھڑا ہوا ہے۔ لڑکا تیغ بدست بپھرے ہوئے شیر کی مانند کمرہ میں پھر رہا ہے۔

لڑکا: میں دارا بخت کا لہو پی جاؤں گا ـــــ ہے نہ بزدل پستول سے حملہ آور ہوا!

ملازم: حضور خانہ زاد نے آپ دونوں کو گودیوں میں پالا ہے۔ دارا بخت بزدل تو نہیں۔

لڑکا: خبث نفس نہ گردد، بہ سالہا معلوم۔ سنگی بیگ اس وقت معاملہ صاف

ظاہر ہے۔ ایک طرف تو کمینہ نے ہماری عزّت پر حملہ کیا۔ دوسری جانب تلوار چلتے ہوئے پستول سے وار۔

ملازم :۔ غریب پرور شاید اس معاملہ میں جانبین سے غلطیاں ہوئیں۔

لڑکا : (تلوار کے ہاتھ کو جنبش میں لاتے ہُوئے) کیا بکتے ہو سنگی بیگ!

ملازم : (سر جھکا کر) حضور یہ سر حاضر ہے۔

لڑکا : (ہاتھ روک کر) سنگی بیگ تمہاری دیرینہ خدمات نے اس وقت ہمارا ہاتھ روک لیا۔ آیندہ ایسی بات زبان پر نہ آنے پائے۔

ملازم : جو حکم۔

سین پھر بدلا۔ ملازم کا گھر نظر آیا' وہ اپنی بڑھی بیوی سے کہہ رہا ہے۔

ملازم : اب بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خُون بہے گا خاندان میں دشمنی کی بنا پڑ گئی۔ یہ لوگ بات سے ٹلا نہیں کرتے۔ دارا بخت بالکل بے قصور ہے۔

بیوی : کس طرح ؟

ملازم : پروین بیگم کی نسبت دارا بخت میاں سے ٹھہر چکی تھی۔ یہ گویا پیٹ کے رشتہ تھے۔ اب بزرگوں میں کشیدگی ہو گئی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبّت تھی۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہُوئی۔ دارا بخت زہر کھانے پر تُلے ہوئے تھے۔ مجھ کو سارا حال معلُوم ہے۔ پروین بیگم نے بہت سمجھایا پر انہوں نے ایک نہ سُنی اور یہی کہا کہ اب جی کر کیا کروں گا۔ خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں۔ اس شکل میں خاندان کی بدنامی تھی۔ اور دارا بخت کی بھی جان جاتی۔ بحالت مجبوری وہ راضی ہو گئیں

بیوی : حیدر مرزا نے یہ حرکت کیوں کی ؟

ملازم : یہ ان کا کمینہ پن تھا۔ شریف ایسا نہیں کیا کرتے ۔

سین بدلا۔ حضور بہادر شاہ خلوت میں تشریف فرما ہیں۔ تین بوڑھے خدمت میں حاضر۔

بہادر شاہ :۔ شریف ایسی حرکات نہیں کیا کرتے۔ علی مرزا تمہارے لڑکے نے غلطی کی۔ کیفر کردار کو پہنچا (دوسرے دونوں بوڑھوں کی جانب نگاہ کر کے) ہم کو تم دونوں کے ساتھ ہمدردی ہے ۔۔۔۔۔۔ تیمور شاہ غلطی تمہاری بھی تھی جب لڑکی مخطوبہ ہو چکی تھی تو اسے حوالہ کرنا چاہئے تھا ۔۔۔۔۔۔ مظفر شکوہ تم دارا بخت کو تلاش کراؤ۔ ہم بھی مہنیانِ دربار کو حکم دے دیں گے (پھر تینوں کی جانب مخاطب ہو کر) اب اور کُشت و خون نہیں ہونا چاہئے ۔

تینوں بوڑھے کورنشات بجالا کر باہر آجاتے ہیں ۔

سین بدلتا ہے۔ ایک ڈاکوؤں، بدمعاشوں، بدقماشوں کے مکان میں حیدر مرزا مقتول کا بھائی کچھ سازشیں کر رہا ہے ۔

حیدر مرزا : میں اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہوں حکم شاہ نے ہماری تلواریں کھونڈی کر دیں۔ ارشادِ عالی ہے کہ ہم اور کُشت و خُون نہیں چاہتے۔ ان حالات میں ہمارے ہاتھ گو قبضۂ تیغ تک جانے کو بے قرار ہیں، لیکن جا نہیں سکتے۔ پس تمہاری امداد درکار ہے۔ اوّل تو یہ پتہ چلانا ہے کہ دارا بخت ہے کہاں۔ پھر سر قلم کر دینا ہے۔ اس کام کے دس ہزار روپیہ تک دینے کو تیار ہوں۔ ہم لوگ خود کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ ہماری ہر نقل و حرکت

پر مہیناں شاہ کی بھی نگاہ ہے۔ نیز فریقِ مخالف کے مقرر کردہ جاسوس بھی نگرانی کر رہے ہیں۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ یہ کام اپنے سر لینے کو تیار ہیں۔

سرغنہ: تین ماہ کے اندر دارابخت کا سر آپ کے قدموں میں ہوگا۔

اس کے بعد دونوں نے ہاتھ ملایا اور حیدر مرزا رخصت ہوگیا۔ بیچ میں کچھ اور سینز آئے جن میں دکھایا گیا تھا کہ دارابخت اور پروین جا بجا پناہ لیتے پھر رہے ہیں۔ دن دردوں میں گذرتے ہیں، راتیں تشویش میں۔ ماں باپ شب و روز تلاش کر رہے ہیں۔ ایک ایک آنکھ ہے اور ہزار ہزار آنسو۔ بدمعاش بھی ہر گوشۂ زمین پر تجسس کناں رواں دواں ہیں۔ سنگی بیگ وفادار بوڑھا ملازم ہر شہر اور ہر قریہ میں جا رہا ہے۔

آخر میں شب تاریک ہے اور گھنا جنگل دارابخت اور پروین گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ متلاشی اجیر بدمعاش کھوج لگا کر سر پر آ پہنچتے ہیں۔ تلوار چلتی ہے عاشق و معشوق جاں بحق تسلیم ہوتے ہیں پہلے دارابخت کے پروین کو بچاتے ہوئے زخم کاری آتا ہے، وہ ڈگمگاتا ہے۔ پروین بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دشمن پر گرتی ہے۔ سینہ پہ گھاؤ لیتی ہے پہلے دارابخت گرتا ہے اس کی چھاتی پر پروین۔ کل من علیہا فان۔

تماشہ کے دوران میں بُوا کا بُرا حال ہوگیا پہلے تو وہ چپکے چپکے روتی رہیں۔ ہم نے اندھیرے کی وجہ سے محسوس نہیں کیا، پھر ان کے جسم کی بے طرح لرزشوں نے مجھے ادھر متوجہ کیا۔ اوّل تو میں سمجھا نہیں۔ پھر کچھ شبہ ہوا۔ انٹرول پر جب ان کی آنکھیں آنکھیں تو روتے روتے بیر بہوٹی بنی تھیں۔ چونکہ میں بُوا جیدن کی طبیعت سے آشنا تھا

اس لیئے کوئی اظہار نہ کیا اور خموش بیٹھا رہا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ سب کے واسطے لیمن منگایا اور ان کو بھی بہ اصرار پلایا ـــــ پکچر کے اختتام تک تو اُن کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی۔ اب آنسو چھپائے نہ چھپے۔ بہن نے اور بیوی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ گھر جا بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا۔ ہم لوگوں نے نہیں کھایا چونکہ بُوا نے عذر کیا کہ ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔ جب سب بچے سو گئے تو بیوی نے بُوا کے سامنے دسترخوان چنا، انہوں نے ہماری خاطر سے کچھ تھوڑا سا کھا لیا، اور ہم نے بھی نوالہ توڑا۔

رات کو ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ بیوی نے بڑے پہلو سے پہلے تماشہ کا ذکر چھیڑا۔ اس وقت بوا کی کیفیت کچھ پکے ہوئے پھوڑے کی سی ہوگئی تھی ذرا سا نشتر لگتے ہی بہہ نکلا۔ بولیں ؎

پروانہ نیک رفت کہ در پیش شمع سوخت
گر نہ شد کہ سوختنِ غائبانہ چیست

کاش تمام محبت والے دل اسی طرح ایک دوسرے کے سینہ پر دم توڑ سکیں لیکن اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔ بعض کو حیاتِ غم و ماتم۔ فراق مسلسل اندوہ مدام ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بُلبُل کو دیا رونا تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

جانتی ہوں کہ تم لوگ میری داستانِ زندگی سُننے کو بیتاب ہو۔ یہ راز اب تک سینہ میں لئے بیٹھی تھی، لیکن اب تو اس بار سے پسلیاں بھی ٹوٹی جاتی ہیں۔ سینہ بھی پھٹا جاتا ہے۔ اور پھر تم لوگوں کے مجھ پر ایسے احسانات ہیں کہ اب تمہاری نظروں کا استفسار و تجسس ٹالا نہیں جاتا۔ اتنا کہے دیتی ہوں کہ سُن کر کچھ خوش نہیں ہوگے۔ رنجیدہ ہوگے میری داستان تبسّم گل نہیں اشکِ شبنم و نالہ بُلبُل ہے۔ فسانہ درد کا ہے دُکھ بھری ہے داستاں میری!

۵

شریکِ بزمِ عشرت ہوں مگر خاطر مکدر ہے
دہانِ زخم ہوں ہنسنا مرا رونے سے بدتر ہے

بہر صورت مجھے تمہاری خوشی منظور ہے۔ سُننا ہی چاہتے ہو تو سُن لو ۔۔۔

آج بائیسکوپ میں میری حالت اس وجہ سے خراب ہوگئی کہ اتفاق سے کہانی میری زندگی کے قصّہ سے بہت کچھ مشابہ تھی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والا موٹے موٹے نقوش تو وہی لے رہا ہے لیکن جان کر فروعات کو دھندلا کرتا جاتا ہے۔ بدلتا جاتا ہے۔

میں کم نصیب بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ میرا خاندان بھی کبھی

لال حویلی کی زینت تھا، لیکن گردشِ ایام اور زوالِ حکومت نے لال قلعہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ زر و جواہر بزرگوں کے پاس تھے۔ ان کو بیچ کر بستی جا مداد یں خرید لیں اور اپنی آن بان قائم رکھی۔ شہر میں عزت تھی۔ ہم چشموں میں وقار۔ جب باہر نکلتے تو دس سلام کرنے والے ابھی زندہ تھے ——— زمانہ گزرتا گیا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی گئی۔

حتیٰ کہ بعد غدر تیسری پیڑھی میں میں سبز بخت پیدا ہوئی۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔ ناز و نعم میں پلی۔ باپ کے دل کا سرور تھی۔ ماں کی آنکھوں کا نور۔ اچھا خاصہ بڑا کنبہ تھا اور سب میرے والا و شیدا۔ جہاں جاتی، آنکھوں پر بٹھائی جاتی۔ کچھ قریبی رشتہ دار تھے۔ کچھ دور کے۔ سگوں میں بس ایک خالہ تھیں اور ایک چچا۔ ان دونوں کو اللہ نے ایک ایک لڑکا عطا کیا تھا۔ ہم تینوں بچے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ خالہ کے لڑکے کا نام تھا سکندر بخت اور چچا کے لڑکے کا نام ذوالفقار مرزا۔ اول الذکر یعنی سکندر بخت میری خالہ کے صاحبزادہ طبیعت کے نہایت متین اور سنجیدہ تھے صورت شکل بچوں کی ہوتی ہے ویسی ہی تھی۔ ہاں ذوالفقار مرزا تند مزاج۔ خشونت پسند اور کینہ پرور تھا۔ اکثر ہماری گڑیوں کی گردنیں مروڑ ڈالتا۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیتا کھیل کھیل میں لڑنے لگتا سکندر بخت گو ہاتھ پیروں میں اُس سے اچھے تھے۔ چند بار جب بات بڑھی اور نوبت ہاتھا پائی تک آئی تو انہوں نے دبا لیا۔ لیکن وہ طبعاً آمادہ پیکار تھے ——— ہر بار جھگڑے کے بعد بڑے میل ملاپ کرا دینے پر بیچ بچاؤ ہی کبھی آپس میں ہی نہیں ——— ابھی میں نے تیرھویں سال میں

قدم رکھا تھا کہ چچی اور خالہ دونوں نے نسبت کی بابت سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ماں باپ سر جوڑ کر بیٹھے۔ بڑی مشکل کے معاملہ تھے کس سے انکار کریں، کس سے اقرار، دونوں عزیز اور برابر کے رشتہ۔ ایک ماں کی بہن۔ ایک باپ کے بھائی اماں نے دبی زبان سے کہا کہ ذوالفقار مرزا کو دے دو۔ میں آپا کو سمجھا لوں گی۔ اس پر ابا بولے اور میں بھائی جان کو کیوں نہ سمجھا لوں، جو تو آپا کو سمجھائے ——— بہر صورت اکثر گھر میں یہ ذکر اذکار رہتے۔ اماں، ابا آپس میں مشاورہ کرتے، انجام کار یہی طے پایا کہ ذوالفقار مرزا سے ہماری کھیل میں بھی میزان نہیں ٹلتی، یہ تو ٹھیرا عمر بھر کا ساتھ، مناسب نہیں، چچا کو سمجھا دیا جائے گا۔ خالہ سے ہامی بھر لی جائے۔

ماں باپ نے جو میرے حق میں بہتر سمجھا، کر تو لیا اور کرنا بھی یہی چاہیئے تھا لیکن چچا والوں کے دل میں کُتا پڑ گئی۔ اور بس پھیلا کہ مٹایا نہ جا سکا، ہاں ہم مٹ گئے۔

ماں باپ نے میری شادی سکندر بخت سے کر دی۔ چچا چچی تقریب میں شریک نہ ہوئے۔ ابا کو اس کا بہت قلق تھا۔ ماں بھی محسوس کر رہی تھیں۔ مرحومہ نے آخر وقت تک یہی کہا کہ اپنوں سے نہ بگاڑو۔ میری خاطر یہ رشتہ نہ کرو۔ لڑکی تمہاری ہے جس کے چاہو ہاتھ میں پکڑا دو مجھے عذر نہ ہو گا لیکن ابا کا دل سکندر بخت پر ہی ٹھکا تھا۔ ماں کو یہی جواب دیا کہ مجھے بچی کی آگے زندگی سامنے دکھنی ہے۔ ذوالفقار چڑچڑا بد مزاج لڑکا ہے اس سے خوش گوار نباہ ممکن نہیں۔ ان معاملات میں جذبات سے نہیں عقل سے کام لیا کرتے ہیں۔ تمہاری بہن کو لڑکی تمہاری خاطر ہرگز نہیں ابا کا بھے خود پسند رہے بھائی کو منانے کی کوشش کروں گا اب آگے

اللہ مالک ہے۔

سو آبا نے اپنی کرنی میں کسر نہ کی کئی بار بھائی کے گھر خود گئے۔ سمجھایا بجھایا، کہا تمہاری ہی لڑکی ہے۔ اب دوسروں کو زبان دے چکا ہوں۔ شہر والے کیا کہیں گے آپ میری خاطر سے دس منٹ کو شریک ہو جائیے۔ میری آبرو رہ جائیگی۔ لیکن وہ اللہ کے بندے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پتھر تھے کہ ان پر جونک نہ لگ سکی —— اتنے قریبی عزیزوں کی غیر موجودگی ہر فرد نے محسوس کی۔ ایک دو نے پوچھا بھی، لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ آبا نے شہر کے چند رو دار باوقار لوگوں کو ان کے پاس کہنے سُننے بھیجا، پر انہوں نے ایک نہ سُنی۔

بہر صورت میں سکندر بخت کو بیاہ دی گئی ہم کو پہلے بھی ایک دوسرے سے غیر محسوس طریقہ پر اُنس تھا۔ ساتھ کے کھیلے تھے۔ ساتھ پلے بڑے تھے، پھر طبیعتوں میں یگانگت —— اب تو یہ عالم تھا کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے۔ شمع و پروانہ کی سی کیفیت۔ شہر کنبہ میں ہمارے سہاگ کے چرچے۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو مجھ سے دُلہن بنوائیں۔ اُن کا یہ حال کہ میرے بغیر ٹکڑا نہ توڑیں جو دو دن کو میکے جاؤں تو دن میں دس دس پھیرے کریں۔ میں کہوں بھی سہیلیاں چھیڑتی ہیں، تم اس طرح کیوں چلے آتے ہو تو جواب دیں ہم کیا کریں، دل جو نہیں مانتا، تم یہاں آتی ہی کیوں ہو جو ہم کو اس طرح آنا پڑتا ہے۔ اب سنو سہیلیوں کے طعنہ فقرہ، ہم کیا کر سکتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی اُن کے بغیر ایک ایک پل بھاری ہوتی تھی، وہ جتنی دیر باہر دیوانخانہ میں رہتے، مجھے گھر سُونا سُونا نظر آتا۔ جیا مانع تھی، پھر بھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر اُن کی سوتے میں دُور سے بلائیں لیتی۔ گھنٹوں مکھڑا تکتی رہتی —— غرضیکہ

دن عیش و عشرت سے گزر رہے تھے۔ رات شبِ برأت تھی، تو روز روزِ عید کہ اللہ نے میرا پیر بھاری کیا۔ میں امیدوار ہو گئی۔ یہ زمانہ بھی عجیب گزرا ہے، اب اسی ماضی کی یاد پر زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ صبح و شام میرا منہ تکتے تھے۔ آج چہرہ اُترا ہوا ہے۔ رات کو شاید تمہیں نیند نہیں آئی۔ کیا بات ہے، کچھ تکلیف ہے حکیم صاحب کو بلاؤں ——— صبح تم نے گل قند اور سکنجبین نہیں چاٹی۔ جب ہی تو جی تلملا رہا ہے ——— میرے کھانے کا خود خیال رکھتے، بازار سے ایک ایک چیز منگاتے۔ میوہ کاٹ کاٹ کر اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ صبح و شام ہم دونوں موٹر میں ساتھ جاتے ڈرائیور کو تاکید تھی کہ تیز نہ چلائے۔ شہر سے دور مجھے آہستہ آہستہ ٹہلاتے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی ——— غرضکہ ہر لمحہ میرا خیال رکھتے۔ ذرا میں کھڑے قد سے پلنگ پر سے اتری اور وہ بے تاب ہوئے۔ کہتے لِلّٰہ کیا غضب کرتی ہو۔ ——— گھر کی ڈیوڑھی کی سیڑھی ذرا اونچی تھی۔ ایک اور چھوٹی سی چوکی کھڑے کھڑے بڑھئی سے بنوائی۔ پہلے وہ رکھی جاتی، جب میں اترتی، میں اکثر کہتی بھی تھی کہ کیوں مجھے مرزا پھویا بنا رہے ہو۔ خواہ مخواہ تم وہم کرتے ہو۔ تو جواب ملتا، تم نہیں جانتیں۔ یہ دن ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دوسرے تیسرے دن حکیم صاحب کو بلاتے چوتھے پانچویں لیڈی ڈاکٹر کو ——— کچھ نہ پوچھو، اب وہ زمانہ یاد کرتی ہوں تو سینہ پر سانپ لوٹ جاتے ہیں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ آسمان نے کیا رنگ بدلا، زمانہ نے کیا کروٹ لی۔ قسمت نے کیا دکھایا۔

غم میں ایک مستی ہے جو مسرت میں نہیں۔ الم میں ایک سرخوشی ہے

جس سے خوشی محروم۔ آہ میں ایک کیف ہے جس سے وا ہ نا آشنا ـــــ بُوا اپنی داستان عجیب محویت کے عالم میں سُنائے جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے انہیں سم غم چڑھ رہا ہو ـــــ پھر بولیں جب وضع حمل کا وقت آیا، تو اُن کی حالت بیان نہیں کی جا سکتی۔ کاش زبان کو دل عطا ہوتا، تب کہیں یہ بیان ممکن تھا۔ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔

مجھے یاد ہے رات کا ایک بجا تھا جو میں نے انہیں جگایا۔ گھبرائے بوکھلائے اُٹھے۔ میری نظریں بلائیں لے رہی تھیں۔ دل قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ جب محبت کرنے والے درد میں شریک ہوں تو انسان کو وہ دُکھ بھی مزا دیتا ہے۔ ... جاڑے کا موسم تھا، بغیر کچھ اوڑھے یوں ہی باہر نکل گئے۔ میں نے کہا دوشالہ کندھوں پر ڈال لو۔ اس وقت کی ان کی دیکھن اب بھی مجھے بے قرار کر جاتی ہے کاش، وہ مجھے اتنا نہ چاہتے تو بہتر تھا، کاش کچھ تلخ یادیں بھی ہوتیں تو اچھا ہوتا۔ وہ روشن دن اس دور کو تاریک تر بنائے دیتے ہیں ؎

زمانہ ہو گیا جب کی تھی باغِ عیش کی سیر
نہ جانے کیوں ہے نگاہوں میں بہار اب تک

غم و اندوہ کی سوتیں پھوٹ رہی تھیں۔ بُوا ایک سیلِ تند کی طرح بیان کئے چلی جا رہی تھیں۔ بولیں باہر جا سارے گھر کو جگا دیا۔ موٹر ڈاکٹرنی کو بھیجی۔ سیج گاڑی میرے پیچھے خود میری پٹی پکڑ آن بیٹھے۔ ڈاکٹرنی کے آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ مجھے کرب بڑھنے لگا۔ وہ اتنی دیر لال پیلے ہوتے رہے۔ میں ان کی تشویش کے مزے لے رہی تھی اور اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔ ان کی ہر حرکت محبت کا ایک افسانہ

تھی ۔ ہر دلہن اس افسانہ کا عنوان۔ ان کی ماں نے کہا بھی کہ تم دوسرے کمرے میں جا بیٹھو۔ میں نے بھی نگاہوں میں یہی التجا کی، لیکن وہ کیا ٹلنے والے تھے ٹال گئے۔

آخرکار ڈاکٹرنی آگئی۔ اور وہ بادل ناخواستہ مجھ پر ایک نگاہ جس میں رُوحِ محبت کھچ آئی تھی ڈالتے ہوئے اُٹھے۔ پھر بھی کمرے کے دروازہ پر کرسی ڈالے بیٹھے رہے۔ بڑی بہن نے مذاق مذاق میں ایک آدھ فقرا بھی کسا، لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ حتیٰ کہ صبح کی اذان ہوگئی۔

اب وہ وضو کر جانماز بچھا قبلہ رو ہو بیٹھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں تھیں اور ہاتھ مجیب الدعوات کی درگاہ میں دعا کے لئے اُٹھے ہوئے۔ کہ اللہ نے مجھے روشن آرا عطا کی۔

سارا گھر پھولا نہیں سماتا تھا۔ شادیانہ بجنے لگے۔ مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تمام دن ہیجڑے بھانڈ ناچے، ڈومنیاں آئیں، گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ دیگیں کھنکنے لگیں۔ میرے خسر نے تھیلیوں کے منہ کھول دیئے۔ ہر ایک کو اُس کی آرزو سے زیادہ انعام واکرام دیئے۔ مجھ پر سے صدقہ اُترے۔

انھوں نے بھی ڈاکٹرنی سے اجازت لے دُور سے آ کر مجھے دیکھا۔ نظریں شکر و محبت کی دو آتشہ سے چھلکی پڑتی تھیں۔ میں نے بھی سب کی نگاہیں بچا کر اک نگہِ غلط انداز ڈالی۔ ہماری آنکھیں کچھ اس طرح دوچار ہوئیں۔ جیسے فاختاؤں کا جوڑا ہم کنار ہو۔

روشن آرا ہماری محبت میں ایک اور کڑی کا اضافہ تھی۔ اکثر راتوں کو ہم

دونوں بیٹھے اُسے دیکھا کرتے تھے۔ ہماری خموشی بھی گفتگو تھی۔ اور ہماری گفتگو شیر و شہد، کبھی صرف ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے اور جذبات کا اظہار ہو جاتا۔ کبھی وہ مسکرا کر میرے چانٹا مار دیتے اور میں خیالات سمجھ جاتی۔ محبت کی زبان بھی جداگانہ ہے الفت کے الفاظ ہی کچھ اور۔

غرضکہ یہ محبت کے روز و شب مہ و سال اک خوش آیندہ خواب کی مانند گذرتے چلے گئے ——— روشن آرا بیبی کے پیر شہید منائے جاتے، منگل کے منگل ان پر سے صدقہ دلواتی۔ ان بیگم کی سالگرہ اس شان سے منائی جاتی کہ باید و شاید۔ اٹھواڑوں تو مہمان داری رہتی، محفلیں ہوتیں، طائفہ ناچتے ——— شاید فلک تفرقہ انداز دعیش دشمن یہ دور دیکھ نہ سکا۔ اور اس نے ہماری زندگی کا روشن ورق اُلٹ دیا۔ اور تاریک مقدر کر دیا، دن چھپ گیا، شب تار آ گئی ـ جواب جاتی نظر نہیں آتی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے کہ تمہاری بدولت مجھے اپنی روشن آراء کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ میری زندگی میں روشنی کی بس یہی معصوم کرن رہ گئی ہے۔ اللہ اس کو سلامت رکھے اور تمہیں جزائے خیر دے۔

اتنا کہنے کے بعد بُوا خموش ہو گئیں۔ ہم دونوں کے چہرہ ہمہ تن استفسار بنے تھے۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، انداز پا گئیں۔ بولیں آگے نہ سنو تو بہتر ہے۔ قصۂ عیش ختم ہوا۔ اب آگے افسانۂ غم ہے۔ بہار عشق نے اختتام پایا۔ اب زہرِ عشق کا دور آیا ہے۔ آگے کے واقعات قمری کا قہقہہ نہیں ہیں، آہِ بلبل ہیں۔ شامت

رس نہیں، اب بروگ رس کا وقت ہے ——— میں نے کہا پوآپ کا غم ہمارا اپنا غم ہے۔ بتائیں تو، نہ سنیں تو۔ کہہ بھی دیجئے۔ بولیں اچھی بات ہے۔ تمہاری خوشی، مجھے کوئی عذر نہیں۔

میری بپتا کی کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب کہ ہندوستان میں انگریز کی مخالفت کی ایک عام لہر دوڑی۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا "نہیں رکھنی سرکار ظالم نہیں رکھنی" خلافت تحریک کا زمانہ تھا۔ مسلمان بگڑا ہوا تھا۔ میرے شوہر مولانا شیخ الہند کے معتقد تھے۔ روزانہ اخبارات میں خبریں آتیں۔ آج اتنی گرفتاریاں ہوئیں کل اتنی۔ فلاں جگہ گولی چلی۔ خطابات واپس کئے جا رہے تھے۔ مسلمان جیل خانہ بھر رہے تھے سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے۔ شہید خاک و خون میں نہا کر جنت الفردوس جا رہے تھے۔ ہر چہار طرف نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند تھیں۔ چہروں پہ بغاوت لکھی تھی اہل اسلام کا خون جوش میں تھا۔ دن رات جلسہ جلوس تھے۔ روزانہ ہڑتالیں۔

میرے شوہر کے خون میں بغاوت تھی، وہ حضور بہادر شاہ کے اس لڑکے سے تعلق رکھتے تھے جو بعد غدر جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اکثر راتوں کو ہم دونوں اس تحریک کی بابت باتیں کرتے۔ ان کی زبان پر بارہا یہ آتا تھا کہ یہ کام کا وقت ہے جس کو خدا توفیق دے۔ ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ ان تحریکات سے پورا کام بننا نہیں۔ سرزمین ہند خون مانگ رہی ہے۔ اس کے بغیر یہ کھیتی ہری بھری ہو نہیں سکتی۔ سلاسلِ حیات کاٹی ہوں گی جب یہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں گی۔ نیز صرف ہندوستان اور ہندوستانیوں کی جدوجہد تحریکات حکومت وقت کے خلاف بار آور ہو نہیں سکتیں۔ کسی نہ کسی باہر کی حکومت

سے امداد طلب کرنی پڑے گی، تاکہ انگریز دو جانب سے نرغہ میں آجائیں۔

بہر نوع مدعا یہ کہ آزادیٔ وطن کی طلب ان کی رگ و پے میں تھی۔ آتش گیر مادہ موجود تھا صرف چنگاری درکار۔ ایک دو بار یہ ذکر بھی آیا کہ تمہارا میرے بعد کیا ہوگا۔ میں کیا کہہ سکتی تھی، صورت دیکھ کر چپ ہو جاتی ——— چند روز میں نے محسوس کیا کہ وہ چپ چپ اور کچھ متفکر سے ہیں۔ میں ان کے ارد گرد پھرتی نظریں دیکھتی پر کچھ کہہ نہ سکتی تھی، اتنا جانتی تھی کہ کسی نہ کسی تردد میں ہیں۔ یہ بھی یقین تھا کہ ہیں آگے ضرور، آج نہیں کل اور ایسا ہی ہوا۔ ہم ایک روح دو قالب تھے، کوئی بات ایک دوسرے سے چھپا نہ سکتے تھے۔

ایک روز رات کو مجھ سے کہنے لگے کہ بیگم ہمارا ساتھ دوگی۔ میرے پاس اس سوال کے جواب کو الفاظ نہ تھے۔ نظریں کہہ رہی تھیں کہ آپ کو اس لونڈی سے اس سوال کی ضرورت ہو ہی سکتی ہے۔ تن من حاضر ہے۔ خون کا آخری قطرہ حکم پر ٹپکایا جا سکتا ہے اور بخوشی سے

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم   شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

وہ سمجھ گئے، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔ حسن آرا دیس اور دین اب قربانی چاہتا ہے۔ یہ وقت پیچھے ہٹنے کا نہیں۔ آخر وہ مائیں وہ بیویاں وہ بہنیں بھی ہم ہی میں سے تھیں جنہوں نے لال اپنے سرتاج اور اپنے رہبر بخوشی میدان میں بھیجا کہ ہیں ہماری رگوں میں بھی وہ ہی خون ہے، فدا رے ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ پر اب وقت آ گیا ہے کہ پھر لہو کو آتش سیال میں بدل لیا جائے۔

میں کچھ روز سے جہاں ان کو چپ چپ اور متردد محسوس کر رہی تھی وہاں

ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ ان کے پاس کچھ نئے اور مشتبہ سے لوگ آنے لگے تھے، جن سے راتوں کو دروازہ بند کر کے باتیں ہوتیں۔ میرا ماتھا ٹھنکتا تھا۔ دل میں وسواس آنے پر کیا کرتی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ہر خوشی مجھے ہر قیمت پر منظور تھی۔ شوہر کے حصول مدعا میں سنگِ گراں بننا میرا کام نہ تھا۔ اس کے گلے کا ہار ہو سکتی تھی۔ پیروں کی زنجیر نہیں ——— وہ کہتے رہے میں سنتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں سوتی ہوئی روشن پر گئیں اور دو آنسو ٹپک گئے۔ سرتاج نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا بیگم میں سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن یہ وقت پیچھے ہٹنے کا ہے نہیں، ہر چہ بادا باد کشتی در آب انداختیم! روشن کا اللہ مالک ہے۔ اصل پالن ہار وہ ہے ہم کیا کیتے ہیں رع۔ تو کیستی کہ بہ زخدا بندہ پروری۔

میں انہیں ان کے ارادوں سے کیا باز رکھ سکتی تھی۔ یہاں تو راضی بہ رضا کے سودے تھے۔ ہاں اگر اس وقت ان کے یا میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید روک لیتے سو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ——— انجام کار معاملہ یہ کھلا کہ ایک خفیہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا کام پوشیدہ طور پر قتل و غارت کر کے حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنا تھا۔ نیز کسی دوسری سلطنت کو حملہ آور ہونے پر آمادہ کرنا۔ میرے شوہر کو وہ لوگ اپنا سردار بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے قبول بھی کر لیا تھا۔

میں نے آخر میں دبی زبان سے صرف اتنا کہا کہ اس کنیز کی اجازت کی کیا ضرورت ہے، ہاں ایک بات عرض کرنی چاہتی ہوں، اگر آپ مان جائیں، بولے بیگم آپ کی ہر بات بسرو چشم منظور ہے۔ میں بولی۔ اگر مناسب ہو تو بندی کو تمام باتوں سے آگاہ رکھیں۔ اور حسب دستور ہم آپ رات کو تمام چیزوں پر مشاورت کر لیا

کریں۔ وہ مسکرائے اور بولے مجھے منظور ہے اور نہ صرف یہ بلکہ تم اپنی حدوں تک ہماری شریک کار ہوگی۔

مشتبہ مہمان پوشیدہ طور پر آتے رہے۔ کابل بھی پیامی جاتے رہے۔ حتیٰ کہ روس تک سے امداد طلب کی۔ میں جانتی تھی کہ یہ کھیل خطرناک ہے۔ ہمہ وقت دل میں چھاج سے لگے رہتے۔ ان کے سامنے مسکراتی ہوئی آتی کہ خود تفکرات میں گرفتار ہیں میرا فرض ہے کہ ان کی زندگی کے کچھ لمحہ تو خوشگوار بنائیں۔ دل روتا رہتا۔ آنکھیں تبسم کناں۔ لیکن ہمارے آپس کے تو دل کے معاملے تھے اور دل را بدل رہیست' وہ میرے من کی بات جانتے تھے۔ کئی بار کہا تم فکر نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ اپنی سی پوری احتیاط میں برت رہا ہوں۔ تمام کارروائیاں خفیہ اور پوشیدہ کی جا رہی ہیں۔ راز داری کے انتہائی اہتمام ہیں۔

اسی اثنا میں اطلاعیں موصول ہوتی رہیں کہ وہاں طمنچہ چلایا، وہاں گولہ مارا خنجر و پیش قبض بھی کام میں آ رہے تھے ــــــ ہمارے مکان سے ملحق اچھی بڑی قیمت دے کر دو تین مکان ایک ہی سلسلہ میں خرید لئے گئے، اور نیچے ہی نیچے راتوں کو سرنگ کے راستہ دوسرے اور تیسرے مکان میں پہنچا دیئے جاتے ــــــ روس کی جانب سے بخارائی ملا آتے' اپنے ہمراہ پروانہ بھی لاتے اسلحہ جات بھی۔

حکومت کی بھی نگاہیں ہر چہار جانب تھیں۔ پورے پورے محکمہ بر سر کار آخر کار ایک رات کسی بخارا کے ایلچی کے پیچھے سی، آئی، ڈی آن پہنچی۔ پشاور سے اسے نگاہوں میں رکھا گیا تھا۔ ہمارے دروازے پر پہنچ کر وہ

وہ غائب ہو گیا۔ راتوں رات دوڑ آئی پولیس نے گھر کے چپہ چپہ کی تلاشی لی لیکن آنے والے کا پتہ نہ چلا۔ سی آئی ڈی والے کا کہنا کہ اسی گھر میں آیا ہے۔ ہم چار آدمی چوکسی کرتے رہے۔ کسی جانب سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

وہ لوگ تلاش کرتے رہے۔ ڈھونڈتے رہے، مہمان چلا بھی گیا——

اُس رات میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑے ہوئے تھے اپنی بچی کو سینہ سے لگائے بیٹھی تھی۔ یہ ماشاءاللہ خاصی سیانی ہو گئی تھی۔ بالکل سہمی ہوئی مجھے چمٹے جائے اور بار بار پوچھے امی کیا بات ہے۔ اب کیا بتاؤں، اپنے دل کا حال خراب تھا اسے کیا سمجھاؤں۔ صرف اتنا کہا بیٹی ہمارے گھر میں چور آ گیا تھا۔ پولس اُسے ڈھونڈنے آئی ہے۔ غرضکہ وہ رات خدا خدا کر کے کٹی۔ مدعا نہ ملا۔ پولس ہم پر ہاتھ نہ ڈال سکی، لیکن اس دن سے گھر کی نگرانی ہونے لگی۔

اب سخت احتیاطوں کی ضرورت تھی لیکن نا ہو کے ایک بار شبہ ہو جانا غضب تھا۔ پھر حکومت کی زد سے بچنا مشکل نہیں ناممکن تھا——

سکندر بخت کو جانتی تھی کہ اب قدم پیچھے ہٹانے والا نہیں۔ اس اللہ کے بندہ کو مغل بچوں کی طرح بات کی پچ ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ کچھ عرصہ اسی طرح گذرا۔ ہم اپنا کام کرتے رہے پولس اپنی ٹوہ میں رہی ان لوگوں نے آپس میں باتیں کرنے کے واسطے ایک خاص زبان بنا رکھی تھی۔ میں نے بھی شوہر سے سیکھی —— روس سے اطلاع آئی کہ تیار رہو۔ کابل سے پروانہ ملا کہ ہم تیاریاں کر رہے ہیں تم فکر مت کرو۔ ہم

نے یہاں سے پیغام بھیجا کہ بارود تیار رہے شتابہ درکار۔

ادھر سکندر رنجت اس جانب لگے رہے، ادھر ذوالفقار کوششیں سعی سفارشیں کرا پولیس میں اچھے عہدہ پر مامور ہو گیا۔ دل میں کُنا تھی۔ خاندانی دشمنی نکالنے کے منصوبہ ——— ہم بے خبر تھے اور وہ نیشِ عقرب گھات میں۔

کینہ پرور نے یہ خبریں پا اپنا تبادلہ دہلی کرالیا ——— ذوالفقار یہاں آتے ہی اس کور نمک ممتاز سے ملا۔ یہ بھی ایک طولانی داستان ہے۔ مختصراً یہ کہ سکندر رنجت کے والد مرحوم کی جوانی میں نصیبن نامی لونڈی تھی۔ یہ اس کا لڑکا تھا۔ بڑے کچھ کہتے تھے واللہ عالم کہاں تک صحیح کہاں تک غلط۔ مرے ہوؤں کی روح نہ شرمائے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میرے مرحوم خسر کی شباہت اس میں پائی جاتی تھی۔ کم نصیب نے اسی گھر میں پرورش پائی۔ اس کی رگ و پے میں ہمارا نمک ہے لیکن دل میں بغض و کینہ۔ اس کو بھی سدا اچھی طرح رکھا جاتا تھا تا ہم سمجھا جاتا ملازمہ ہی کا لڑکا۔ سکندر رنجت کے والد اسے کچھ اوپر سے بھی دیتے دلاتے رہتے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ بھی اور ملازموں کی نسبت اس کا زیادہ خیال رکھتے۔

بہر نوع ذوالفقار خاندان کے بھیدی نے آتے ہی اس نمک حرام سے ساز باز کی۔ یہ تو سینہ میں غلش لئے بیٹھا ہی تھا۔ کچھ اس طرف سے روپیہ کا لالچ بھی دیا گیا۔ ظالم نے جتنے حالات اسے معلوم تھے اُگل دیئے۔ ذوالفقار شہر کے افسر اعلیٰ سے ملا۔ تمام وکمال باتیں اُسے بتائیں اور کہا چونکہ میں اسی خاندان

کا ہوں اور تمام ہاتوں سے واقف۔ اس وجہ سے یہ کام بہ احسن الطریق انجام دے سکوں گا ——— جب اپنے ہی خلاف ہو جائیں، رشتہ دار دشمن بن جائیں نمک خوار کور نمکی پر آمادہ تو کیسے کام چلے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز مکان پھر گھیر لیا گیا۔ اس وقت ہمارے ہاں دس بارہ پارٹی کے آدمی تھے۔ جلدی جلدی مشاورۃ ہوئی۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا۔ بچّی کو پیار کیا اور کہا جو جیتا بچا تو آن ملوں گا۔ ورنہ خدا حافظ۔ تیرا شوہر کسی غلط راہ میں کام نہیں آرہا ہے۔ انشاء اللہ تیری نظریں کبھی کسی کے سامنے جھکیں گی نہیں۔ اللہ حافظ، اللہ نگہبان۔

پھر سب پستولیں ہاتھوں میں لے گولیوں کی پیٹیاں لٹکا، دستی گولے جیبوں میں بھر اللہ کا نام لے موت کا مینہ برساتے ہوئے نکل گئے ——— ادھر جاں باز تھے، ——— اُدھر پیٹ کی خاطر کام کرنے والے۔ گو ادھر سے بھی گولی کا جواب گولی سے دیا گیا، تاہم ان جیالوں کے سامنے سے کائی سی کٹ گئی۔ یہ سب بہ یک وقت لیکن مختلف دروازوں سے نکلے تھے، اس وجہ سے پولس کا بھی دھیان بٹ گیا۔ جانیں کے کچھ کام آئے مجھے اسی وقت اطلاع مل گئی کہ وہ بہ صحیح سالم بچ نکلے۔ سجدۂ شکر بجا لائی۔

پھر نہ پوچھو کیسی بپتا پڑی۔ گھر بار ضبط ہوئے۔ ہم بے ٹھکانے۔ ہمہ وقت پولس کی آر جار پوچھ گچھ۔ ادھر تو دل چھلنی اُدھر یہ اور ہوئے پہ سو درے۔ میرا یہ عالم کہ جب ان کا نام آئے، دل پر بن جائے۔ بچی نادان گھڑی گھڑی ابا ابا کہے۔ اُسے سمجھاؤں، دل کو سمجھاؤں، کیا کروں کیا نہ کروں۔ وہ بھی عجیب دور تھا۔ نئی نئی بپتا

پڑی تھی۔ اب تو دل بھی صدمہ اُٹھانے اٹھاتے پتھر ہو گیا ہے۔ آفتوں کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب میں دن رات روتی تھی۔ بچّی کو سینہ سے لگا کر دل ٹھنڈا کر لیتی۔ جب بھی اُن کا خیال آجاتا۔ اور جب کا کیا سوال، خیال تو ہر سانس کے ساتھ رہا اور ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا۔ ہزاروں وسواس آتے۔ سینکڑوں خیال۔ سوچتی سر پر صحرا کہیں نکل جاؤں۔ شاید کہیں مل جائیں نہیں تو انہی کی تلاش میں عمر بتا دوں۔ پھر بچّی پر نظر ڈالتی۔ سوچتی انہی کی امانت ہے اس کا کیا ہو گا۔

ذوالفقار بے ایمان بڑا ہمدرد بن کر میرے پاس آیا مجھے سلا سے اُس کی صورت سے نفرت تھی؛ لیکن کیا کرتی۔ مجبوری و لاچاری۔ بات کرنی پڑی۔ دل ٹیٹوا چبا جانے کو چاہ رہا تھا پر اُف نہ کر سکتی تھی۔ کوئی سہارا نہ تھا۔ کوئی اپنا پرایا نہیں بس ایک یہ ننھی سی جان تھی اور ایک میں ——— بے ایمان ممتاز نے بہت نمک حلالی جتائی میرا ساتھ دیتا رہا۔ اس نمک حلالی اور وفا شعاری کی اصل وجہ مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہ پولس کا گرگہ ہے۔ ذوالفقار کا آوردہ ہماری ٹوہ لینے کو لگا ہوا ہے۔

ایک عرصہ انہی حالات میں گذر گیا ان سے ملنے کی اُمید پر اور بچّی کو دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ اوپر اللہ کا آسرا تھا، نیچے تنکے کا بھی سہارا نظر نہ آتا ——— کہ ایک دن دروازہ پر فقیر نے صدا لگائی۔ ممتاز تھا نہیں میں خود ہی مٹھی بھر آٹا دینے چلی گئی۔ سائیں نے مجھے سر سے پاتک دیکھا۔ کہا بچہ ہمیں نہیں پہچانیں، میں چیخ مارنے کو تھی کہ وہ بولا حسن آرا میں ہوں سکندر۔ اور یہ کہتے ہوئے داڑھی چہرہ سے ہٹالی۔ وہ ایسا وقت تھا کہ مخالف جذبات سے میرے دل کی حرکت بند

بند ہو جاتی تو تعجب نہ تھا۔ لیکن اب دنیا نے مجھے خود کو سنبھلنا سکھا دیا تھا۔ پھر بھی قدم ڈگمگائے۔ سکندر نے ہاتھ کا سہارا دیا' میں اپنے سرتاج کو اندر لائی۔

گھر اور گھر کا حال دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں محلوں کے بدلہ اب ایک کھنڈر میں تھی۔ روشن ہماری آنکھوں کا تارا ایک پھٹی سی رضائی میں لپٹی ٹوٹی کھٹولی پر پڑی تھی ——— سکندر نے ہم کو دیکھ کر آسمان کو دیکھا۔ آنکھوں میں کچھ آنسو آئے' لیکن پی گیا۔ مٹھیاں بھینچیں' چہرہ عجیب جذبات کا آئینہ دار تھا۔ میں نے فضا کا حزن و اندوہ دور کرنے کے لئے کہا سائیں صاحب کچھ کھا لیجئے'

انہوں نے مجھے عجیب نگاہ سے دیکھا اور کہا اچھا ——— میں کھانا لائی۔ میلا سا دسترخوان۔ ٹوٹی ٹوٹی رکابیاں' مٹی کا پیالہ پانی کو ——— لیکن آج ہم پھر ساتھ کھا رہے تھے۔ اور مجھے یہ طشتریاں۔ ہیرے جواہرات کی قابوں سے بہتر معلوم ہو رہی تھیں۔ اس وقت کھانے میں مزا ہی کچھ اور تھا ——— آج مدت بعد کھانے میں لطف آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے جانا چاہا۔ میں نے روک لیا۔ اتنے عرصہ بعد ملے تھے۔ کل کی خبر نہ تھی' کیسے جانے دیتی وہ بھی بیٹھ گئے۔ یوں کرنے کو تو ہزاروں باتیں تھیں' لیکن بیتا کی داستان کیا دہراتے' صورتیں بتا رہی تھیں۔ چہروں پر مصیبت بخط جلی لکھی ہوئی تھی۔ ہم تو بس خموش ایک دوسرے کو دیکھا کئے۔

تھوڑی دیر بعد ممتاز آ گیا۔ نہ ان کو اس سے پوشیدہ رکھنے کی مجھے کوئی ضرورت محسوس ہوئی تھی نہ رکھ ہی سکتی تھی۔ غرضکہ اسے بھی شریک راز کر لیا۔ میں نے ان

سے کہا کہ اس غریب نے ساتھ دیا اور سب نے نگاہیں پھیر لیں۔ اس وقت مجھ کم نصیب کو خبر نہ تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ یہ کیوں ساتھ دے رہا ہے —— حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ملازم پولیس کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ ورنہ ہندوستانی نوکر صرف پیسہ کے لئے خدمت نہیں کرتے ان میں بڑی وفا بھی ہوتی ہے۔ ایک نہیں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ آقا کے غریب ہو جانے کے بعد ان وفاشعاروں نے ساتھ نہ چھوڑا اور نمت تک نباہ دی —— پر غریب کیا کرتے جو بھی ہمارے پاس آتا، پولس اس کے درپے ہو جاتی۔ اس میں کچھ ذوالفقار کو بھی دخل تھا۔ وہ مردود چاہتا تھا کہ میں کلیتاً ممتاز پر بھروسہ کرنے لگوں تاکہ وہ اپنی آرزوؤں میں کامیاب ہو جائے۔

سکندر نے مجھے بتایا کہ یہ ساری حرکت بے ایمان شتر کینہ ذوالفقار کی تھی، وہ ہم سے بدلہ لے رہا ہے۔ میں نے کہا میرے پاس آن آن کر بہت ہمدردی اور دوستی کا اظہار کرتا ہے۔ بولے میں یہ سب خدشہ مول لے کر صرف دو ہی وجوہ سے آیا ہوں۔ ایک تو تمہیں اور بچی کو دیکھنے کی آرزو تھی سو اللہ کا شکر ہے پوری ہو گئی۔ دوسری تمنا اور ہے وہ بھی خدا پوری کرا دے گا۔ میں نے کہا وہ کیا، فرمایا تم خود سن لو گی۔

یہ باتیں ممتاز کے سامنے نہیں ہوئیں۔ رات زیادہ آگئی تھی ہم سب لیٹ گئے۔ سکندر سوتی بچی کو بار بار پیار کرتے اس کے منہ سے منہ رگڑتے اور کہتے کچھ نہ پوچھو۔ تم لوگ کس قدر یاد آتے ہو، خبیر اللہ پھر ملائے گا، فکر نہ کرنا۔ میں ابھی مر نہیں سکتا۔

اللہ اچھے دن بھی دکھائے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے اگر ہم بچھڑے ہیں تو انشاء اللہ ملیں گے بھی۔ اس میں سب قدرت ہے۔ پھر بولے

تم کو یاد ہوگا، ہم نے ایک تصویر کھچوائی تھی جس میں تم بھی تھیں اور روشن بھی۔ اس کی کوئی کاپی ہے۔ میں نے کہا جان کے ساتھ۔ اور لا اُن کے حوالہ کی۔

اس وقت انہوں نے ایک ہیرے کی انگوٹھی اپنی جھولی میں سے نکال کر مجھے دی، اور کہا پڑی رہنے دو، کسی وقت کام آئے گی —— مجھے معلوم تھا یہ انگوٹھی ان کی خاندانی تھی اور جس وقت گھر سے بھاگے تھے اس وقت ان کی انگلی میں تھی —— میں نے لینے سے انکار کیا اور کہا آپ کو بھی تو ضرورت پڑے گی۔ وہ بولے نہیں تم ہی رہنے دو۔ ان کے اصرار پر میں نے رکھ لی۔ پھر کہا ایک بار پہن کر دکھا دو۔ میں نے کہا، کر دیا، وہ مسکرائے۔ لیکن دل ہم دونوں کے رو رہے تھے، ساتھ کے ساتھ ایک چاقو اور ایک پستول دیا، کہا یہ بھی کام دیں گے۔ پستول چلانی وہ مجھے پہلے ہی سکھا چکے تھے

صبح ہونے سے پہلے وہ چلے گئے۔ ممتاز نے سویرے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ رات کو پھر آئیں گے۔ بس اتنا کہنا غضب ہو گیا۔

میں نے تمام دن ان کی پسند کے کھانے پکائے۔ روشن کو نہلا دھلا کر سفید کپڑے پہنائے۔ گھر بھی جھاڑ بہار کر چندن سا کر لیا —— وہ آئے، لیکن پولس بھی ساتھ آئی۔ ابھی دو باتیں کر کے دسترخوان پر بیٹھے ہی تھے کہ پولس سر پر، وہ بجلی کی طرح کوندے۔ گھر کے دروازہ کے پیچھے جا چھپے۔ پولس اندر گھسی، وہ فیر کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ان کے آنے کی خوشی یُوں مبدل بہ غم و رنج ہو گئی۔ روشن میرے سینے سے لپٹی ہوئی تھی لب پر دعا تھی کہ یا اللہ وہ خیر سے نکل جائیں۔

گھر کے چپہ چپہ کی تلاشی ہوئی۔ اب کیا دھرا تھا۔ لیکن دقت یہ آن بنی کہ اب میں بھی شریک کار سمجھی گئی اور پولس میرے درپے۔

سننے میں آیا کہ انہوں نے دو گولیاں خاص طور پر ذوالفقار پر چلائیں لیکن کم بخت بچ گیا ——— اب وہ جھنجلایا ہوا تھا اور ہم پریشان۔ مجھے گرفتار ضرور کیا جاتا، لیکن ایسا سمجھتی ہوں اور لبعد میں معلوم بھی ہوا کہ ایک تو مجھے باہر اس لئے رہنے دیا گیا کہ شوہر کے واسطے لاسہ کا کام کروں، شاید سکندر پھر آئیں، دوسرے ذوالفقار کا بھی کچھ مدعا تھا جو سامنے آگیا۔

میں پہلے کہہ آئی ہوں کہ ان لوگوں نے ایک خاص زبان ایجاد کر رکھی تھی۔ ——— ایک روز رات کو دروازہ پر ایک اور فقیر آیا۔ اب میں ہر گدا کی صدا پر خود جاتی تھی۔ ایک جوان سا آدمی تھا اور مجھ سے اُسی بولی میں باتیں کرنے لگا۔ ——— بولا سکندر رنجن نے بھیجا ہے تم کو اور بچی کو بلایا ہے۔ میرے ساتھ چلنا ہوگا جب کہو انتظامات کر کے آجاؤں ——— میں نے کہا کل ہی رات کو چلی چلوں گی۔ تم بندوبست کر لو مجھے کچھ دیر نہیں ہے۔ دوسرے روز پھر وہی شخص آیا۔ میں بچی کو لے اُس کے ساتھ ہولی ——— وہ بلا رہے تھے۔ سوچ بچار کا موقع نہ تھا۔ میں بھی انہی کی تھی، روشن بھی انہی کی ——— گھر اب رہا ہی کون سا تھا جسے چھوڑتے دکھ ہوتا۔ جہاں وہ وہیں میرا گھر۔ گھر اصل میں گھر والے سے ہے در و دیوار سے نہیں۔

تھوڑی دور تو وہ شخص نا معلوم کچھ فاصلہ پر چلتا رہا۔ پھر اندھیرے میں ایک موٹر کھڑی تھی۔ اُس کا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ خود چلانے لگا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے اتنی ہوشیاری کی تھی کہ ان کی دی ہوئی تینوں چیزیں رکھ لی تھیں۔ خیال یہ تھا کہ کل کلاں کو یہ چیزیں گھر میں سے کہیں برآمد نہ ہوں۔ نیز اُن کی امانت تھیں۔

اس شخص نے پہاڑ گنج کے قریب ہم ماں بیٹیوں کو ایک گھر پر اُتارا۔ اُجاڑ مقام ہُو کا عالم۔ میں پردہ گوشہ کی بیٹھنے والی گلی کوچوں سے بھی واقف نہیں۔ یہ بھی بعد میں پتہ لگا تھا کہ اس جگہ کو پہاڑ گنج کہتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا گھر میں قدم رکھتے ہی وہ مل جائیں گے، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ خیر میں اپنی بچی کو لے ایک کونہ میں جا بیٹھی۔ لانے والے سے پوچھا کہ سکندر بخت کہاں ہیں۔ اُس نے کہا۔ ان کی کڑی نگہداشت ہو رہی ہے۔ گرفتاری پر انعام لگا ہوا ہے۔ وہ اس طرح نہیں مل سکتے۔ موقع محل سے ملایا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں ۔۔۔۔ میں نے سوچا "اللہ مالک ہے۔ آج سے کل دُور نہیں کچھ اُمید تو بندھی کوئی صورت تو بنی۔ کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ وہ ہیں شہر ہی میں نیز یہ بھی یقین ہو گیا، کہ گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی دل میں وسواس آئیں لیکن پھر سوچوں کہ پیامی انہی لوگوں کی بولی بول رہا تھا۔

دوسرے دن ممتاز آیا، کہا ایک فقیر گھر پر آیا تھا۔ مجھے اس گھر کا پتہ دیا۔ اور میاں کے پاس بھی لے گیا۔ وہ مزے میں ہیں۔ آپ کو بہت یاد کر رہے تھے ہاں روشن بی بی کو بلایا ہے۔ میں تو وہ جس حال میں تھی اسی طرح اس ظالم کے

معانقہ کر دیا۔ بچّی جانہیں رہی تھی مجھ کم نصیب نے بہلا پھسلا کر بھیجا۔ چلتے چلتے مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، بولی امّی جان آپ بھی چلئے۔ میں نے کہا تم ابا سے مل آؤ۔ میں پھر چلوں گی۔

اتنا کہا تھا کہ بُوا کی نظریں اپنی سوتی ہوئی نورِ نظر پر گئیں اور کہنے لگیں۔ اس منحوس گھڑی کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے پھر اب تمہارے طفیل یہ صورت دیکھنی نصیب ہوئی۔ کیا بتاؤں دل پر کیا کیا گذرتی تھی۔ اب بھی ہر گھڑی کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اللہ جانے کل کیا ہو جائے —— بڑی دیر بُوا حمیدن روشن آرا کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ جیسے چکور چاند کو تکے۔ محبت کی شعاعیں ماں کی آنکھوں سے نکل کر لختِ جگر کی بلا گردانی کر رہی تھیں۔ بچّی میٹھی نیند سو رہی تھی اور فطرت اس پر نعمتیں نچھاور کر رہی تھی۔ ماں باپ کی دیکھن ہی کچھ عجیب ہے۔ قدرت یہ ایک بار دے کر پھر نہیں دیتی۔ ان نگاہوں میں عشقِ حیات پرور اور حسنِ فنا نا آشنا گھلا ہوا ہوتا ہے۔ روحِ آدم آنکھوں میں کھچ آتی اور رس برساتی ہے۔ اس کیفِ حلال میں ہم خارج نہ آئے۔ پیاسی ممتا آنکھوں کی راہ تشنگی بجھا رہی تھی۔ پلکیں بھی اس وقت آنکھوں کو بیگانہ معلوم ہو رہی تھیں۔ ہم میاں بیوی بھی اس فردوسِ سکوت کا لطف لیتے رہے۔

آخر کچھ دیر بعد بُوا ہماری جانب متوجہ ہوئیں اور بولیں۔ اللہ اس کو سلامت رکھے یہ پھر سارے دن واپس نہیں آئی مجھے رہ رہ کر یاد آئے۔ پھر سوچوں ممتاز کے ساتھ گئی ہے۔ باپ کے پاس گئی ہے۔ اچھا ہے وہ بھی سیر ہو کر دیکھ لیں۔ انہی حالات اور خیالات میں شام ہو گئی۔ رات ہوتے آئی اور نہ روشن کا پتہ نہ ممتاز کا

نہ کوئی پیام ہی۔ اب مجھے بے چینی اور پریشانی ہونے لگی۔ دل کسی عنوان سنبھالے نہ سنبھلے۔ سینہ میں چھاج لگے ہوئے، طرح طرح کے وہم آئیں۔ کہ گیارہ بجے کے قریب ممتاز اور دوسرا شخص جو مجھے یہاں لایا تھا آئے۔ ذرا دل کو قرار آیا انہوں نے مجھ سے کہا چلو اب موقع ہے آپ بھی مل آئیں۔ میں نے کہا روشن کہاں ہے جواب ملا اپنے ابا کے پاس۔ آپ کو بھی بلایا ہے۔

میں ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ اُجاڑ سنسان علاقہ، دور سے گیدڑوں کے بولنے کی آواز آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی کار کھڑی تھی۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ آگے جا کر ٹھنڈی سڑک پر موٹر رکی۔ وہاں ایک اور بڑی موٹر تھی۔ اس میں ایک ڈرائیور تھا۔ ہم تینوں بھی بیٹھ گئے موٹر نے دریا کی طرف کا رخ کیا۔ اندھیری رات ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے۔ موٹر کی روشنیاں بھی ہلکی جلا رکھی تھیں، یہ گاڑی بیلا روڈ پر رکی وہاں ایک اور کار کھڑی تھی۔ مجھے اتار کر اس کے پاس لے گئے اب جو دیکھتی ہوں تو مردود ذوالفقار بیٹھا ہے۔ میں سوار ہوتے ہوئے رکی۔ سوچا ہا غیوں کے ساتھ پولیس والے کا کیا کام اور پھر وہ بھی ہمارا دشمن۔ اس کی نیت سے میں واقف ہی تھی۔ یہ تمام خیالات چند لمحہ میں ذہن نے پیش کئے اور میں پوری طرح سب کچھ سمجھ گئی۔

میں نے موٹر میں بیٹھنے سے انکار کیا۔ بدمعاشوں نے مجھے زبردستی ڈالنا چاہا۔ میں نے دیکھا کہ میں اکیلی ہوں۔ کچھ کر نہیں سکتی۔ ریوالور بھی صدری کی جیب میں تھا اور چھری نیفہ میں۔ میں نے کہا ذرا میں ذوالفقار صاحب سے بات کر لوں پھر بیٹھوں گی۔ وہ جانتا تھا کہ اب بچ کر کہاں جا سکتی ہے پھنس چکی ہے، بولا

فرمائیے ۔ میں نے دوپٹہ کے اندر ہی اندر ریوالور نکال لیا اور قریب جا کر شوٹ کیا ۔ ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ ایک ہائے کی آواز سنائی دی اور میں فائر کرتی ہوئی بھاگی ۔

تن تنہا، دریا کا کنارا ۔ مصائب کی گھٹائیں، سر پر تاریک ماضی، تاریک تر مستقبل ۔ اوپر اندھیارا چھایا ہوا خیالات کی دنیا میں بھی کہیں روشنی نظر نہ آتی تھی ۔ مایوسی، وہم غم، اندوہ، مامتا، شوہر کی محبت ۔ اپنی مصیبت، خوف، توحش یہ سب مجھے کوڑے مار مار کر بھگا رہے تھے اور میں دیوانہ وار دریا کی سمت چلی جا رہی تھی ۔ ریت میں پیر دھنستے، ایسا معلوم ہوتا جیسے بھوت مجھے پکڑ رہے ہوں ۔ تن بدن میں ایک آگ لگ رہی تھی ۔ اور میں دریا کی تلاش میں رواں ۔ ذہن میں کوئی مدعا نہ تھا، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ دریا مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور میں چلی چلی جا رہی تھی ۔ آخر کو پانی نظر آیا اور میں اس کی آغوش میں ابدی پناہ لینے ہی کو تھی کہ ایک ہاتھ نے مجھے پکڑا ۔ میں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی ۔

جب ہوش میں آئی تو ذہن پر کچھ عجیب سا غبار تھا ۔ غم کے بھوت سائے سے نظر آ رہے تھے ۔ ماضی کسی سیاہ چادر میں ملفوف ۔ مستقبل اور حال کا بھی یہی عالم ۔ ہر شے پر ایک دھند لکا سا تھا ۔ ماحول بھی کچھ عجیب، میں نے ایسا محسوس کیا، جیسے میں مر گئی ہوں ۔ دنیا کی ہر شے ایک خواب سی رہ گئی ہے ——— میرے سر پر ایک گھنا سایہ دار درخت چھایا ہوا تھا ۔ جس کی سرسبز ٹہنیاں زمین بوس تھیں ۔ دور سے کچھ انسانوں کے بولنے کی سی آواز آ رہی تھی ۔

میں نے اپنی گردن ہلانے کی کوشش کی تو وہ ہل سکی ۔ اب ذرا چاروں طرف نظر ڈالی ۔ فضا پر دھواں چھایا ہوا تھا ۔ ایک جانب آگ روشن ہو رہا تھا ۔ میں ایک

خاموش ہو ـــــ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا میری جانب آتا نظر آیا۔ وہ میرے قریب ہو بیٹھا۔ میرے ہواس پر ایک نقاب سی پڑی ہوئی تھی، کسی شے کا ادراک پوری طرح نہ کر سکتی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ یہ کراماً کاتبین میں سے کوئی ہے۔ تو میں کلمہ پڑھنے لگتی، پھر سوچتی کہ کوئی اور روح ہے تو گھبرا جاتی۔ لیکن نہ شعور پوری طرح کام کر رہا تھا، نہ احساسات۔ بوڑھا میرے پاس بیٹھا تو میں کچھ سہم سی گئی۔ اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹی کہہ کر بات کی۔ اس وقت میری بینائی کی بھی کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی غلط نمبر کی عینک لگا لے۔ تاہم اس کے چہرے کے بھاؤ تاؤ دشمنی نہیں بلکہ دوستی کا اظہار کرتے نظر آ رہے تھے۔ پھر بیٹی کے لفظ نے میری ڈھارس بندھائی۔ اب رات ہو گئی تھی اور میرا دماغ کچھ کچھ جاگتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کا غبار قدرے کم ہو رہا تھا۔ شعور پر سے کچھ پردہ اُٹھ رہے تھے

بوڑھے نے مجھے مٹی کے آبخورہ میں پانی پلایا۔ میں اُٹھ کر بیٹھی۔ پھر وہ کہیں سے روٹی سالن لایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اب میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو عجیب ماحول تھا ـــــ سو اس کے ساتھ ساتھ خوف، غم، یاد، الم، سب جاگ اُٹھے اور پھر میری حالت خراب ہو گئی۔ بوڑھے نے تسلّی دی اور کہا تم میری بیٹی ہو۔ میرے تمہارے درمیان خدا ہے۔ رات کو دریا کنارے سے میں ہی تم کو لے کر آیا تھا۔ ڈرو نہیں۔ مصیبت انسانوں کے لئے ہے اور انسان مصیبتوں کے واسطے۔ کون ہے جس پر بپتا نہیں پڑی۔ ذرا سی روٹی کھاؤ۔ تمہارے ہواس درست ہوں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میں فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ دغا کروں تو اپنے خدا

سے پاؤں۔

مایوسی، نااُمیدی۔ غداری اور بے ایمانی میں اُمید اور ایمان کی ایک ہلکی سی شعاع نظر آئی۔ میں نے گڑگڑائے نہ جا رہے تھے پھر بھی دو چار نوالہ زہر مار کئے ابھی دو چار لقمہ ہی حلق کے نیچے اُترے تھے کہ کوک میں ایک ہوک سی اٹھی اور میں کہہ کر بھاگی، ہائے میری روشن آرا کہاں ہے۔

بوڑھے نے مجھے پکڑا، دلاسا دیا کسی چیز کی ایک گولی کھلائی۔ پھر دنیا پر ایک اندھیرا چھا گیا۔ میرے گلے پر نامرادی کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔ ماضی و مستقبل افق کے پار چلے گئے۔ یادیں سائے بن کر رہ گئیں۔

چند روز اسی طرح گذرے۔ آخر میں بوڑھے کی بیٹی بن گئی۔ اس نے کہا یہاں رہو۔ اللہ وارث ہے ——— پھر جب کبھی سینہ میں آگ لگتی، میں ان چیزوں سے بجھا لیتی جن کی بابت غالب نے بھی کہا ہے کہ اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے!

رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ مقام شاہ بڑا ہے اور یہ بوڑھا یہاں کا پیر مغاں — کچھ روز بعد میں نے غیر اہم تھوڑے تھوڑے ٹکڑے اپنی رام کہانی کے بوڑھے کو سنا دیئے۔ کوئی پندرہ بیس دن گذرے نہیں تھے کہ معلوم ہوا کہ ذوالفقار ہسپتال سے نکلتے ہی پھر گولی کا شکار ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ میرے وار سے زخمی ہوا تھا۔ سکندر بخت کام کر گئے۔ انہوں نے کہا ہی تھا کہ دوسرا مدعا جس کے لئے آیا ہوں تم کو خود معلوم ہو جائے گا۔

شاہ بڑے پر زمانہ بھر کی جھوٹی سچی خبریں آتی ہیں۔ ہر قسم کے تذکرے ہوتے

ہیں۔ یہاں کے آنے والے اکثر سکندر بخت کے تذکرہ کیا کرتے۔ میں بوڑھے کی جھونپڑی میں بیٹھی سنتی رہتی۔ کسی کا خیال تھا، روس سے مدد لائے گا۔ کوئی کہتا وہ تو ٹرکی چلا گیا بعض کا خیال تھا کہ اپنے بیوی بچوں کو لینے آیا تھا۔ غرضکہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

میں نے بڑے میاں سے کہا، میری روشن آرا کو کہیں سے تلاش کرا دو۔ وہ مردِ خدا میرے ساتھ راتوں کو بھیس بدل بدل کر نکلا۔ اکثر ہم دونوں گداؤں کی صورت اختیار کرتے۔ کُوچہ کُوچہ گلی گلی چھان ماری۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ پیروں کے آبلوں کا مرہم کسی طرح نہ ملا۔

کچھ گردشِ مہ و سال، کچھ مصائب و غم سے جوانی قبل از وقت ڈھل گئی۔ صورت بدل گئی اور اب میں مُنہ لپیٹ کر پردہ سے باہر آنے اور اپنے دین کے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی۔

ایک روز ممتاز بے ایمان آن پہنچا۔ میں بے تاب ہو گئی۔ بوڑھے بابا سے کہا کہ یہی وہ نمک حرام ہے جس نے میرا گھر اُجاڑ دیا۔ شاید اس سے میری بچی کا پتہ چل سکے۔

بڑے میاں نے اپنے ڈھب پر لگایا۔ باتیں بنائیں۔ سبز باغ دکھائے، لیکن وہ کم بخت کچھ نہ قبولا۔ ایک دو دفعہ بڑے میاں نے بہزاراں احتیاط اس کا پیچھا بھی کیا رسم و راہ بڑھائی۔ اُس کے پاس گئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس خانماں برباد کا نہ کہیں گھر ہے نہ در۔ رنڈی کے کوٹھے پر چلمیں بھرتا اور وہیں پڑا رہتا ہے۔

آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں خود سامنے آئی۔ پر اس موذی نے بھید نہ دیا۔ ہر دفعہ یہی کہتا کہ جو کچھ ہے وہ دے دو تو بچی تمہارے حوالہ کر دوں گا۔ میرے

پاس لے دے کر یہ میرے کی انگوٹھی تھی ——— اتنا کہتے ہوئے بُوا نے وہی انگوٹھی جو ایک بار میں نے اُن کی انگلی میں دیکھی تھی، جیب میں سے نکال کر دکھائی۔ بیش بہا نگ تھا، آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ پھر بولیں مجھے اپنے لال سے زیادہ یہ انگوٹھی نہیں تھی۔ پر دگدا یہ تھا کہ کم بخت کہیں پھر دھوکہ نہ کرے۔ کہیں ان کی نشانی بھی لے جائے اور میری روشن کو نہ لائے

بڑے میاں نے اپنی تمام عمر کی جمع جکڑی سو ڈیڑھ سو روپیہ بھی دیئے اور کہا، بس ایک نظر دکھا دے۔ پر یہ دغا باز رقم کھا گیا اور ٹالے بالے دیتا رہا۔ آخر صبر کر رو پیٹ ہو بیٹھی ——— اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں بڑا حصّہ تمہارا ہی ہے اور ہم سب کو معلوم۔

یہ داستان سنتے سنتے صبح کی اذانیں ہو گئیں۔ ہم سب نے وضو کر فریضہ ادا کیا۔

کچھ عرصہ بمبئی میں گذارنے کے بعد ہم لوگ دہلی آئے۔ ایک رات بُوا نے ہم دونوں سے کہا کہ میرا مکان فلاں محلہ میں تھا دل چاہتا ہے ایک دفعہ وہاں پھر جاؤں چاہے باہر ہی سے دیکھ آؤں۔ دوسرے روز صبح سواری کر بُوا وحیدن اور بیوی کو ساتھ لے میں وہاں پہنچا ——— اُس رات پھر بُوا نے ہم دونوں کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا تم سے ایک راز کہنا چاہتی ہوں۔ ہم نے کہا فرمائیے۔ بولیں ہمارے مکان کے پیچھے جو مکان ہے اس کا معلوم کرو کہ کس کے پاس ہے۔ اگر ممکن ہو تو اُسے خرید لو۔ باقی بات پھر کہوں گی۔

بیمانے دوسرے ہی دن پتہ لگایا، معلوم ہوا کسی مہاجن نے خرید لیا ہے اور اب کرایہ پر ہے۔ اُس سے بات کی، وہ بولا جی ہم کو بیچنے کی ضرورت تو ہے نہیں ہاں جو کوئی اچھے دام لگائے گا تو الگ بھی کر دیں گے۔ میری نگاہ میں مکان چار ہزار سے زیادہ کا نہ تھا کرایہ کا پڑتا تو کل ساڑھے تیس ہی کا پھیلتا تھا۔ لیکن سیٹھ جی پورے چھ ہزار طلب کر رہے تھے۔ میں نے بُوا سے کہا۔ وہ بولیں میاں بات یہ ہے کہ یہ دو ہزار کا جوا ہے دل چاہے تو کھیل لو یا تو یہ دو ہزار لاکھوں دے گئے یا گئے۔۔۔۔ مجھے لاکھوں کی تو ضرورت نہ تھی، ہاں بُوا کی خوشی بیٹیک کرنی چاہتا تھا۔ بیوی نے بھی یہی صلاح دی۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ ہزار اور خرچ پر معاملہ ہو گیا۔ بوا کا کہنا تھا کہ وہاں چل کر رہنا ہوگا۔ میں نے کرایہ دار سے بات کی کہ میاں ہم نے خود رہنے کے واسطے لیا ہے۔ تم کہیں اور تلاش کر لو، مہربانی ہوگی، وہ بھی شریف انسان تھا۔ شہر میں مکانوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ اس نے پندرہ دن میں خالی کر دیا۔ ہم تھوڑا سا سامان لے وہاں جا رہے۔ اپنے گھر میں ایک قابلِ اعتماد چوکیدار چھوڑ دیا۔

اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد بُوا بولیں۔ میاں ذرا سی محنت مزدوری کرنی ہوگی ایک کدال اور ایک پھاوڑا خرید لاؤ۔ میں تو حکم کا بندہ تھا دونوں چیزیں لا حاضر کیں — ایک رات بوا کی ہدایت کے مطابق مکان کا مشرقی گوشہ کھودنا شروع کیا۔ پہلے تو ایک سِل برآمد ہوئی۔ اس کے نیچے سے ایک صندوقچہ۔ بیوی اور بُوا برابر مدد کر رہی تھیں۔ میں نے صندوقچہ نکال بُوا کے ہاتھ میں دیا۔ زمین کو اسی طرح ہموار کر اب تینوں کمرہ میں پہنچے، وہاں قفل توڑا گیا تو زیورات سے لبالب بھرا تھا۔ ایک ایک دانہ بے بہا۔ کچھ چیزیں بُوا کی ہدایت کے مطابق اس میں سے فروخت کیں اور روشن آرا کے

نام سے جائیداد خریدی ——— ایک روز شام کو ہم لوگ بائیسکوپ گئے۔ سٹوری کی بنیاد وہی جو بمبئی والی پکچر کی تھی، ہاں پچی کاری ذرا اور ——— بُوا تماشہ سے آنے کے بعد کچھ سوچ میں پڑ گئیں میں نے پوچھا کیا بات ہے، بولیں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ہندوستان ہی میں ہیں۔ تم ذرا ان دونوں تصویروں کی اسٹوری لکھنے والے کا پتہ چلاؤ۔ آج کے تماشہ میں چند ایسی باتیں تھیں جو ہماری زندگی کی ہم دو کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں۔ اب میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی اور سے ذکر کیا ہو اور وہ شخص ان بنیادوں پر اپنی کہانی لکھ رہا ہو۔ اگر میرا آخری خیال صحیح ہے تو شاید اس شخص سے کچھ خیر خبر معلوم ہو سکے۔

میں دوسرے ہی دن چند فلمی میگزینز لایا۔ معلوم ہوا کہ دونوں اسٹوریز رام موہن کی تھیں ——— ہم لوگ پھر بمبئی سدھارے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ بوا کے اصرار پر اس بار ہم ان کے ہمراہ تھے وہاں پہنچتے ہی فلم والوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کے توسل سے رام موہن افسانہ نگار سے ملا۔ ایک روز اسے اپنے گھر مدعو کیا۔ بُوا نے جھریوں میں سے جھانکا۔ رام موہن کو وداع کرنے کے بعد جب بُوا کو دیکھا تو سوال کی ضرورت نہ رہی تھی۔ تاہم میں نے دریافت کیا اور انہوں نے کہا" وہی تھے۔

دوسرے ہی دن صبح میں رام موہن کے پاس پہنچا۔ انگلی میں بُوا کی انگوٹھی پہن لی۔ رام موہن کی نظر بار بار اُس پر جاتی، کچھ پوچھنا چاہتا اور رہ جاتا ——— میں نے شام کو اپنے گھر چاء پر مدعو کیا اور بیوی سے کہا تم کو اُن کے سامنے ہونا ہے۔ ——— بُوا نے خاندانی زیورات میں سے خاص خاص اُسے پہنائے۔

رام موہن آئے۔ میں نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا، ان کی نظر زیورات پر پڑی

ہاتھے پر پسینہ آگیا —— بولے معاف کیجئے گا۔ میں ایک بات دریافت کرنی چاہتا ہوں یہ زیورات آپ نے خریدے ہیں یا بنوائے ہیں۔

میں نے کہا، صاحب میری بیوی کی ایک کرم فرما سہیلی نے اُسے دیئے تھے۔ اپنی انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ بھی انہی کا عطیہ ہے۔ وہ شاید کچھ بتا سکیں ہم لوگوں کو معلوم نہیں۔

وہ پھر خموش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد بولے، وہ محترمہ دہلی میں ہیں۔ میں نے کہا نہیں ہمارے ساتھ ہیں لیکن پردہ کرتی ہیں۔ یہ سُن کر وہ چُپ ہو گئے، لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ تہذیب اور آداب و قواعد سینہ پر پتھر رکھوا رہے ہیں —— بیوی بولی میں ان سے دریافت کر کے آتی ہوں، تھوڑی دیر بعد بیوی آئی۔ ہاتھ میں ایک پستول اور ایک خنجر تھا۔ بولی انہوں نے فرمایا ہے کہ جن کا یہ زیور ہے انہی کے یہ ہتھیار اور وہ میرے سرتاج —— اس وقت سکندر بخت کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

اب ان بچھڑے ہوؤں کے درمیان حائل رہنا قلب انسانی کے لئے ممکن نہ تھا —— خدا سب بچھڑے ہوؤں کے درمیان حائل رہنا قلب انسانی کے لئے ممکن نہ تھا —— خدا سب بچھڑے ہوؤں کو اسی طرح ملائے۔ آمین۔ ثم آمین!

بُوا نے جو زیور میری بیوی کو پہنایا تھا۔ وہ پھر واپس نہیں لیا۔ ہاں انگوٹھی لے لی۔ لیکن اُس کے بدلہ اس سے بھی زیادہ قیمتی مجھے اپنے ہاتھ سے پہنائی۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

فروری ۱۹۵۸ء

شکست

ایشیا کا عظیم فنکار کرشن چندر جب جاگیردارانہ معاشرے
کے پھوڑے پر نوک قلم رکھتا ہے تو ایک طرف روپے کی جھنکار
اور دوسری طرف دبی دبی آہوں اور کراہوں کا فنکارانہ انداز
میں پوسٹ مارٹم کر دیتا ہے۔

ناول "شکست" محبت کی ناکامی کی ایک ایسی داستان
ہے جو بیک وقت رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ کرشن چندر کا نیا
ناول۔ بہترین گٹ اپ حسین ڈسٹ کور

قیمت صرف تین روپے

شہنشاہ اورنگ زیب کی سب سے چھوٹی شاہزادی لالہ رخ کی داستان

لالہ رخ

انگریزی زبان کے مشہور شاعر مسٹر مور کی شہرہ آفاق تصنیف جسے لانگ مین اینڈ کمپنی نے تین ہزار اشرفیاں دیکر خریدا۔ ہندوستانی ہی نہیں ایشیائی زبانوں میں سب سے پہلے جناب ل احمد اکبرآبادی نے اردو میں ترجمہ کیا۔

لالہ رخ جو دلی سے کشمیر اس لئے روزانہ ہوئی تھی کہ وہاں جاکر بخارا کے ولی عہد سے اس کی شادی کی رسومات ادا کی جائیں گی۔ ایک کشمیری مغنّی فرامرز کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے۔

فرامرز کون تھا! اور اس کا کیا انجام ہوا۔ یہ انوکھا واقعہ "لالہ رخ" میں پڑھیے۔

ہندوستانی ماحول۔ ہندوستانی کردار۔ انداز بیان دلآویز۔ مجلد سوا دو سو صفحات جسمین ڈسٹ کور۔ قیمت صرف تین روپے پچاس نئے پیسے

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date